

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں  
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

زیر نظر  
اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

# تفسیر نمونہ جلد ۳

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیتانی مدظلہ





# فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۳۲	کل کے دشمن اور آج کے دوست		سورہ آل عمران
۳۲	قوموں کی بقا کے لیے اتحاد کی اہمیت	۲۵	آیت ۹۲
۳۵	آیت ۱۰۴، ۱۰۵	۲۵	ایمان کی ایک نشانی
۳۶	حق کی دعوت اور فساد کا مقابلہ	۲۶	آیات قرآنی کا مسلمانوں کے دلوں پر اثر
۳۶	ایک اہم سوال اور اس کا جواب	۲۷	آیت ۹۳، ۹۴، ۹۵
۳۷	چند اہم نکات	۲۸	شان نزول
۳۷	۱۔ معروف اور منکر	۲۹	موجودہ تورات اور گوشت کی حرمت
۳۷	۲۔ کیا امر بالمعروف ایک عقلی حکم ہے	۳۰	آیت ۹۶، ۹۷
۳۸	۳۔ امر بالمعروف اور نہی المنکر کی اہمیت	۳۰	لوگوں کے لیے پہلا گھر
۵۰	۴۔ کیا امر بالمعروف سلب آزادی کا سبب ہے؟	۳۱	”بکرہ“ سے کیا مراد ہے
۵۰	۵۔ کیا امر بالمعروف سے کوئی حرج تو پیدا نہیں ہوتا؟	۳۲	مسجد الحرام کی توسیع
۵۰	۶۔ امر بالمعروف معنی اور سنخنی نہیں	۳۳	غار کعبہ کی خصوصیات
۵۲	آیت ۱۰۶، ۱۰۷	۳۵	حج کی اہمیت
۵۲	نورانی اور تاریک چہرے	۳۶	آیت ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱
۵۳	آیت ۱۰۸، ۱۰۹	۳۷	شان نزول
۵۴	آیت ۱۱۰	۳۸	نفاق ڈالنے والے
۵۵	فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے اور دعوت حق کی یاد دہانی	۳۹	آیت ۱۰۲، ۱۰۳
۵۶	آیت ۱۱۲، ۱۱۱	۴۰	شان نزول
۵۶	شان نزول	۴۱	تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت
۵۸	یہودیوں کی عبرت ناک داستان	۴۱	اتحاد کی دعوت
۵۹	آیت ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵	۴۲	”جبل اشد“ کی تعبیر کا مقصد



صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۸۶	آیت ۱۳۸، ۱۳۷	۵۹	شان نزول
۸۷	گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ	۶۱	آیت ۱۱۶، ۱۱۷
۸۷	جہاں گردی	۶۳	آیت ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰
۸۹	آیت ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳	۶۴	شان نزول
۹۰	شان نزول	۶۴	اغیار کو رازداں نہ بناؤ
۹۰	جنگ اُحد کے نتائج	۶۶	مسلمانوں کے لیے تنبیہ
۹۲	پرورش و تربیت کا میدان	۶۶	آیت ۱۲۱، ۱۲۲
۹۳	کھوکھلی باتیں	۶۸	جنگ اُحد
۹۳	جنگ اُحد میں شکست کے اسباب کا مختصر جائزہ	۶۸	اسباب جنگ
۹۴	آیت ۱۴۴، ۱۴۵	۶۸	جناب عباس کی بروقت اطلاع
۹۵	شان نزول	۶۹	مسلمانوں کی دفاعی تیاریاں
۹۵	شخصیت پرستی کی مانعت	۷۰	آغاز جنگ
۹۷	آیت ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸	۷۱	کون پکارا کہ محمد قتل ہو گئے ہیں
۹۸	گذشتہ زمانے کے مجاہدین	۷۱	آیت ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷
۱۰۰	آیت ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱	۷۱	جنگ کا خطرناک مرحلہ
۱۰۰	بار بار خطرے سے آگاہی	۷۴	آیت ۱۲۸
۱۰۱	دشمن کا خوفزدہ ہونا کامیابی کا ایک راستہ ہے	۷۵	ایک اشتباہ اور اس کا ازالہ
۱۰۲	آیت ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴	۷۶	آیت ۱۲۹
۱۰۴	کامیابی کے بعد شکست	۷۶	آیت ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲
۱۰۶	زمانہ جاہلیت کے دوسرے	۷۷	قرآنی آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط
۱۰۷	آیت ۱۵۵	۷۸	سود خوری کی حرمت کے چند مراحل
۱۰۷	ایک گناہ دوسرے گناہ کا سرچشمہ ہے	۷۹	آیت ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶
۱۰۸	آیت ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸	۸۰	سعادت کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت
۱۰۹	منافقین کی مفاد پرستی	۸۱	کیا جنت و دوزخ اس وقت موجود ہیں
۱۱۰	آیت ۱۵۹، ۱۶۰	۸۲	جنت اور دوزخ کہاں ہیں
۱۱۱	عام معافی کا حکم	۸۳	پرہیزگاروں کی نشانیاں



صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۱۲۷	پیغمبر کے لیے تسلی	۱۱۲	مشورہ کرنے کا حکم
۱۲۸	آیت ۱۷۸	۱۱۳	اسلام میں مشورہ کی اہمیت
۱۲۸	جن پر بھاری بوجھ ہے	۱۱۴	جس سے مشورہ کیا جائے اس کی ذمہ داری
۱۲۹	ایک سوال اور اس کا جواب	۱۱۵	حضرت عمر کی مجلس شوریٰ
۱۳۰	ایک ادبی نکتہ	۱۱۶	توکل کا نتیجہ
۱۳۱	آیت ۱۷۹	۱۱۷	آیت ۱۷۱
۱۳۱	مسلمانوں کی تطہیر	۱۱۹	آیت ۱۷۲، ۱۷۳
۱۳۲	آیت ۱۸۰	۱۲۰	جہاد میں شرکت نہ کرنے والے
۱۳۲	قید و بند کا بھاری طوق	۱۲۱	ایک مؤثر طریقہ تربیت
۱۳۳	آیت ۱۸۱، ۱۸۲	۱۲۱	آیت ۱۷۴
۱۳۵	شانِ نزول	۱۲۲	خدا کی بہت بڑی نعمت
۱۳۷	آیت ۱۸۳، ۱۸۴	۱۲۳	آیت ۱۷۵
۱۳۸	شانِ نزول	۱۲۴	جنگِ اُحد پر ایک نظر
۱۳۸	یہودیوں کی بہانہ تراشی	۱۲۵	آیت ۱۷۶، ۱۷۷
۱۳۹	آیت ۱۸۵	۱۲۵	مختلف گروہوں کو الگ الگ پہچانا جانا چاہیے
۱۵۰	موت کا اٹل قانون	۱۲۷	آیت ۱۷۸
۱۵۱	آیت ۱۸۶	۱۲۷	منافقین کی بے بنیاد باتیں
۱۵۲	شانِ نزول	۱۲۸	آیت ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱
۱۵۲	مقابلے اور پامردی سے تھک نہ جاؤ	۱۲۹	زندہ جاوید
۱۵۳	آیت ۱۸۷	۱۳۱	روح کی بقا کا شاہد
۱۵۴	علماء کی عظیم ذمہ داری	۱۳۱	شہیدوں کا اجر
۱۵۵	آیت ۱۸۸، ۱۸۹	۱۳۲	آیت ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴
۱۵۶	شانِ نزول	۱۳۳	غزوہ حمرہ الامد
۱۵۶	خود پسندی	۱۳۵	تربیتِ انبی کی فوری تاثیر
۱۵۷	آیت ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴	۱۳۵	آیت ۱۸۵
۱۵۸	آیات کی اہمیت	۱۳۶	آیت ۱۸۶، ۱۸۷



صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۱۸۸	ثمنی وثلاث ورباع	۱۶۰	خدا شناسی کا روشن ترین راستہ
۱۸۹	بیویوں سے عدالت کا مفہوم	۱۶۳	آیت ۱۹۵
۱۹۰	تعدد ازواج ایک اجتماعی ضرورت	۱۶۴	شان نزول
۱۹۲	ایک سوال اور اس کا جواب	۱۶۵	اہل خرد کے اعمال کا نتیجہ
۱۹۳	آیت ۴	۱۶۶	مرد اور عورت کی روحانی قدر و قیمت
۱۹۴	حق مہر عورت کے لیے ایک معاشرتی سہارا ہے	۱۶۷	آیت ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸
۱۹۶	آیت ۶، ۵	۱۶۷	شان نزول
۱۹۷	سفیہ کے کہتے ہیں	۱۶۸	ایک تکلیف دہ سوال
۱۹۹	چند اہم نکات	۱۶۹	قوت اور صنعت کے پہلو
۲۰۱	آیت ۷	۱۷۰	آیت ۱۹۹
۲۰۱	شان نزول	۱۷۱	شان نزول
۲۰۲	عورت کی حفاظت کے لیے ایک اور قدم	۱۷۱	سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں
۲۰۳	آیت ۸	۱۷۳	آیت ۲۰۰
۲۰۳	ایک اخلاقی حکم	۱۷۵	ایک سوال اور اس کا جواب
۲۰۴	آیت ۹	۱۷۷	سورۃ نساء
۲۰۴	یتیموں پر لطف و کرم کی بارش	۱۷۹	چند اہم نکات
۲۰۵	ایک ضروری وضاحت	۱۷۹	۱۔ سورہ نساء کا محل نزول
۲۰۶	آیت ۱۰	۱۷۹	۲۔ اس سورہ کے اہم موضوعات
۲۰۶	ہمارے اعمال کا باطنی چہرہ	۱۸۰	۳۔ اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
۲۰۸	آیت ۱۱، ۱۲	۱۸۱	آیت ۱
۲۰۹	شان نزول	۱۸۱	طبقاتی تقسیم اور گروہ بندی کے خلاف جہاد
۲۱۰	میراث ایک فطری حق ہے	۱۸۳	حضرت آدمؑ کے بچوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں
۲۱۱	میراث گذشتہ اقوام عالم میں	۱۸۵	آیت ۲
۲۱۳	ایک سوال اور اس کا جواب	۱۸۵	شان نزول
۲۱۳	مرد کی میراث عورت سے دو گنی کیوں	۱۸۶	آیت ۳
۲۱۴	مال باپ کی میراث	۱۸۷	شان نزول



صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۲۴۷	نکاح موقت ایک اجتماعی ضرورت	۲۱۵	ایک سوال اور اس کا جواب
۲۴۸	نکاح موقت پر کیے اعتراضات کا جواب	۲۱۶	میراث وصیت اور قرض کے بعد ہے
۲۴۹	رسل اور نکاح موقت	۲۱۶	میراث میں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے حصہ
۲۵۰	آیت ۲۵	۲۱۷	بھائیوں اور بہنوں کی میراث
۲۵۱	کینزوں سے نکاح	۲۱۸	چند اہم نکات
۲۵۲	محصنہ سے یہاں کیا مراد ہے	۲۱۹	آیت ۱۳، ۱۴
۲۵۳	آیت ۲۶، ۲۷، ۲۸	۲۲۱	اسلامی قانون میراث کی خصوصیات
۲۵۵	یہ پابندیاں کس بنا پر ہیں	۲۲۲	عول اور تعصیب کے کہتے ہیں
۲۵۶	آیت ۲۹، ۳۰	۲۲۳	آیت ۱۵، ۱۶
۲۵۷	معاشرے کی سلامتی کا دار و مدار اقتصادی سلامتی پر ہے	۲۲۴	اسلام کے تعزیری قوانین کا سہل اور متمتع طریقہ
۲۵۹	آیت ۳۱	۲۲۷	آیت ۱۷، ۱۸
۲۵۹	گناہان کبیرہ و صغیرہ	۲۲۸	قبولیت تو بے کے لیے شرطیں
۲۶۰	ایک اشکال اور اس کی وضاحت	۲۳۱	آیت ۱۹
۲۶۱	گناہ صغیرہ کس طرح گناہ کبیرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے	۲۳۲	شان نزول
۲۶۲	آیت ۳۲	۲۳۲	حقوق نسواں کا دوبارہ دفاع
۲۶۲	شان نزول	۲۳۳	آیت ۲۰، ۲۱
۲۶۳	یہ تفاوت و اختلاف کیوں ہے	۲۳۴	شان نزول
۲۶۵	آیت ۳۳	۲۳۵	آیت ۲۲
۲۶۷	آیت ۳۴	۲۳۶	شان نزول
۲۶۸	گھریلو نظام میں سرپرستی	۲۳۷	آیت ۲۳
۲۶۹	نافرمان عورتیں	۲۳۸	محرم سے نکاح کی حرمت
۲۷۰	ایک اشکال اور اس کا جواب	۲۳۹	محرم رضاعی کی حرمت کا فلسفہ
۲۷۱	آیت ۳۵	۲۴۱	پارہ پنجم
۲۷۱	خاندان کی مصالحتی عدالت	۲۴۱	آیت ۲۴
۲۷۳	آیت ۳۶	۲۴۲	اسلام میں وقتی شادی
۲۷۷	آیت ۳۷، ۳۸، ۳۹	۲۴۲	کیچم نسوخت ہو چکا ہے



صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۳۰۳	ماسد از جرائم	۲۷۸	دکھلا داور رضائے الہی
۳۰۶	آیت ۵۷، ۵۷	۲۸۰	آیت ۴۰
۳۰۷	ایک سوال اور اس کا جواب	۲۸۰	مذہب کیا چیز ہے
۳۰۸	آیت ۵۸	۲۸۱	آیت ۴۱، ۴۲
۳۰۹	شان نزول	۲۸۳	آیت ۴۳
۳۰۹	دواہم اسلامی قانون	۲۸۵	چند فقہی احکام
۳۱۱	اسلام میں امانت اور عدالت کی اہمیت	۲۸۵	نشے کی حالت میں نماز کی حرمت
۳۱۲	آیت ۵۹	۲۸۶	حالت جنابت میں نماز کا باطل ہونا
۳۱۲	اولوالامر کون ہیں	۲۸۷	چند اہم نکات
۳۱۵	ایک قابل توہم بات	۲۸۸	تیمم کا فلسفہ
۳۱۶	چند سوالات کا جواب	۲۸۹	آیت ۴۴، ۴۵
۳۱۷	احادیث کی گواہی	۲۹۰	آیت ۴۶
۳۱۹	آیت ۶۰	۲۹۱	یہودیوں کے کردار کا ایک رخ
۳۱۹	شان نزول	۲۹۲	آیت ۴۷
۳۲۰	طاغوت کا فیصلہ	۲۹۲	ہٹ دھرم افراد کی سرنوشت
۳۲۰	آیت ۶۱، ۶۲، ۶۳	۲۹۳	آیت ۴۸
۳۲۱	طاغوت کے فیصلے کا نتیجہ	۲۹۳	امید سے معمور آیت
۳۲۲	آیت ۶۴	۲۹۴	گناہوں کی کنشش کے اسباب
۳۲۵	آیت ۶۵	۲۹۶	آیت ۴۹، ۵۰
۳۲۵	شان نزول	۲۹۷	شان نزول
۳۲۶	حق کے سامنے تسلیم فرم کرنا	۲۹۷	خود ستائی
۳۲۷	آیت ۶۶، ۶۷، ۶۸	۲۹۹	آیت ۵۱، ۵۲
۳۲۹	آیت ۶۹، ۷۰	۲۹۹	شان نزول
۳۲۹	شان نزول	۳۰۰	سازشی لوگ
۳۳۰	جنت کے ساتھی	۳۰۱	جبت و طاغوت
		۳۰۲	آیت ۵۳، ۵۴، ۵۵

۹۲ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا يَحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۹۲۔ تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

تفسیر

ایمان کی ایک نشانی

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا يَحِبُّونَ لفظ ”پر“ عربی زبان میں وصعت کا ہم معنی ہے۔ یہی لیے وسیع صحرا کو ”بر“ (باکی فتح کے ساتھ) کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے اُن نیک کاموں کو بر (باکی زیر کے ساتھ) کہتے ہیں جن کا ثمرہ وسیع عام اور وسیع ہو اور دوسرا نیک پہنچے ”پر“ اور ”خیر“ کے درمیان لغت عرب کے لحاظ سے یہ فرق ہے کہ ”پر“ وہ نیک کام ہوتا ہے جو توجہ اور قصد و اختیار کے ساتھ ہو لیکن ”خیر“ ہر قسم کی نیکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی توجہ اور التفات کے بغیر کی گئی ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے تم لوگ اُس وقت تک ”بر“ اور نیکی کی حقیقت کو نہیں پاسکتے جب تک اُس چیز میں سے راہ خدا میں خرچ نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔

اس آیت میں لفظ ”بر“ کے تعلق مفسرین حضرات نے تفصیلی گفتگو کی ہے بعض نے اس کا معنی بہشت بتایا ہے اور بعض کے نزدیک یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہم معنی ہے جب کہ ایک ذمہ مفسرین نے اس سے نیک جزا مراد لی ہے۔ لیکن قرآنی آیات سے جو مفہوم ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک وسیع معنی میں ہے جس میں تمام نیکیاں خواہ ایمان ہو یا پاک عمل شامل ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ سے معلوم ہوتا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

یعنی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف پھیر لو۔ نیک لوگ تو وہ ہیں جو اللہ، یوم آخرت، ملائکہ، کتاب اور انبیاء پر ایمان لائے اور انہوں نے اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں اور فقیروں کو (اپنا) مال دیا اور اسی طرح مسافروں کے لیے، سوال کرنے والوں کے لیے اور غلاموں کو آزاد کروانے کے لیے اپنا مال خرچ کیا، نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور جب وہ عہد کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں اور وہ فقر، بیماری اور جنگ





میں صبر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ راستباز اور پرہیزگار ہیں۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار عالم، روز جزا اور انبیاء و مرسلین پر ایمان لانا، ماجتہدوں کی مدد کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، عہد پورا کرنا اور مشکلات و عواید کا استقامت اور پامردی سے مقابلہ کرنا یہ سب بڑے شعبے شمار ہوتے ہیں۔  
 بنا برائیں حقیقی نیک لوگوں کا مقام حاصل کرنے کے لیے بہت سی شرائط ہیں ان میں سے ایک شرط ان اموال میں سے راہ خدا میں خرچ کرنا ہے جن سے انسان کا دلی لگاؤ ہو کیونکہ خدا کے ساتھ حقیقی عشق و محبت اور اصول انسانیت و اخلاق کا احترام اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب انسان ایک ایسے دورا ہے پر کھڑا ہو جہاں ایک طرف مال و ثروت یا مقام و منصب ہو جو کہ انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اس کے مقابلے میں دوسری طرف خدا، حقیقت، انسانی ہمدردی اور نیکو کاری ہو۔ اگر اس نے پہلی جانب سے صرف نظر کرتے ہوئے دوسری جانب کو اختیار کیا تو اس سے اس کے عشق اور لگاؤ کا علم ہو سکتا ہے۔

### آیات قرآنی کا مسلمانوں کے دلوں پر اثر

قرآن کریم کی آیات کا مسلمانوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر ہوتا تھا کہ آیات کے نازل ہوتے ہی ان کے اثرات ظاہر ہو جاتے تھے۔ اسی ضمن میں مذکورہ آیت کے متعلق تواریخ اور اسلامی تفسیروں میں یہ واقعات لکھے گئے ہیں:

۱۔ ایک صحابی رسول ابو طلحہ انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ میں اس کا کھجوروں کا ایک بہت ہی صاف ستھرا اور خوبصورت باغ تھا۔ پورے مدینہ میں اس کا چرچا تھا۔ اس باغ میں صاف و شفاف پانی کا ایک چشمہ بھی تھا۔ جس وقت پیغمبر اکرمؐ اس باغ میں تشریف لاتے تو وہ پانی نوش فرماتے اور اس سے جلو بھرتے۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابو طلحہ اس سے بہت زیادہ آمدنی حاصل کرتا تھا۔  
 آیت برکے نزول کے بعد وہ آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ میرے اموال میں سے میرے نزدیک زیادہ محبوب صرف یہی باغ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے راہ خدا میں خرچ کر دوں تاکہ یہ میرے لیے تو شرفِ آخرت بنے لیکن کوئی نے ارشاد فرمایا:

بِخِجِّ بَخِجِّ ذَلِكْ هَالِكٌ رَابِحٌ لَّكَ -

آخرین تجھ پر یہی ثروت ہے کہ جو تیرے لیے نفع مند ہوگی۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا میرا مشورہ ہے کہ اسے اپنے رشتہ داروں کو دے دو۔ ابو طلحہ نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی اور اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا۔

۲۔ ایک دن ابو ذر کے ہاں ایک مہمان آیا ابو ذر اتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے مہمان سے معذرت طلب کی کہ میں اپنی باتلاہ کی وجہ سے خود تیری پذیرائی نہیں کر سکتا میرے چند اونٹ فلاں مقام پر موجود ہیں خدمت کر کے ان میں سے ایک بہترین اونٹ لے آؤ تاکہ اسے تمہارے لیے نخر کر دوں۔ وہ ایک کمزور اونٹ لے آیا۔ جناب ابو ذر نے اس سے کہا کہ تو نے میرے ساتھ خیانت کی، یہ اونٹ کس لیے لے کر آئے ہو؟ اس نے جواب دیا میں نے یہ سوچا کہ دوسرے اونٹوں کی کبھی آپ کو ضرورت پڑے گی۔ تو ابو ذر نے کہا کہ مجھے

لے مجمع البیان، صحیح مسلم و بخاری۔





ان کی اس وقت کے لیے ضرورت ہے جب میری آنکھیں اس جہان فانی سے بند ہوں گی (کیا ہی اچھا ہے کہ اس دن کے لیے سامان کر لوں)۔  
خدا فرماتا ہے کہ:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ

۳ بارون رشید کی زوہر زبیدہ کے پاس قرآن مجید کا ایک بہترین قیمتی نسخہ تھا جو زرو جو اہرات سے مزین و مریض تھا اور وہ اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ ایک روز وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے جب آیہ "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ" پڑھتی تھی تو آیت پڑھتے ہی وہ درطہ صیرت میں پڑ گئی اور اپنے دل میں خیال کرنے لگی کہ اس قرآن مجید سے میرے نزدیک کوئی چیز بہتر نہیں ہے لہذا اسے راہ خدا میں خرچ کرنا چاہیے اس نے جو اہر فرڈٹوں کو بلوا کر اس کی زیب و زینت کی چیزیں اور جو اہرات فروخت کر دیئے اور ان کی قیمت سے مجاز کے بیابانوں میں باریشٹینوں کے لیے پانی بہایا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ آج بھی ان میں سے کچھ کنوئیں موجود ہیں اور ای کے نام سے منسوب ہیں۔

۹۳ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلالًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنزَلَ التَّوْرَةُ قُلْ فَاتَّبِعُوا بِالْتَّوْرَةِ فَاذْكُوهَا إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

۹۴ فَمَنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○

۹۵ قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○

ترجمہ

۹۳ تمام (پاک) غذائیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں سوائے ان کے جنہیں اسرائیل (یعقوب) نے تورات کے نزول سے پہلے اپنے لیے حرام قرار دیا تھا (مثال کے طور پر اونٹ کا گوشت جو ان کے لیے ضرر رساں تھا) ان سے کہو اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو تو لاؤ تورات اور اسے پڑھو (یہ غلط باتیں جو تم گذشتہ انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہو تمہاری تخریف شدہ تورات میں بھی نہیں ہیں۔



۹۴ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی گھڑی ہوئی جھوٹی باتیں خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں (اور وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں) وہی درحقیقت ظالم ہیں۔

۹۵ کہہ دو، اللہ نے پج فرمایا (اور یہ ابراہیم کے پاک دین میں نہیں تھا) لہذا تم کیسے ہو کر ابراہیم کے آئین کی پیروی کرو جو حق پسند تھے اور یقیناً ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

### شان نزول

مفسرین کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں نے پیغمبر اکرمؐ پر خصوصیت کے ساتھ دو اعتراض کیئے تھے:

- ۱ پیغمبر اسلام نے اونٹ کے گوشت اور دودھ کو حرام کیوں قرار نہیں دیا جبکہ یہ نہ صرف ابراہیمؑ بلکہ حضرت نوحؑ کے دین میں بھی حرام تھے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے یہودی بھی اسے حرام سمجھتے تھے۔
- ۲ رسول اسلام کیونکر گدشتہ زبیدیہ خصوصاً حضرت ابراہیمؑ کے وفادار ہو سکتے ہیں حالانکہ تمام پیغمبر بیت المقدس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ لیکن ختمی مرتبت نے اس کی بجائے کعبہ کو قبلہ بنایا۔

مندرجہ بالا آیات میں ان کی پہلی بات کا جواب دیا گیا ہے اور آئندہ آیات ان کے دوسرے اعتراض کا جواب دیں گی۔

### تفسیر

کل الطعام کان حلالاً لبني اسرائيل الا ما حرم اسرائيل على نفسه من قبل ان تنزل التوراة  
مندرجہ بالا آیت مکمل وضاحت کے ساتھ یہودیوں کے ان خیالات کو رد کرتی ہے جو وہ کھانے کی پاک اور حلال اشیاء (مثلاً اونٹ کا دودھ اور گوشت) کے متعلق رکھتے تھے۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ابتداء میں یہ تمام اشیاء بنی اسرائیل کے لیے حلال و جائز تھیں سوائے ان اشیاء کے جن کو اسرائیل (یہ حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام تھا) نے اپنے اوپر حرام قرار دی تھیں۔ اس آیت میں اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی کہ حضرت یعقوبؑ نے کونسی غذا کس سبب سے حرام قرار دی تھی لیکن روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ اونٹ کا گوشت کھاتے تو آپ پر عرق النساء کا شدید حملہ ہوتا۔ لہذا انہوں نے اس غذا سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کرنے کا ارادہ کر لیا اور آپ کی اتباع میں آپ کے پیروکاروں نے بھی اس سے اجتناب کیا اور یہ بات ان کے اذہان میں پختہ ہو گئی لہذا انہوں نے اسے حرام سمجھا اور اسے ایک دینی حکم کی طرح خدا کی طرف منسوب کیا۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیت نے ان کے اس خیال کو غلط قرار دیا اور یہ واضح کیا کہ یہ صرف ان کی تہمت ہے۔

لہ عرق النساء ایک اعصابی مرض ہے اس کی وجہ سے کمر اور پاؤں کے اعصاب میں تکلیف ہوتی ہے جس سے بعض اوقات انسان پل پھرنے میں سکتا۔



اس آیت کے دوسرے حصہ "من قبل ان تنزل التوراة سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ تورات سے پہلے کوئی پاکیزہ غذائی اسرائیل پر حرام نہ تھی۔ البتہ تورات کے نازل ہونے اور حضرت موسیٰ کی آمد کے بعد یہودیوں کے ظلم و ستم کے نتیجہ میں کچھ پاک چیزیں ان پر حرام کر دی گئیں۔

قل فأتوا بالتوراة فاتلوها ان كنتم صدقین

اس جملے میں خداوند عالم نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ وہ یہودیوں کو دعوت دیں کہ وہ اسی موجودہ تورات کو لے آئیں اور اسے کھول کر پڑھیں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں ان کا دعویٰ غلط ہے۔ لیکن وہ اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ تورات میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں ہے اور یہ صرف ان کی تہمت ہے۔

فمن افترى على الله الكذب من بعد ذلك فاوتسك هم المظالمون

جب وہ لوگ تورات کو لانے پر آمادہ نہ ہوئے اور خدا پر ان کا بہتان باندھنا مسلم ہو گیا تو اس آیت میں انہیں خبردار کیا گیا کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ظالم و ستمگر ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو خدائی سزا اور عذاب میں گرفتار کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ جھوٹ اور مکر و فریب سے اور لوگوں کو بھی سیدھی راہ سے بھٹکا کر دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔

### موجودہ تورات اور گوشت کی حرمت

موجودہ تورات سفر "لاویان" گیا رھویں فصل میں حلال و حرام گوشت کے بارے میں اس طرح کا حکم موجود ہے، جنگالی کرنے والے اور پھٹے ہوئے ستم والے جانوروں کو نہ کھاؤ اور اونٹ باوجود یہ کہ وہ جنگالی کرتا ہے مگر اس کا نم پھٹا ہوا نہیں ہے، وہ تمہارے لیے حرام ہے۔

مذکورہ جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اونٹ کا گوشت اور باقی پھٹے ہوئے ستم والے جانوروں کو حرام جانتے تھے۔ لیکن دین ابراہیم اور نوح میں ان کی حرمت پر کسی قسم کی دلیل نہیں ملتی۔ لیکن ہے یہ چیزیں ان غذاؤں میں سے ہوں جو یہودیوں پر سزا کے طور پر حرام کی گئی ہوں۔

قل صدق الله فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين

جب تم نے دیکھا کہ میں اپنی دعوت میں سچا اور راست گو ہوں تو تم میرے دین کی پیروی کرو جو کہ ابراہیم کا پاک اور بے آلائش دین ہے۔ کیونکہ وہ ضیف تھا یعنی باطل ادیان کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل تھا اور اس کے احکام میں پاک غذاؤں کے متعلق ایک حکم بھی انحرافی اور بے دلیل نہیں تھا اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہیں تھا اور یہ جو مشرکین عرب اپنے آپ کو دین ابراہیم کا پیرو سمجھتے ہیں بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ بت پرست کہاں اور بت شکن کہاں۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر اس جملہ کو دہرایا گیا ہے کہ ابراہیم مشرکین میں سے نہیں تھے۔ کیونکہ پہلے ہی اشارہ کیا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے بت پرست اپنے آپ کو دین ابراہیم کا پیرو سمجھتے تھے اور وہ اس دعویٰ میں اتنے سخت تھے کہ دوسرے لوگ حشاء ابراہیم کے پیروکار کے طور پر ان کا تعارف کراتے تھے۔ اس لیے قرآن بار بار اس بات کی نفی کرتا ہے۔





۹۶ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى  
لِّلْعَالَمِينَ ۝

۹۷ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلَّهِ  
عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ  
فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝

ترجمہ

۹۶ پہلا گھر جو لوگوں (اور خدا سے تفرع و نضوع) کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ سرزمین مکہ میں ہے جو بابرکت ہے اور دنیا کے لیے ہدایت  
رہبری کا سبب ہے۔

۹۷ اس میں واضح و آشکار نشانیاں ہیں۔ ان میں سے مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہو وہ امان میں ہے اور جو لوگ اس کی  
طرف جانے کی قدرت رکھتے ہیں ان پر واجب ہے کہ وہ خدا کے لیے (اس کے) گھر کی زیارت کریں اور جو کوئی کفر کرے (حج  
ترک کرے۔ اس نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا، تو پھر) خدا تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

تفسیر

لوگوں کے لیے پہلا گھر

ان اول بیت و وضع للناس للذي ببكة مباركا۔

جیسا کہ گذشتہ آیات کے ضمن میں کہا جا چکا ہے کہ یہودیوں کو پیغمبر اسلام پر دو اعتراض تھے جن میں سے پہلے کا جواب ان آیات میں  
دیا گیا ہے۔ دوسرا اعتراض ان کو یہ تھا کہ بیت المقدس کو خانہ کعبہ پر برتری حاصل ہے۔ اس کا جواب مندرجہ بالا آیات میں دیا جا رہا ہے  
آیت بتلا رہی ہے کہ اگر کعبہ کو مسلمانوں کے قبل کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، چونکہ روئے زمین  
پر وجود میں آنے والا یہ خدا کا پہلا گھر اور سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔ اس سے قبل دعا اور پروردگار عالم کی عبادت کا کوئی مرکز نہیں  
تھا۔ صرف یہی ایسا گھر ہے جو انسانی معاشرہ کے لیے ایسے نقطہ پر وجود میں لایا گیا ہے جو اجتماعیت کا مرکز ہے اور پُربرکت مقام ہے۔  
اسلامی تاریخ کے مصادر بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ حضرت آدم کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ جب طوفانِ نوح



میں اسے کچھ نقصان پہنچا تو حضرت ابراہیم نے اسے از سر نو تعمیر کیا۔ بنا بریں قبلہ کی حیثیت سے اس پہلے خانہ توحید کا انتخاب دوسرے ہر مقام سے زیادہ مناسب ہے۔ البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں خانہ کعبہ جس کا دوسرا نام بیت اشد ہے کا تعارف لوگوں کے گھر کے طور پر کرایا گیا ہے۔ اس تعبیر سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جو کچھ خدا کے نام پر ہے اور اس کے لیے ہے اسے لوگوں اور ان کے بندوں کی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور جو کچھ بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے ہے وہ خدا کے لیے ہے۔

اس آیت سے ضمنی طور پر خدا کے اصلاحی پروگراموں میں سبقت کرنے کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو آیت بالائیں خانہ کعبہ کی پہلی فضیلت اس کا سب سے پہلا ہونے کو قرار دیا گیا ہے۔ یہیں سے حجر اسود کے احترام کے بارے میں ہونے والے اعتراض کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس پتھر کے ٹکڑے کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے کہ سارا سال کئی لاکھ انسان اس کا بوسہ لینے اور اسے مس کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کام کو ایک تاکیدی مستحب کے طور پر کیوں خانہ کعبہ کی زیارت کے پروگرام میں شامل کیا گیا؛ لیکن اس پتھر کی مختصر تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو پوری دنیا کے کسی پتھر میں پیدا نہیں ہو سکتی اور وہ یہ کہ یہ ایک انتہائی سابق ترین چیز ہے جو عمارتی مصالح کے طور پر عبادت میں نصب کی گئی ہے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ صنفِ ہستی کی تمام عبادت گاہوں میں یہاں تک کہ خانہ کعبہ کی بھی بار بار از سر نو تعمیر ہوئی ہے اور جو مصالح ان کی تعمیر میں لگائے گئے وہ تبدیل ہو گئے صرف یہی پتھر کا ٹکڑا ہے جو ہزار ہا سالوں کے گزرنے کے باوجود ابھی تک اس قدیم ترین عبادت گاہ میں اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس لیے دراصل اس کی اہمیت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ خدا کی راہ میں اور لوگوں کی خدمت میں سب سے قدیم ہے۔

علاوہ ازیں یہ پتھر مختلف زبانوں کے مومنین کی بے شمار نسلیوں کی ایک خاموش تاریخ ہے۔ یہ پتھر عظیم انبیاء اور خدا کے خاص بندوں سے وابستگی کی یاد کو زندہ کرتا ہے جنہوں نے اس کے پاس کھڑے ہو کر خدا کی بارگاہ میں دعا اور تضرع و زاری کی۔

اس مقام پر ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ گذشتہ آیت یہ بتلا رہی ہے کہ یہ سب سے پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے بنایا گیا۔ یہ واضح ہے کہ اس سے مقصود عبادت و پرستش کا پہلا گھر ہے۔ لہذا اس آیت سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ اس سے پہلے ربّائش کے کچھ گھر زمین میں موجود ہوں اور یہ تعبیر ان لوگوں کا واضح جواب ہے جو (تفسیر النساء کے مولف کی طرح) یہ کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم کے ہاتھوں بنا ہے اور وہ حضرت آدم کے ہاتھ سے بننے کو ایک افسانہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ ابراہیم سے قبل بھی عبادت گاہ اور پرستش کی جگہ موجود تھی اور ان سے پہلے حضرت نوح کی طرح دیگر انبیاء اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس بنا پر یہ کیسے ممکن ہے کہ خانہ کعبہ جو کہ دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سب سے پہلے بنا ہو۔

”بکہ“ سے کیا مراد ہے ؟

”بکہ“ اصل میں ”بک“ (بروزن) ”نک“ کے مادہ سے اژدحام اور اجتماع کے معنی میں ہے اور خانہ کعبہ یا وہ زمین جس میں خانہ کعبہ موجود ہے اسے ”بکہ“ یہاں لوگوں کے اژدحام اور اجتماع کی دہر سے کہا جاتا ہے یہ بھی بعید نہیں کہ پہلے اس کا یہ نام نہ ہو لیکن جب یہ عبادت کے لیے قائم ہو چکا ہو اسے یہ نام دیا گیا ہو۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں منقول ہے کہ مکہ پورے شہر کا نام ہے اور بکہ اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں خانہ کعبہ بنا ہوا ہے۔



بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ بکہ دراصل مکہ ہی ہے اور اس کی ”سیم“ یہاں ”باد“ سے بدل گئی ہے جیسے ”لازم“ اور ”لاذب“ دونوں عربی زبان میں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

خانہ کعبہ اور اس کی زمین کو بکہ کے ساتھ موسوم کرنے کے سلسلہ میں ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس لفظ کا معنی ہے نخوت و مغرور کو دور کرنا۔ چونکہ اس عظیم مرکز میں ہر قسم کے امتیازات یکسر ختم ہو جاتے ہیں اور سرکش و مغرور لوگوں کو بھی یہاں عام لوگوں کی طرح تضرع و زاری کے لیے کھڑا ہونا چاہیے اس طرح ان کا تکبر و مغرور ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے اس مقام کو بکہ کہا جاتا ہے۔

### مسجد الحرام کی توسیع

پہنچے اسلام کے زمانے سے لے کر جس قدر مسلمان بڑھتے گئے تو فطری طور پر خانہ کعبہ کے زائرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لہذا حکام وقت کی طرف سے مسجد الحرام کی بھی توسیع ہوتی رہی۔

تفسیر عیاشی میں منقول ہے کہ عباسی خلیفہ منصور کے زمانے میں حجاج کی کثرت کی بنا پر پروگرام بنایا گیا کہ ایک دفعہ پھر مسجد الحرام کو وسیع کیا جائے۔ خلیفہ نے ان لوگوں کو بلایا جن کے گھر مسجد کے ارد گرد تھے تاکہ ان کے گھر خرید لیے جائیں لیکن وہ کسی قیمت پر بھی انہیں بیچنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ منصور بڑی مشکل میں گرفتار ہوا کیونکہ ایک طرف وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ طاقت کے زور سے ان کے گھر خراب کرے کیونکہ اس کا اچھا اثر نہ ہوتا اور دوسری طرف وہ لوگ اپنے گھر دینے کے لیے تیار بھی نہ تھے مگر سلسلے میں اس نے حضرت امام صادق سے استفسار کیا آپ نے فرمایا کہ اس بارے میں چنداں فکر کی ضرورت نہیں اس ضمن میں واضح دلیل موجود ہے جس سے تم استدلال کر سکتے ہو۔ اس نے پوچھا وہ کونسی دلیل ہے۔ فرمایا کلام خدا۔ پوچھے کیا کلام الہی میں کہاں سے استدلال لایا جاسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آیت ”ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا سے استدلال کیا جاسکتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ خانہ کعبہ ہے۔ اس لیے اگر خانہ کعبہ سے پہلے ان کے گھر یہاں موجود ہوتے تو خانہ کعبہ کے اطراف ان کی ملکیت میں ہوتے لیکن اگر خانہ کعبہ ان سے پہلے ہے تو یہ حریم (جہاں تک خانہ کعبہ کے زائرین کی ضرورت ہے) کعبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ منصور نے ان لوگوں کو بلوا کر ان کے سامنے اسی انداز سے استدلال کیا وہ یہ سُن کر لاجواب ہو گئے اور کہنے لگے جس طرح آپ کی مرضی ہو ہم آپ کی موافقت کریں گے۔

اسی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ اس قسم کا واقعہ مہدی عباسی کے دور میں پیش آیا۔ اس نے اس دور کے فقہاء سے جو عیاشی سب نے کہا کہ اگر گھروں کے مالک اس پر راضی نہ ہوں تو غصب شدہ جگہ کو مسجد الحرام میں داخل کرنا مناسب نہیں۔ علی ابن یقین نے اس مسئلہ کو حضرت امام موسیٰ بن جعفر سے حل کرانے کے لیے اجازت چاہی۔ مہدی نے والی مدینہ کو لکھا کہ وہ اس مشکل کا حل امام موسیٰ کاظم سے طلب کرے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا لکھو۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم اگر خانہ کعبہ پہلے بنا ہے اور لوگ بعد میں اس کے اطراف و کنارے میں سکونت پذیر ہوئے ہیں تو اس کے اطراف کی فضا کا تعلق خانہ کعبہ سے ہے اور اگر لوگوں کی سکونت وہاں خانہ کعبہ سے پہلے تھی تو وہ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ جب یہ جواب مہدی عباسی کو موصول ہوا تو اس کو اتنی مسرت ہوئی کہ اس نے وہ پروانے کر اُسے بوسہ دیا اور حکم دیا کہ ان گھروں





کو شمار کیا جائے۔ گھروں کے مالک برافروختہ ہو کر امام موسیٰ بن جعفر کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ مہدی کو خط لکھیں کہ وہ گھروں کی قیمت انہیں واپس کر دے۔ حضرت نے ان کی خواہش پوری کر دی اور مہدی نے بھی انہیں راضی کیا۔ یہ دو روایات ایک باریک استدلال پر مشتمل ہیں جو حقوق کے بارے میں مروجہ قوانین سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ خانہ کعبہ بیسا عبادت خانہ جب ایک نئی زمین میں بنا تو اس کی ضروریات کے پھیلاؤ تک وہ اس سرزمین پر اولیت رکھتا ہے البتہ جب تک یہ احتیاج ضرورت کا پہلو پیدا نہیں کرتی دوسرے لوگ بھی اس کے جوار سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن جب ضرورت ہو تو اس کے حق اولیت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

### خانہ کعبہ کی خصوصیات

ان دو آیات میں پہلی عبادت گاہ ہونے کے علاوہ خانہ کعبہ کی چار اور خصوصیات بیان ہوئی ہیں:

#### مبارک

مبارک کا معنی بابرکت اور فائدہ مند ہے۔ کعبہ اس لحاظ سے مبارک ہے کہ وہ مادی اور روحانی دونوں طرح سے بہت ہی برکت والی زمین پر واقع ہے۔ اس مقدس سرزمین کی روحانی برکتیں، خدائی جذبات حرکت و جنبش اور خصوصاً حج کے موقع پر وحدت و اتحاد کی فضا کے آثار کسی سے پوشیدہ نہیں اور اگر صرف حج کی ظاہری رسومات اور شکل و صورت کے پہلو پر اکتفاء نہ کی جائے بلکہ اس کی روح اور فلسفہ زندہ ہو تو اس کی حقیقی برکت مزید واضح اور روشن ہوگی۔ اگرچہ یہ سرزمین مادی لحاظ سے خشک اور بے آب و گیاہ ہے اور طبعی طور سے وہ کسی طرح بھی کوائف زندگی سے مناسبت نہیں رکھتی پھر بھی طویل عرصے سے یہ ایک آباد اور متحرک شہر رہا ہے۔ خصوصاً تجارت کے لیے شروع سے اس کی مرکزیت قائم ہے۔

#### هدی للعالمین

کعبہ عالمین کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے اور لوگ دور افتادہ علاقوں سے خشکی کے اور دریائی راستوں کو روندتے ہوئے اس عظیم عبادت گاہ کی طرف کھینچے پلے آتے ہیں اور شان و شوکت سے اُن مراسم حج میں شریک ہوتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے مروج ہیں۔ حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت کے عرب بھی خانہ کعبہ کا احترام کرتے تھے اور مراسم حج کو دین ابراہیمؑ سمجھ کر بجالاتے تھے اگرچہ اس میں انہوں نے اپنی طرف سے کچھ خرافات بھی شامل کر لی تھیں اور اپنے ان ناقص مراسم کے باوجود کافی حد تک اپنے غلط کاموں سے وقتی طور پر ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ اس طرح سب لوگ حتیٰ کہ بت پرست بھی اس عظیم گھر کی ہدایت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اس مقدس گھر کی روحانی اور معنوی کشش سب کو مجبوراً متاثر کر لیتی ہے۔

#### فیہ آیات بینات مقام ابراہیم

اس گھر میں خدا پرستی، توحید اور روحانیت و معنویت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک اس کا دوام اور بقا ہے اُن طاقتور دشمنوں کے مقابلہ میں جو اس کو نیست و نابود کرنے پر تگے ہوئے تھے۔ دوسری نشانی حضرت ابراہیمؑ جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کے وہ آثار ہیں جو اس کے قرب و جوار میں باقی رہ گئے ہیں۔ مثال کے طور سے زمزم، صفا و مروہ، رکن، عظیم، حجر اسود اور حجر اسماعیل جہاں میں سے ہر ایک

عاشیہ برصغیر آئندہ



گذشتہ زمانوں کی ایک مجسمہ تاریخ ہے جو ان کی عظیم اور دائمی یادوں کو زندہ رکھتی ہے۔

ان نشانیوں میں سے مقام ابراہیم کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم تعمیر کعبہ اور مراسم حج کی انجام دہی یا عام لوگوں کو ان عظیم مراسم کے پورا کرنے کی دعوت دینے کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ بہر حال یہ ان اہم ترین قدیم نشانیوں میں سے ہے جو بے نظیر قرآنیوں کی یادوں اور ان کے اخلاص و جامعیت کو زندہ کرتی ہیں۔ مقام ابراہیم سے مراد خاص وہی جگہ ہے جہاں اس وقت وہ مخصوص پتھر ہے جس میں حضرت ابراہیم کے قدم کا نقش مبارک موجود ہے یا اس سے تمام حرم مکہ مراد ہے اور یا تمام موافق حج ہیں۔ اس سلسلہ میں مفسرین حضرات کے نظریات مختلف ہیں۔ لیکن اصول کافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت منقول ہے جو پہلے احتمال کی تائید کرتی ہے۔

ومن دخلہ کان امنًا

حضرت ابراہیم نے تعمیر کعبہ کے بعد شہر مکہ کے لیے جائے امن ہونے کی خداوند عالم سے درخواست کی تھی اور یہ دعا مانگی تھی:

خدایا! اس سرزمین کو جائے امن و امان قرار دے (ابراہیم - ۳۵)۔ خداوند عالم نے حضرت ابراہیم کی دعا کو مستجاب کیا اور اسے ایک مرکز امن قرار دیا۔ یہ جگہ روح کے آرام و اطمینان اور ان لوگوں کے امن و امان کا سبب ہے جو وہاں آتے ہیں اور اس سے روحانی تقویت حاصل کرتے ہیں اور مذہبی قوانین کے محافظ سے اس کی اہمیت اس طرح محترم شمار ہوتی ہے کہ وہاں ہر قسم کی جنگ و جدال اور مقابلہ و مبارزہ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

بالخصوص اسلامی نقطہ نظر سے کعبہ ایک جائے امن اور پناہ گاہ کے حوالہ سے پہچانا جاتا ہے یہاں تک حکم ہے کہ اس خطہ ارض میں رہنے والے جانور بھی امن و امان میں ہونے چاہئیں اور کسی کو ان سے سروکار نہیں ہونا چاہیے اور جو انسان اس میں جا کر پناہ حاصل کریں وہ بھی امان میں ہیں۔ حتیٰ کہ قاتل اور جارج ہی کیوں نہ ہوں ان سے بھی یہاں تعرض نہیں کیا جاسکتا مگر خانہ کعبہ کے احاطہ سے غلط فائدہ نہ اٹھایا جائے اور ظلم لوگوں کے حقوق پامال نہ ہوں۔ اگر مجرم افراد وہاں جا کر پناہ لیں تو حکم یہ دیا گیا ہے کہ ان پر کھانے پینے میں سختی کی جائے تاکہ وہ مجبور ہو کر وہاں سے باہر نکلیں اور انہیں حدود حرم سے باہر کھینچ کر اڑتک پہنچایا جائے۔

واللہ علی الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلاً

اس جملے میں تمام لوگوں کو حج کی انجام دہی کا حکم دیا گیا ہے اور اسے لوگوں کے ذمہ خدائی قرض قرار دیا گیا ہے، چنانچہ اللہ علی الناس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے لوگوں کے ذمہ ہے۔ لفظ "حج" کے لغوی معنی "قصد و ارادہ" ہیں یہی مناسبت سے راستہ کو "مجتہ" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو اپنے مقصد تک پہنچا دیتا ہے اور دلیل و برہان کو محبت اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مقصود کو روشن کر دیتی ہے۔ باقی یہ بات کہ ان مخصوص رسومات کو حج سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مراسم میں شرکت کے لیے چلتے وقت خانہ خدا کی زیارت کا قصد

ماشہ مفسر سابقہ نے کعبہ کے چاروں کونوں کو رکن کہتے ہیں۔

تلاہ حجر اسود اور خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان کی جگہ کو طیم کہتے ہیں، طیم اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں آذر ہام بہت ہوتا ہے اور یہ حضرت آدم کی توبہ کی جگہ بھی ہے۔ تلاہ حجر اسود ایک مخصوص جگہ ہے جو شمال مغرب میں توہی کی شکل میں ہے۔





کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر آیت مذکورہ میں حج کی اضافت بیت کی طرف ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حج کے مراسم پہلی دفعہ حضرت ابراہیمؑ کے دور میں راجح تھے اور اس کے بعد ایک سنت کی شکل اختیار کی۔ یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ بعد ازاں اسلام نے اس سے جاہلیت کے خرافات کو دور کر کے اسے خالص اور مکمل حج کی شکل دی۔

البتہ بیچ البلاغہ کے خطبہ قاصد اور دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ فریضہ حج حضرت آدمؑ کے زمانے سے شروع ہوا تھا لیکن اس نے حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں مزید دستوری شکل اختیار کی۔

ہر وہ شخص جو استطاعت حاصل کرتا ہے اس پر زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ حج واجب ہے اور مندرجہ بالا آیت بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ اس میں حکم مطلق ہے اور اس سے ایک دفعہ کی انجام دہی سے اطاعت ہو جاتی ہے۔ حج کے وجوب کے لیے صرف ایک شرط لگائی گئی ہے اور وہ ہے استطاعت و قدرت۔ جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے: *ومن استطاع الیہ سبیلاً* جو خانہ کعبہ کی طرف جانے کی قدرت رکھتا ہو۔ البتہ اسلامی روایات اور فقہی کتب میں استطاعت کی تفسیر میں یہ چیزیں شامل کی گئی ہیں زاد راہ، سواری، جسمانی توانائی، راستے میں امن اور حج سے دلہی کے بعد گزر اوقات کی طاقت لیکن دراصل یہ سب چیزیں اس آیت میں مندرج ہیں کیونکہ اصل میں استطاعت کے معنی میں توانائی اور قدرت اور اس میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ قانون دیگر اسلامی قوانین کی طرح صرف مسلمانوں کے لیے مختص نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اسے انجام دیں اور مشہور اصول ”الکفار مکلفون بالفروع کما انہم مکلفون بالاصول“ (کفار فروع کے لیے بھی اسی طرح مکلف ہیں جس طرح اصول کے) کی تائید مذکورہ آیت اور دیگر دلیلوں سے بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ ان اعمال و عبادات کی صحت کی شرط یہ ہے کہ پہلے وہ اسلام قبول کریں اور اس کے بعد انہیں انجام دیں لیکن یہ معنی نہ ہے کہ اسلام قبول کرنا ان ذمہ داریوں کی جوابدہی کو نہیں روکتا۔ ان عظیم مراسم کی اہمیت، فلسفہ حج اور اس کے انفرادی و اجتماعی آثار پر سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۴ سے لے کر ۲۰۳ تک تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

## حج کی اہمیت

ومن كفره فان الله غفیر عن العالمین

آیت کے آخری حصہ میں حج کی تاکید و اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ارشاد ہو رہا ہے کہ جو لوگ کفر اختیار کر کے اس خدائی حکم کی پرواہ نہ کریں اور اس کی مخالفت کریں تو وہ خود اپنے تئیں نقصان پہنچاتے ہیں کیونکہ خدا تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

لے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حج پہلی دفعہ دس ہجری میں فرض ہوا۔ اسی سال پیغمبر اکرمؐ نے کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ تمام جگہ کے لوگوں کو اطلاع دیں اور انہیں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آمادہ کریں۔ مراسم عمرہ اس سے پہلے بھی پیغمبر اکرمؐ اور کچھ مسلمان ادا کر چکے تھے۔

لے متعلقہ آیات کے ضمن میں تفسیر نمونہ کی دوسری اور پہلی جلد کا مطالعہ فرمائیں۔



لفظ کفر کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور دینی اصطلاح میں اس کا ایک وسیع معنی ہے کیونکہ حق سے ہر طرح کی مخالفت اس میں شامل ہے چاہے مراد اصول میں ہو یا فردی احکام میں۔ اب اگر یہ اس کا استعمال اصول کی مخالفت میں ہونے لگا ہے مگر یہ اس بات کی دلیل نہیں کر رہا ہے کہ یہ منہصر ہے چنانچہ آیت مذکورہ میں ترک حج کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی بنا پر حضرت امام جعفر صادقؑ نے ایک روایت میں اس آیت میں کفر کا مفہوم ترک حج بیان فرمایا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ایمان کی طرح کفر کے بھی کئی مدارج و مراحل ہوتے ہیں جن میں ہر ایک مخصوص احکام کا حامل ہے۔ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونے سے کفر و ایمان سے مربوط آیات و روایات کے بہت سے اشتباہات دور ہو سکتے ہیں۔ لہذا اگر سود کھانے والوں کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ میں اور جادو گروں کے متعلق سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں کفر کا لفظ آیا ہے تو اس سے بھی یہی مقصود ہے۔ بہر صورت اس آیت سے دو مطلب نکل سکتے ہیں:

پہلا یہ کہ حج بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس کے ترک کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مرحوم صدوقؑ نے کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں رسالتاً سے روایت بیان کی ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

يا اعلیٰ تارک الحج وهو مستطیع کافر یقول اللہ تبارک و تعالیٰ و اللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین یا علی! من سوف الحج حتی یموت بعثہ اللہ یوم القیمۃ یهودیا و نصرانیا۔

اے علی! جو شخص حج کو ترک کرے باوجودیکہ وہ استطاعت رکھتا ہو تو وہ کافر شمار ہوگا۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ استطاعت رکھنے والے لوگوں پر خدا کے گھر کی طرف حج بجالانے کے لیے جانا لازمی اور ضروری ہے اور جو کفر اختیار کرے (یعنی اسے چھوڑ دے) تو اس نے اپنا نقصان کیا ہے اور خدا ان سے بے نیاز ہے۔ اے علی! حج میں تاخیر کرے یہاں تک کہ دنیا سے پہلے بے تو خدا سے قیامت کے دن یہودی یا نصرانی مشور کرے گا۔

دوسرا مطلب یہ کہ اس اہم خدائی فریضہ کی انجام دہی تمام دینی پروگراموں کی طرح لوگوں کی تربیت اور نفع کے لیے ہے اور خدا جو تمام سے بے نیاز ہے یہ اس کے لیے فائدہ مند نہیں ہے۔

۹۸ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ

۹۹ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنُ امْنٌ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَ

أَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ

۱۰۰ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ

۱۰۰ تفسیر صفائی، زیر نظر آیت کے ذیل میں، بحوالہ تہذیب۔



۱۰. وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۚ وَمَنْ يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

ترجمہ

۹۸ (اے پیغمبر! ان سے) کہو: اے اہل کتاب! تم کیوں (ویدوہ و دانستہ) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کا شاہدِ حال ہے۔

۹۹ کہو: اے اہل کتاب! یہ کیا ہے کہ جو کوئی اللہ پر ایمان لانا چاہتا ہے تم اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو اور اسے میڑھی چال چلانا چاہتے ہو۔ حالانکہ تم حقیقتِ حال سے بے خبر نہیں ہو۔ یاد رکھو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

۱۰۰ اے ایماندارو! اگر تم اہل کتاب میں کسی گروہ (کہ جن کا کام نفاق اور تمہارے درمیان کینہ و عداوت کی آگ بھڑکانا ہے) کی باتوں پر کاربند ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔

۱۰۱ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کی راہ اختیار کرو۔ جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ کی آیتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور اس کا رسول (تعلیم و رہنمائی) کے لیے تم میں موجود ہے۔ (لہذا خدا سے تسک رکھو) اور یاد رکھو کہ جو کوئی مضبوطی سے اللہ کا ہوا تو بلاشبہ اس پر سیدھی راہ کھل گئی (نہ تو اس کے لیے نفرت ہے اور نہ گمشگی کا اندیشہ)۔

شانِ نزول

ان آیات کے شانِ نزول کے سلسلے میں جو کچھ شیعد اور سنی تصنیفات میں نقل ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شامی بن قیس ایک یہودی تہذیبہ ضعیف العمر، تاریک دل اور کفر و عناد میں کم نظیر تھا، ایک دن وہ مسلمانوں کے ایک مجمع کے پاس سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ اس و خزرج جو سالہا سال ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہے، انکے بعض افراد انتہائی صلح و آشتی اور محبت و غلوس سے ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجلس کی فضا انس و محبت سے معطر ہے اور شدید اختلافات کی جو آگ زمانہ جاہلیت میں ان میں شعلہ زن تھی وہ یکسر بجھ چکی ہے۔ یہ حالت دیکھ کر وہ حمد کے مارے عمل اٹھا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اگر یہ لوگ حضرت محمد کی پیروی کر کے اتنے آگے بڑھتے ہیں تو یہودیت کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ اسی دوران اس کے ذہن میں ایک سازش آئی اور اس نے ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا کہ وہ ان کے ایک گروہ سے میل جول رکھے اور اس و خزرج کے درمیان خونیں واقعات کی یاد تازہ کرے اور ان کی نظروں کے سامنے ان واقعات کی تصویر کشی کرے۔





يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَطَيَّبُوا ضَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَأَنزِيلِ  
 اس کے بعد روئے سخن فاضل مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے ان کو متنبہ کیا گیا کہ اگر وہ دشمن کی زہر آلود باتوں میں آگئے مابھی اپنے دریاں  
 رشتہ اندازی کرنے کی اجازت دی اور ان کے دوسوں سے متاثر ہوئے تو بعید نہیں کہ ان سے ایمان کا رشتہ ختم ہو جائے اور وہ کفر کی طرف  
 پلٹ جائیں۔ کیونکہ دشمن اول تو یہ کوشش کرتا ہے کہ ان کے درمیان دشمنی و عداوت کی آگ بھڑکائے اور انہیں ایک دوسرے سے لڑوانے  
 یکن یہ ستم ہے کہ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے دوسوں کو جباری و ساری رکھتا ہے تاکہ انہیں اسلام سے مکمل طور پر ریگانہ کرے۔  
 گذشتہ بیان سے عیاں ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں کفر کی طرف پلٹ جانے سے مراد ”حقیقی کفر اور اسلام سے مطلق بیگانگی“ ہے اور ممکن  
 ہے کہ کفر سے مراد زمانہ جاہلیت کی دشمنیاں اور عداوتیں ہوں جو کفر ہی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ ایمان بہت اور اخوت کا سرچشمہ ہے اور کفر پرانگی  
 اور عداوت کا منبع ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَاَنْتُمْ تَقْتُلُوْنَ عَلَيْهِمُ لَيْتُ اللّٰهُ وَفِيكُمْ رَسُوْلًا

اس کے بعد مومنین سے ایک تعجب خیز انداز میں سوال ہوتا ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ تم کفر کی راہ اختیار کرو حالانکہ یہ غیر صحیح تمہارے  
 درمیان موجود ہیں اور آیات خدا کی بھی مسلسل تلاوت ہوتی ہے اور باران وحی کے حیات بخش قطرات تمہارے دلوں پر پڑتے ہیں۔ حقیقت  
 میں یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر دوسرے لوگ گمراہ ہوں تو زیادہ تعجب نہیں۔ باعث تعجب تو یہ ہے کہ جو افراد پیغمبر کی صحبت میں بیٹھے ہیں  
 اور ہمیشہ عالم وحی سے ان کا تعلق رہتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ گمراہ ہو جائیں اور اگر ایسے لوگ گمراہ ہوں تو یہ خود ہی کوتاہی کرنے والے  
 ہیں اور اس کا عذاب بہت دردناک ہوگا۔

ان آیات کے آخر میں مسلمانوں کو وصیت کی گئی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے دوسوں سے چھٹکارہ حاصل کریں اور صراطِ مستقیم کی تہمت  
 کے لیے پروردگارِ عالم کے لطف کا دامن تقام لیں اور اس کی پاک ذات اور قرآن مجید کی مقدس آیات سے تنگ رکھیں اور انہیں صراحت  
 کے ساتھ کہتا ہے کہ جو شخص خدا سے تنگ رکھے اسے راہِ راست کی ہدایت حاصل ہو جائے گی۔

یہ آیات کئی لطیف نکات سے معمور ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ پہلی آیات جہاں روئے سخن یہودیوں کی طرف ہے میں باواسطہ خطاب  
 کیا گیا ہے کیونکہ پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان سے کہیں، جس پر لفظ ”قُلْ“ ”کہہ دو“ دلالت کرتا ہے لیکن آخری دو آیات جہاں خطاب  
 مومنین سے ہے، میں خطاب بلا واسطہ ہے اسی وجہ سے اس کی ابتداء لفظ قُلْ سے نہیں کی گئی اور اس سے صاحبِ ایمان لوگوں پر خدا  
 کا لطف و کرم ظاہر ہوتا ہے۔

- ۱۰۲- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ○
- ۱۰۳- وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ  
 أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا  
 حَفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○



تفسیر

## تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ

اس آیت میں پہلے تقویٰ کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اتھاہ کی دعوت کے لیے تمہید بنے۔ درحقیقت تقویٰ کی دعوت کسی اخلاقی اور عقیدہ کی مدد سے بغیر بے اثر یا کم اثر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اس آیت میں کوشش کی گئی ہے کہ اختلاف اور پرانگیگی کے عوامل ایمان اور تقویٰ کے ذریعے کمزور کیے جائیں اور اس لیے ایماندار افراد کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ سب کے سب خدا سے ڈرو اور تقویٰ اور پرہیزگاری کا حق ادا کرو۔

”حق تقویٰ“ سے کیا مراد ہے؟ اس ضمن میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ حق تقویٰ پرہیزگاری کا آخری درجہ ہے جس میں ہر قسم کے گنہگاروں اور حق سے انحراف کرنے سے پرہیز کرنا شامل ہے۔ اسی لیے تفسیر ”درمستور“ میں پیغمبر اکرمؐ اور تفسیر حاشیہ ”اور“ معانی الاخبار میں امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؐ نے حق تقویٰ کی تفسیر میں فرمایا:

(ان يطاع فلا يعصى و يذکر فلا ينسى و يشکر فلا يکفر)

یعنی حق تقویٰ یہ ہے کہ ہمیشہ اس کے فرامین کی اطاعت کی جائے اور کبھی اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور ہمیشہ اسے یاد رکھو اور کبھی بھی اسے فراموش نہ کرو اور اس کی نعمتوں پر شکر گزار رہو اور کفران نعمت نہ کرو۔

ظاہر اور واضح ہے کہ یہ حکم باقی احکام الہی کی طرح انسان کی بہت و طاقت سے وابستہ ہے لہذا مندرجہ بالا آیت اور سورہ تغابن کی آیت ۱۶ (فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) (جتنا ہو سکے پرہیزگاری اختیار کرو) ان دونوں آیات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے ان دو آیات کے تضاد کے بارے میں اور یہ کہ ان میں سے ایک دوسری کی نسخ ہے، گفتگو بے بنیاد ہے البتہ دوسری آیت حقیقت میں اصطلاحی لحاظ سے پہلی آیت کی تخصیص ہے اور اسے انسان کی توانائی کی مقدار سے مقید کرتی ہے۔ چونکہ ظاہر اتماد ماد کے ہاں لفظ نسخ تخصیص پر بھی بولا جاتا تھا۔ لہذا ممکن ہے ان لوگوں کی نسخ سے مراد تخصیص ہی ہو۔

و لا تموتن الا و انتہ مسلمون۔

حقیقت میں یہ جملہ اوس و خزر ج اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ ہوشمندی سے رہیں۔ صرف اسلام قبول کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس سے اہم بات یہ ہے کہ ایمان و اسلام کو زندگی کے آخری لمحات تک محفوظ رکھیں اور زمانہ جاہلیت کے کینہ کی بھیجی ہوئی آگ اور یہودہ غیر معقول تعصبات کی پیروی میں اپنے ایمان اور پاک اعمال کو بربادی کی جھینٹ نہ چڑھا دیں تاکہ آخرت میں انجام بدبختی سے بچنا نہ پہنچنا اس بات کی تاکید کی گئی کہ خیال رکھنا کہ دنیا سے ایمان و اسلام کے بغیر نہ جانا۔

اتھاہ کی دعوت

واحتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لا تفرقوا۔



اس آیت میں مسئلہ اتحاد اور ہر قسم کے اختلاف اور تفرقہ بازی سے اجتناب کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے سبھی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جاؤ۔

جبل اللہ (اللہ کی رسی) سے مراد کیا ہے؟ مفسرین نے اس کے متعلق کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد قرآن ہے اور بعض اس سے مراد اسلام مانتے ہیں۔ کچھ حضرات کے نزدیک خاندان رسالت اور ائمہ معصومین مراد ہیں۔ جو روایات پیغمبر اکرم اور اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں ان میں بھی کئی تعبیرات نظر آتی ہیں جیسا کہ تفسیر درخشور میں پیغمبر اکرم اور معانی الاخبار میں حضرت امام صادق سے نقل ہوا ہے کہ جبل اللہ قرآن کریم ہے اور تفسیر عیاشی میں امام محمد باقر سے منقول ہے کہ اللہ کی رسی سے مراد آل محمد ہیں اور لوگوں کو ان سے تمسک کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ لیکن ان احادیث اور ان تفاسیر میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ اللہ کی رسی سے مراد ہر قسم کا ذریعہ ہے جو ذات پاک کے ساتھ ربط رکھتا ہے۔ چاہے وہ وسیلہ اسلام ہو یا قرآن یا پیغمبر اور ان کے اہل بیت۔ بالفاظ دیگر تمام وہ چیزیں جو ذکر ہو چکی ہیں ارتباط خدا کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

### ”جبل اللہ“ کی تعبیر کا مقصد

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ان امور کو جبل اللہ سے تعبیر کرنے سے ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ انسان عام حالات میں جب کہ کوئی مزرعی اور رہنما نہ ہو، طبیعت کے دوسے، سرکش سرشت کی گہرائیوں اور جبل و نادانی کے تاریک کنوئیں میں پڑا رہتا ہے۔ اس پستی سے نجات حاصل کرنے اور اس تاریک کنوئیں سے باہر نکلنے کے لیے ایک مضبوط رسی کی ضرورت ہے جسے وہ پکڑ سکے اور اس سے باہر آسکے۔ یہ مضبوط رسی وہ خدائی رابطہ ہے جو قرآن، اس کے لانے والے اور ان کے حقیقی جانشینوں تک پہنچاتا ہے اور یہ لوگوں کو مادیت کی پستی سے نکال کر معنویت اور روحانیت کے عروج تک پہنچا دیتا ہے۔

### کل کے دشمن اور آج کے دوست

اس کے بعد قرآن کریم اتحاد و اخوت کی عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مسلمانوں کو گذشتہ افسوس ناک حالت پر غور و فکر کرنے اور اس پر اگندگی کا اس اتحاد اور وحدت کے ساتھ تقابل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، انہیں نہیں سمجھنا چاہیے کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن خداوند عالم نے اسلام و ایمان کی برکت سے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے انس پیدا کیا اور تم آج بھائی بھائی بن گئے۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ اس آیت میں لفظ نعمت کو کمزور لایا گیا ہے اور اس طرح سے اتفاق و اخوت کی نعمت کی اہمیت ان کے گوش گزار کی گئی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا نے مومنین کی تالیفِ قلوب کو اپنی طرف نسبت دیتے ہوئے کہا کہ خدا نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت پیدا کر دی۔ اس تعبیر سے اسلام کے ایک اجتماعی معجزہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر عربوں کی سابقہ عداوت پر غور کیا جائے کہ کس طرح سالہا سال سے ان کے دلوں میں گہرے کینے بھرے ہوئے تھے اور کس طرح ایک معمولی سے مسئلے پر ان کے درمیان خونیں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی تھی، خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ مومنانہاں پڑھ اور نیم وحشی افراد ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور آسانی سے گذشتہ چھوٹے چھوٹے





مسئلے کو طاق نیاں پر رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس صورت میں عظیم اسلام کے اجتماعی معجزہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عام اور روزمرہ کے طور طریقوں سے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس قوم کی کینہ پروردان قوموں کی ایک ملت بنائی جائے اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا جائے۔

مندرجہ بالا امر دیکھنے پر در عرب قبائل کے درمیان وحدت اور بھائی چارہ کی اہمیت علماء اور مؤرخین حتیٰ کہ غیر مسلم مورخین کی نظر سے مخفی نہیں رہی اور سب نے بڑے تعجب خیز انداز سے اس کا ذکر کیا ہے۔

جان ڈیون پورٹ، مشہور انگریز عالم رقمطراز ہے:

”.... محمد جیسے ایک عالم عرب نے اپنے ایک چھوٹے منتشر، بربہنہ اور اطلاق زدہ ملک کو ایک متحد اور منظم معاشرے میں تبدیل کر دیا اور روٹے زمین کی اقوام کے درمیان انہیں نئے صفات اور تازہ اخلاق کے ساتھ متعارف کرایا اور تیس سال سے کم عرصے میں اس طرز دروش نے حاکم قسطنطنیہ کو مغلوب کر دیا اور سلاطین ایران کو نیست و نابود کر دیا، شام، یمن، النہرین اور مصر کو فتح کیا اور ان کی فتوحات اوقیانوس اطلس سے لے کر دریائے فرز اور سیحون تک جا پہنچیں۔“

تومال کارل لکھتا ہے:

”خداوند عالم نے اسلام کے ذریعے عربوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف ہدایت کی۔ ایک بے حرکت اور منجمد قوم کو جس کی نہ کوئی آواز تھی اور نہ حرکت محسوس ہوتی تھی سے ایک ایسی ملت پیدا کی جسے گننامی سے شہرت، سستی سے بیداری، پستی سے بلندی اور محزون و ناتوانی سے قوت و توانائی کی طرف لے گیا۔ ان کی روشنی چاروں گانگ عالم میں ضیاء پاشی کرنے لگی۔ اعلان اسلام کو ابھی ایک صدی نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں نے ایک قدم ہندوستان اور دوسرا سرزمین اندلس میں رکھا اور آخر کار اس مختصر مدت میں اسلام نصف کرۂ ارض پر ضو افشانی کرنے لگا۔“

ڈاکٹر گوستاو لوبون نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

”اس حیرت انگیز مادہ یعنی اسلام سے قبل کہ جس نے عرب قوم کو جہانگیری اور نئے معانی کے اخلاق کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کیا عربستان کا علاقہ نہ تاریخ و تمدن کی جڑ سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی وہاں مسلم یا مذہب کا نام و نشان تھا۔“

ایک ہندو دانشمند اور سیاستدان نہرو اس بارے میں لکھتا ہے:

”عربوں کی سرگزشت اور داستان کو وہ کس تیز رفتاری سے ایشیا، یورپ اور افریقہ پر چھا گئے اور مالی شان و عظیم تمدن اور ثقافت کو انہوں نے جنم دیا، انسانی تاریخ میں ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ نئی توانائی اور جدید فکر کہ جس نے

۱۔ ”عذر تفسیر پیش گاہ محمد و قرآن“ از جان ڈیون پورٹ، فارسی ترجمہ از سید غلام رضا سعیدی، صفحہ ۷۷۔

۲۔ ”نقشہ ہائی استعمار“ از محمد محمود صوف، صفحہ ۳۸۔

۳۔ تاریخ تمدن اسلام و عرب از گوستاو لوبون۔



اُن کو بیدار کیا اور انہیں المینانِ نفس اور قدرت سے نوازا وہ دینِ اسلام تھا۔  
وکتہ علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها

شفا کے لغوی معنی خندق یا کنوئیں کا کنارہ ہے اور شاید پر بھی "شفا" کا — اطلاق اسی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اس لفظ کا استعمال بیماری سے تندرست ہونے کے لیے بھی اسی مناسبت سے ہے کہ انسان سلامتی اور تندرستی کے کنارے پر پہنچتا۔ مندرجہ بالا جملے میں خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تم گذشتہ زمانے میں آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ ہر آن ممکن تھا کہ تم اس میں گر جاؤ اور تمہارا سب کچھ خاکستر ہو جائے لیکن خداوند عالم نے تمہیں نجات بخشی اور ہلاکت کے اُس گڑھے سے امن و امان کے نقطہ کی طرف تمہاری رہنمائی کی جو اخوت و محبت کا نقطہ تھا۔

آیت میں آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے یا اس دنیا کی، اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن پوری آیت پر توجہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑوں سے کناریہ ہے جو ہر لحظہ زمانہ جاہلیت میں کسی نہ کسی بہانہ عربوں میں بھڑک اٹھتی تھی۔ قرآن مجید اس جملے میں زمانہ جاہلیت کے خطرناک حالات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہر لحظہ جنگ اور خوریزی کا خطرہ ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا اور خداوند عالم نے نور اسلام کی برکت سے انہیں اس حالت سے نجات دی۔ یہ مسلم ہے کہ انہوں نے اس خطرناک حالت سے غلامی پاکر جہنم کی جلانے والی آگ سے بھی نجات پالی۔

كذلك يبين الله لكم آياته لعلكم تهتدون

آیت کے آخر میں مزید تاکید کی گئی ہے کہ خدا اسی طرح اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تمہاری ہدایت ہو جائے اس بناء پر آخری مقصد اور غرض تمہاری ہدایت و نجات ہے اور چونکہ یہ تمہارے منافع اور سرفروشت کا معاملہ ہے لہذا جو کچھ کہا گیا اسے زیادہ سے زیادہ اہمیت دو۔

## قوموں کی بقاء کے لیے اتحاد کی اہمیت

ان تمام باتوں کے باوجود کہ جو اتحاد کے اعجاز آمیز اثر کے بارے میں اجتماعی مقاصد اور معاشروں کی بلندی کی طرف پیش رفت کے سلسلے میں کہی گئی ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ ابھی تک اس کا واقعی اثر نہیں پہنچا گیا۔

عصرِ حاضر میں دنیا کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے بند باندھے گئے ہیں جو زیادہ معنی تو انائیوں کی بدولت ہیں اور وہ وسیع و عریض زمینوں کی آبیاری اور روشنی کا سبب بنے ہیں۔ اگر صحیح طور سے غور و فکر کیا جائے تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ اتنی بڑی قدرت صرف نیچر بارش کے قطرات کے ایک دوسرے سے وابستہ ہونے کی قدرت کے نتیجے کے علاوہ اور کچھ نہیں، یہیں سے ہم انسانوں کے اتحاد اور مل کر کوشش کرنے کی اہمیت سے واقف ہو سکتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ اور دیگر بزرگ اسلامی رہنماؤں سے اکثر مادیت میں مختلف عبارات کے ذریعے اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔





چنانچہ ایک مقام پر رسول اللہ فرماتے ہیں:

”المؤمن للمؤمن كالبنیان يشيد بعضه بعضاً“

مؤمنین ایک دوسرے کے لیے ایک عمارت کے اجزاء کی مانند ہیں کہ بن میں ہر ایک جزو دوسرے کی مضبوطی سے ٹکبانی کرتا ہے۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

”المؤمنون كالنفس الواحدة“

مؤمنین ایک نفس وروح کی طرح ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا:

مثل المؤمنین في توادهم وتراحمهم كمثل الجسد الواحد اذا اشتكى بعضه تداعى سائرته بالسهر والحمى۔

صحابان ایمان افراد دوستی اور ایک دوسرے پر رحم کرنے اور نیکی کرنے میں ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں کہ جب ان میں ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی اعضاء و جوارح کو قرار و آرام نہیں آتا۔

۱۰۴ وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○

۱۰۵ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ

وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

ترجمہ

۱۰۴ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو۔ وہ نیکی کا حکم دے بُرائی سے روکے اور بلاشبہ ایسے ہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

۱۰۵ اور دیکھو! ان لوگوں کی سی پال نہ چلنا جو (خدا کے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے کی بجائے) الگ الگ ہو گئے اور باوجود یہ کہ کتاب اللہ کی روشن دلیلیں ان کے سامنے آچکی ہیں۔ باہم دگر اختلافات میں پڑ گئے ہیں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

سہ تفسیر ابوالفتح رازی، جلد ۲، صفحہ ۴۵۔



## تفسیر

## حق کی دعوت اور فساد کا مقابلہ

ولكن منكم امة يدعون الى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون  
 اُمت اصل میں مادہ ۳۰ ام سے ہے جس کا معنی ہے ہر وہ چیز جس کا دوسری چیزیں نہیں ہوں۔ اسی بنا پر اُمت ایسے گروہ کو کہا جاتا ہے جن کے درمیان وحدت کا پہلو ہو۔ اس میں فرق نہیں کہ وحدت زمانی ہو یا مکانی یا مقصد میں وحدت ہو۔ لہذا متفرق اور پرگانہ شمال کو اُمت نہیں کہا جاسکتا۔

گذشتہ آیات انخوت و وحدت کے بارے میں ہیں۔ اب اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو حقیقت میں ایک اجتماعی زور کے مانند ہے اور جو جمعیت کی حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ ہو تو مختلف عوامل جو اجتماعی وحدت کی بقا کے دشمن ہیں دیکھ کی طرح اندر سے معاشرے کی جڑوں کو کھاتے رہتے ہیں اور لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔ اسی لیے وحدت اجتماعی کی حفاظت عوام کی نگرانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

آیت بالا میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو ان دو اجتماعی عظیم ذمہ داریوں کو انجام دے لوگوں کو نیکی کی دعوت دے اور برائیوں سے منع کرے اور آیت کے آخری حصے میں باقاعدہ تصریح ہوئی ہے کہ فلاح و نجات صرف اسی راستے سے ممکن ہے۔

## ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منکم اُمتہ کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ یہ اُمت بعض مسلمانوں میں سے تشکیل پاتی ہے نہ کہ سب کے سب یہ کام کریں۔ تو اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری عمومی پہلو کھو بیٹھے گی۔ بلکہ وہ صرف ایک خاص گروہ کی ذمہ داری ہوگی اگرچہ انتخاب اور جمعیت کو ترتیب دینا تمام لوگوں کا فرض ہے بالفاظ دیگر یہ واجب کفائی ہے نہ کہ واجب عینی۔ حالانکہ قرآن مجید کی دیگر آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ذمہ داریاں عمومی پہلو رکھتی ہیں۔ یعنی واجب عینی میں نہ کہ کفائی، مثلاً بعد میں آنے والی آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

كنتم خيرا امة اخرجت للناس تا مرون بالمعروف وتنهون عن المنكر  
 تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے نفع کے لیے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ تم انہیں اچھی چیزوں کا حکم دیتے ہو اور بُری چیزوں سے روکتے ہو۔

اسی طرح سورہ عصر میں ارشاد ہوتا ہے:

تمام لوگ خسار سے ہیں میں سوائے ان کے جو ایمان رکھنے کے ساتھ صالح عمل کرتے ہیں اور حق و صبر کی وصیت کرتے ہیں۔



ان جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ذمہ داریاں کسی خاص گروہ کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتیں بلکہ یہ عام ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے:

ان جیسی تمام آیات میں غور و خوض کر کے اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ کیونکہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو مرحلے ہیں۔ ایک انفرادی مرحلہ ہے، اس میں ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمہا دوسروں کے اعمال کی نگہداشت کرے اور دوسرے مرحلے اجتماعی ہے اس کے لیے ایک گروہ کا فریضہ ہے کہ وہ معاشرتی خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے متحد ہو کر مشترکہ طور پر کوشش کرے۔

پہلی قسم میں ہر شخص پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس طرح تمام لوگ ذمہ دار ہوں گے اور چونکہ اس میں انفرادی پہلو ہے لہذا اس کی ذمہ داری تو انسانی تک محدود ہے۔ لیکن دوسری قسم واجب کفائی ہے۔ یہ چونکہ ایک گروہ کی ذمہ داری ہے لہذا اس کا دائرہ اثر بھی وسیع ہے اور اس لیے نظری طور پر یہ کام حکومت اسلامی کی ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ دو صورتیں (خرابی اور فساد کا مقابلہ کرنا اور حق کی طرف دعوت دینا) اسلامی قوانین کا شاہکار شمار ہوتی ہیں۔ حکومت اسلامی کے نظام میں تقسیم کار کا معاملہ، اجتماعی حالت اور حکومتی اداروں کی صورت حال ایک نگران گروہ کے وجود کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

گذشتہ ادوار میں اسلامی ممالک میں اس آیت کی روشنی میں برائیوں کو روکنے اور اجتماعی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے ایسے ادارے تشکیل پاتے رہے ہیں۔ آج کل بھی مجاز وغیرہ میں ایسے ادارے موجود ہیں۔ ایسے اداروں کو حسب اور ان کے مامورین کو محتسب یا "آمرین بمعروف" کہتے ہیں۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں میں ہونے والے ہر قسم کے بڑے کام کو روکیں اور حکومتی اداروں میں ہونے والے ہر قسم کے ظلم و فساد کی روک تھام کریں اور اسی طرح لوگوں میں نیک اور پسندیدہ کاموں کا شوق پیدا کریں۔ وسیع اختیارات کے حامل ان اداروں کا وجود محمد و قدرت کے حامل فرد کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرنے سے کوئی تضاد نہیں رکھتا۔

چونکہ یہ بحث قرآن مجید کی اہم مباحث میں سے ہے اور بہت سی آیات میں اس کا تذکرہ ہے لہذا ضروری ہے کہ یہاں اس کے بعض پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

## چند اہم نکات

- (۱) معروف اور منکر؛ معروف کے اصلی حروف مع، ر، ف (عرف) ہیں اور اس کے لغوی معنی ہیں "پہچانے ہوئے" اور منکر کے معنی ہیں "نہ پہچانے ہوئے" یہ لفظ انکار سے ہے۔ گویا اس مناسبت سے نیک کاموں کا پہچانے ہوئے امور اور ناپسندیدہ کاموں کا نہ پہچانے ہوئے کاموں سے تعارف کرایا گیا ہے کیونکہ انسان کی پاک فطرت پہلی قسم سے آشنا و آگاہ ہے اور دوسری قسم سے نا آشنا ہے۔
- (۲) کیا امر بالمعروف ایک عقلی حکم ہے؛ بعض علماء اسلام کا خیال ہے کہ ان دو ذمہ داریوں کا وجود نقلی دلیل سے ثابت ہے اور عقل سے

لے ایسے ادارے عموماً برائے نام شرعی ہیں اور اکثر ان کی حالت حکومت کے عام اداروں سے بھی بدتر ہے (مترجم)





اس کا کوئی سروکار نہیں اور عقل اس بات کا حکم نہیں دیتی کہ انسان کسی دوسرے کو ایسے کام سے روکے جس کا نقصان صرف کرنے والے کو پہنچتا ہو۔ لیکن اجتماعی معاشرتی تعلقات اور اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ کوئی بڑا کام انسانی معاشرے میں کسی خاص نقطہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ آگ کے شعلوں کی طرح پورے عالم کو اپنی پیٹ میں لے لیتا ہے یہ عقل کا فیصلہ ہے کہ ان دو ذمہ داریوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

بالفاظ دیگر سوسائٹی میں کوئی چیز انفرادی ضرر کی حامل نہیں۔ ہر انفرادی ضرر میں یہ امکان ہے کہ وہ اجتماعی نقصان کی صورت اختیار کرے۔ اسی بناء پر عقل و منطق معاشرے کے افراد کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے گرد و پیش کی فضا کو پاک و صاف رکھنے کے لیے ہر قسم کی جستجو اور کوشش کریں۔

اتفاق سے بعض امارت جمعے اس بات کی غمازی کرتی ہیں جیسا کہ رسول اسلام نے ارشاد فرمایا:

ایک گناہگار دوسرے لوگوں کے درمیان اس شخص کی مانند ہے جو ایک کشتی میں کچھ لوگوں کے ساتھ سوار ہو جب وہ کشتی سمندر کے بیچ میں پہنچے تو وہ کھابڑی سے اس جگہ سوراخ کرنے لگے جہاں وہ بیٹھا ہوا ہے اور جب دوسرے لوگ اس کے اس فعل پر اعتراض کریں تو وہ یہ جواب دے کہ میں تو صرف اپنی جگہ پر یہ کام کر رہا ہوں۔ اس وقت اگر دوسرے لوگ اس کو اس خطرناک کام سے نہ روکیں تو چند لمحوں میں سمندر کا پانی کشتی میں داخل ہو جائے گا اور ایک دم سب کے سب غرق ہو جائیں گے۔

پیغمبر اکرم نے اس واضح مثال کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے منطقی ہونے کی تصویر کشی کی ہے اور معاشرے کے لیے ہر فرد کی نگرانی کے حق کو ایک فطری حق قرار دیا ہے۔

(۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت: قرآن مجید کی آیات کے علاوہ بہت سی معتبر امارت اور اسلامی مصادر میں بھی ان دو عظیم اجتماعی وظائف کی اہمیت بیان کی گئی ہے کہ جن میں ان خطرات اور بُرے نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے جو ان دو ذمہ داریوں کے ترک کرنے کی صورت میں جنم لیتے ہیں۔ جیسا کہ امام محمد باقر سے مروی ہے کہ:

ان الامر بالمعروف والنہی عن المنکر فریضة عظيمة بها تقام الفرائض وتأمين للذاهب وتحل المكاسب وترد المظالم وتعمر الارض وينتصف من الاعداء ويستقيم الامر۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عظیم خدائی فریضہ ہے۔ باقی فرائض انہی کی بدولت قائم ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے راستے محفوظ رہتے ہیں، لوگوں کا کسب و کار حلال ہوتا ہے اور لوگوں کے حقوق انہی کی وجہ سے واپس ملتے ہیں اور ان کے سبب زمین آباد رہتی ہے، دشمنوں سے انتقام لیا جاتا ہے اور انہی کے طفیل تمام کام چلتے رہتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ أَمَرَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَى عَنِ الْمُنْكَرِ فَهُوَ خَلِيفَةُ اللَّهِ فِي أَرْضِهِ وَخَلِيفَةُ رَسُولِ اللَّهِ وَخَلِيفَةُ كِتَابِهِ



جو نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے روکے وہ زمین پر خدا، اس کے رسول اور اس کی کتاب کا جانشین ہے۔  
اس حدیث سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ عظیم فریضہ ہر چیز سے پہلے ایک خدائی پروگرام ہے۔ انبیاء کی بعثت اور آسمانی کتب کا نزول سب کے سب اسی پروگرام کا حصہ ہیں۔

ایک شخص پیغمبر کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ منبر پر جلوہ افروز تھے اس نے پوچھا "مَنْ خَيْرُ النَّاسِ" تمام لوگوں میں سے بہتر کون ہے۔ آپ نے فرمایا

أمرهم بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاتَّقَاهُمْ لِتُدَّعَوْا لَهُمْ

جو سب سے زیادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتا ہو اور جو زیادہ پرہیزگار ہو اور جو خوشنودھی خدا کی راہ میں زیادہ قدم بڑھانے والا ہو۔

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو دروز خدا کسی ستم گر اور ظالم کو تم پر مسلط کرے گا۔ جو نہ تمہارے بوڑھوں کا احترام کرے گا اور نہ بچوں پر رحم کرے گا۔ تمہارے نیک اور صالح لوگ دعا کریں گے لیکن مستجاب نہیں ہوگی۔ وہ خدا سے مدد طلب کریں گے لیکن خدا ان کی مدد نہیں کرے گا یہاں تک کہ اگر وہ لوگ توبہ کریں گے تو خدا ان کے گناہ معاف نہیں کرے گا۔

یہ سب کچھ اس گروہ کے اعمال کی عکاسی ہے جو اس عظیم معاشرتی ذمہ داری کو پورا نہیں کریں گے کیونکہ جب عمومی نگرانی کے بغیر معاملات کی باگ ڈور نیک لوگوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو بُرے اور نااہل لوگ معاشرے کے ہر میدان پر قابض ہو جائیں گے مندرجہ بالا حدیث میں ان کی توبہ کی عدم قبولیت کا مطلب یہ ہے کہ برائیوں کے مقابلہ میں مسلسل خاموشی کی وجہ سے دعا کوئی اثر نہیں رکھتی مگر یہ کہ وہ اپنے عمل میں تجدید نظر کریں۔  
حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”وَمَا أَعْمَالُ الْبِرِّ كُلِّهَا وَالْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ عِنْدَ الْأَمْرِ

بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ الْأَكْنَهْشَةُ فِي بَحْرِ لُجِّي“

تمام نیک کام یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں جہاد بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلے میں ایک گہرے سمندر میں تھوکنے اور چھوٹنے کی مانند ہے۔

اس قدر تاکید کا سبب یہی ہے کہ یہ دو عظیم ذمہ داریاں باقی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داریوں کے اجراء کی ضامن ہیں اور ان کی روح شمار

۱۔ جمع ابیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ بیع البلاغ، کلمات تعار، صفحہ ۴۷۔



ہوتی ہیں۔

(۴) کیا امر بالمعروف سلب آزادی کا سلب ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ افراد بشر کے لیے مل جل کر رہنا ان گنت فوائد و برکات کا حامل ہے حتیٰ کہ اس قسم کی خوبیوں نے انسان کو اجتماعی زندگی پر مجبور کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی انسان کو چند امور کا پابند کیا گیا ہے لیکن چونکہ اجتماعی زندگی کے بے شمار فوائد کے مقابلے میں اس قسم کی پابندیاں معمولی ہیں لہذا انسان روز اول سے ان پابندیوں کو قبول کر کے اجتماعی زندگی کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ چونکہ اجتماعی زندگی میں حیاتِ انسانی کا نظام ایک دوسرے سے مربوط ہے اور اصلاحی طور سے معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں لہذا دوسروں کے اعمال پر نظارت و نگرانی کا حق فطری اور اجتماعی زندگی کی خصوصیت کا حق ہے جیسا کہ اس مفہوم کو رسالتِ نبیؐ کی سابقہ ایک حدیث میں مدہ طور سے بیان کیا گیا ہے لہذا اس فریضہ کی انجام دہی سے نہ صرف انفرادی آزادی سلب نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر فرد بشر کا ایک فطری حق ہے جو اسے دوسروں کے مقابلے میں حاصل ہے۔

(۵) کیا امر بالمعروف سے کوئی حرج تو پیدا نہیں ہوتا؟ اس مقام پر ایک اور سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب تمام لوگ اجتماعی امور میں ذیل شریک ہیں اور ایک دوسرے کے اعمال کے نگران و محافظ ہیں تو کیا اس سے معاشرے میں گونا گوں مسائل کھڑے نہ ہو جائیں گے اور کیا یہ چیز ذمہ داریوں کی تقسیم اور معاشرے میں الگ الگ جوابدہی کے برخلاف نہیں ہے؟ اس سوال کے جواب کے متعلق گذشتہ بیان سے بھی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ جو کہ عمومی پہلو رکھتا ہے۔ اس کا دائرہ محدود ہے اور یہ صرف یاد دہانی، پسند و نصیحت، نقد و تنقید اور اس قسم کی چیزوں تک محدود ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ ایک زندہ معاشرے کے تمام افراد برائیوں کے بارے میں اس قسم کی جوابدہی رکھتے ہیں۔

لیکن دوسرا مرحلہ جو ایک خاص گروہ سے متعلق ہے اور وہ حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری شمار ہوتا ہے، اس کا دائرہ بہت وسیع ہے بایں معنی کہ اگر اس میں سختی کی ضرورت پڑے یہاں تک کہ قصاص و حدود تک معاظہ پہنچ جائے تو بھی یہ گروہ حاکم شرعی اور کار پر دازان حکومتِ اسلامی کی نگرانی میں اپنا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ بنا بریں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف مراحل اور ہر ایک کی حدود کو مد نظر رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان سے معاشرے میں حرج و مرج اور فسادات پیدا نہیں ہوتے بلکہ مردہ معاشرے میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔

(۶) امر بالمعروف تلخی اور سختی نہیں؛ بحث کے آخر میں اس نکتہ کی یاد دہانی ضروری ہے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے، فریضہ زندانی کی طرف دعوت دینے اور فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے میں حسن نیت اور پاکیزگی مقصد کو نہیں بھولنا چاہیے اور سوائے ضرورت کے ہر موقع پر صلح و صفائی کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے اور اس فریضہ کی انجام دہی میں خشونت اور سختی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لیکن افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ اس کی انجام دہی میں خشونت آمیز انداز اپناتے ہیں اور بعض اوقات وہ بڑے اور چبھنے والے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کا امر بالمعروف نہ یہ کہ اچھے اثرات نہیں چھوڑتا بلکہ بعض اوقات یہ اثرات دکھاتا ہے۔ حالانکہ پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ ہدیٰؑ کی سیرت طیبہ نشانہ دہی کرتی ہے کہ وہ ان دو فریضوں کی انجام دہی میں اتہائی بخت و پیار اور لطف و کرم سے کام لیتے تھے۔ اسی بنا پر بڑے سخت مزاج افراد بھی بہت جلدان کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتے تھے۔

تفسیر ناریزہ آیت کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ:





”ایک نوجوان خدمت رسول میں حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا کہ اے رسول خدا! کیا اجازت ہے کہ میں زنا کروں یا اس بات پر وہاں کے لوگ برا فروخت ہو گئے اور ادھر ادھر سے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی لیکن آپ نے بڑے تحمل اور نرمی سے فرمایا میرے قریب آؤ! وہ اُن کے قریب آیا اور آنحضرت کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت نے محبت اور پیار کے لہجے میں اس سے پوچھا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تیری ماں کے ساتھ یہ کام کیا جائے۔ اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح دوسرے لوگ بھی اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کی ماں کے ساتھ یہ کام کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تو اپنی بیٹی کے ساتھ اس عمل پر راضی ہے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے ساتھ اس فعل پر راضی نہیں ہیں۔ آپ نے پھر پوچھا کہ اپنی بہن کے ساتھ اس کام کو پسند کرتے ہو۔ نوجوان نے انکار کیا اور اپنے سوال پر مکمل طور پر نادم ہوا۔ بعد ازاں آپ نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اس کے لیے دعا کی اور فرمایا اللہ یا اے اس کے دل کو پاک کر اور اس کے گناہ کو معاف کر اور اس کے دامن کو معصیت کی آلودگی سے صاف رکھ۔ اس واقعہ کے بعد اس نوجوان کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ نفرت کام زنا تھا۔ یہ نبی عن المنکر میں ملائمت اور محبت کا ثمرہ تھا۔

ولا تكونوا كالذين تفرقوا و اختلفوا من بعد ما جاءهم البينات

اس آیت میں از سر نو مسئلہ اتحاد اور تفرقہ بازی سے اکتنا ب کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کو گذشتہ اقوام مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح تفرقہ اور اختلاف کی راہ اختیار کرنے اور اپنے لیے عظیم عذاب مول لینے سے ڈراتی ہے اور درحقیقت انہیں اختلاف و تفرقہ بازی کے بعد کی گذشتہ لوگوں کی تاریخ کے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔

ان آیات میں اتحاد پر اصرار کرنے اور تفرقہ و نفاق سے اکتنا ب کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے معاشرے میں بھی ایسا ہونے والا ہے کیونکہ جہاں کہیں کسی چیز سے ڈرانے میں اصرار کیا جاتا ہے وہ اس کے وقوع کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے پر مشین گوئی کی تھی اور صراحت سے مسلمانوں کو یہ خبر دی تھی کہ یہودی قوم حضرت موسیٰ کے بعد ۱۱ اور عیسائی ۲۲ بہتر فرقوں میں بٹ گئی تھی اور میری امت میرے بعد بہتر ۲۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔

ظاہری طور سے سنہ کا عدد کثرت کی طرف اشارہ ہے اور اصطلاح کے مطابق اس سے صرف کسی چیز کی کثرت بھی جاتی ہے نہ کہ صحیح تعداد یعنی یہودیوں میں ایک فرقہ حق پر تھا اور بہت سے گروہ باطل پرست تھے۔ عیسائیوں کے درمیان باطل پرست فرقوں کی کثرت ہو گئی اور مسلمانوں میں ان سے بھی زیادہ فرقے بن جائیں گے۔

قرآن مجید اور پیغمبر اکرم کی اس مشین گوئی کے مطابق مسلمان آنحضرت کی وفات کے بعد صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے اور مذہبی عقائد بلکہ اصل دین کے معاملے میں پراگندہ ہو گئے یہاں تک کہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے۔ نوبت بایں جا رسید کہ بعض اوقات تلاوتی سب و شتم اور ایک دوسرے پر لعنت سے دریغ نہ کیا گیا۔ معاملہ اتنا سنگین ہوتا گیا کہ بعض مسلمان ایک دوسرے کی جان و مال کو حلال سمجھنے

لے یہ روایت مختلف شیعہ سنی طریقوں سے مروی ہے۔ شیعہ طریقوں سے یہ روایت خصال، معانی، احتجاج، مالی صدوق، اصل سلیم بن قیس اور تفسیر عیاشی میں منقول ہے اور سنی طریقوں سے یہ روایت درمشور، جامع الاصول اور ظل و نعل میں نقل ہوئی ہے۔



گئے اور مسلمانوں کے درمیان اتنی عداوت اور دشمنی پھیل گئی کہ کچھ مسلمان کفار سے جا ملے اور اپنے دینی بھائیوں سے جنگ و جدال کرنے پر تیار ہو گئے۔ یوں اتحاد و وحدت جس میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز مضمر تھا، اختلاف و انتشار میں بدل گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شقاوت و بدبختی میں مبتلا ہو گئے اور اپنی عظمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اولئك لهم عذابٌ عظيمٌ

جو لوگ واضح دلیلوں کے بعد بھی دین میں اختلاف کرتے ہیں، وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ اختلاف و انتشار کا فوری نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں اور ہر قوم کی ذلت و خواری کے راز کو ان کے اختلاف و نفاق میں تلاش کرنا چاہیے۔ وہ معاشرہ جس کی قدرت و توانائی کی بنیاد اس کے ارکان کی تفرقہ بازی کے تیشے سے پاش پاش ہو جائے، ان کی سر زمین ہمیشہ غیروں کی جو لالہ نگاہ بن جاتی ہے اور کسی سامراجی حکومت کے قلمرو میں داخل ہو جاتی ہے۔ واقعا یہ کتنا بڑا عذاب ہے۔ —

باقی رہا آخرت کا عذاب تو جیسا قرآن نے بھی بیان کیا ہے وہ اس عذاب سے کہیں زیادہ سخت ہے اور وہ تفرقہ ڈالنے والوں کے انتظار میں ہے۔ —

۱۰۴۔ یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌُ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌُ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ○

۱۰۵۔ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

ترجمہ

۱۰۴۔ (نفاق ڈالنے والوں پر وہ عظیم عذاب) اس دن ہو گا جب کچھ چہرے سفید اور کچھ سیاہ ہو جائیں گے۔ وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا تم ایمان (اور سایہِ انوح میں آنے) کے بعد کافر ہو گئے تھے تو اب اپنے کئے ہوئے کفر کے عذاب کا مزہ چکسو۔

۱۰۵۔ لیکن وہ جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

نورانی اور تاریک چہرے

یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ

اس تفسیر کے بعد کہ جو گذشتہ آیات میں تفرقہ بازی، نفاق اور کفر و جاہلیت کے زمانے کے آثار کی طرف پلٹ جانے کے بارے میں





کی گئی تھی، ان دو آیات میں ان کے آخری نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح کفر، تفرقہ بازی، نفاق و جاہلیت کی طرف پلٹ جانا روسیاسی کا سبب ہے اور کس طرح اسلام و ایمان اور اتحاد و علوم سفید روئی کا سبب ہیں۔

مندرجہ بالا آیات تصریح کر رہی ہیں کہ روز قیامت کچھ چہرے نورانی ہوں گے اور کچھ تاریک۔ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیوں اختیار کیا اور اسلام کے زیر سایہ اتحاد و اخوت کی راہ اپنانے کے بعد نفاق و جاہلیت کی راہ کیوں اختیار کی۔ ان کے مقابلے میں وہ مومنین جو متحد و متفق رہے ہوں گے دریا ئے رحمت الہی میں ڈوب جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے وہاں راحت و آرام کی زندگی بسر کریں گے۔

کئی دفعہ یہ یاد دہانی کرائی جا چکی ہے کہ دوسرے جہان میں انسان کی زندگی کے حالات و کیفیات اور جزا و سزا اس جہان کے اعمال اور انکار کے مجسمے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس جہان میں جو کام بھی انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ روح کی گہرائیوں میں وسیع اثرات مرتب کرتا ہے۔ لیکن اس دنیا میں اسے نہ سمجھا جاسکے، لیکن قیامت میں یہ حقیقی صورت میں جلوہ گر ہوں گے اور چونکہ وہاں روح کی ماکیت و تجلی زیادہ ہوگی اس لیے اس کے آثار جسم پر بھی مرتب ہوں گے۔ جیسا کہ اس جہان کا ایمان و اتحاد سفید روئی کا سبب ہے اور اس کے برعکس بے ایمان لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اگلے جہان میں یہ مجازی سفیدی اور سیاہی حقیقی شکل اختیار کرے گی اور لوگ روشن یا سیاہ چہروں کے ساتھ مشہور ہوں گے۔

قرآن کی دیگر آیات بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ مثلاً جو لوگ بار بار گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

كَانَ مَا أَعْتَشَيْتَ وَجُوهَهُمْ قَطْمًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا (یونس: ۱۲)

گویا ان کے چہروں کو اندھیری رات کے تاریک ٹکڑوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔

جو لوگ خدا پر جھوٹا فرمانہا باندھتے ہیں ان کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے:

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ (زمر: ۶)

قیامت کے دن تو ان لوگوں کو دیکھے گا جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں ان کے چہرے سیاہ ہیں

اور یہ سب کچھ ان کے کئے ہوئے اعمال کی پاداش ہے۔

۱۰۸۔ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا

لِّلْعَالَمِينَ ○

۱۰۹ وَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِلٰى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْر ○

ترجمہ

۱۰۸ کتاب کی یہ برحق آیات ہیں جنہیں ہم تیرے سامنے پڑھ کر ناتے ہیں اور خدا ہرگز عالمین کے لیے ظلم و ستم کا ارادہ نہیں رکھتا



۱۰۹ اور (کس طرح ممکن ہے کہ خدا ظلم چاہے جبکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اس کی ملکیت میں ہے اور تمام کاموں کی بازگشت اسی کی طرف ہے (اور اس کے حکم سے ہے)۔

تفسیر

تلك آیات الله منتلوها عليك بالحق وما الله يريد ظلما للعالمين .

مندرجہ بالا آیت گذشتہ مطالب اتحاد و اتفاق، ایمان و کفر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ان کے نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ خدا کی برحق آیات ہیں جو ہم تیرے سامنے پڑھتے ہیں اور ان احکامات کی خلاف ورزی کی وجہ سے جو کچھ لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے ان کے اعمال کی پاداش ہے اور خداوند تعالیٰ کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ وہی بُرے اثرات ہیں جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے فراہم کئے ہیں۔

ولله ما فى السموات وما فى الارض والى الله ترجع الامور

یہ آیت خدا کے ظالم نہ ہونے پر دو دلیلیں پیش کرتی ہے:

پہلی یہ کہ وہ خدا جو ان تمام کا خالق و مالک ہے، اس کے بارے میں ظلم کا تصور نہیں ہو سکتا کیونکہ ظلم و زیادتی تو وہ کرتا ہے جس کے پاس وہ چیز نہ ہو جو دوسروں کے پاس موجود ہے۔ لہذا اسے حاصل کرنے کے لیے وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ دوسری دلیل یہ کہ ظلم و ستم کا تصور اس کے بارے میں ہو سکتا ہے جس کی خوشنودی حاصل کئے بغیر کوئی کام وقوع پذیر ہو سکتا ہو لیکن اس ذات کے بارے میں ظلم و ستم چہ معنی کہ جس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام پذیر نہیں ہو سکتا اور تمام امورِ کائنات کا آغاز و انجام اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔

۱۱۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ○

ترجمہ

۱۱۔ تم وہ بہترین قوم تھے جسے لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور خدا پر ایمان لے آؤ اور اگر دیگر اہل کتاب (اس پر وگرام اور واضح آئین پر) ایمان لے آئیں تو ان کے لیے فائدہ ہے لیکن ان میں سے تم توڑے ہی صاحبِ ایمان ہیں ورنہ اکثر فاسق (اور پروردگار کی اطاعت سے خارج) ہیں۔



تفسیر

## فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے اور دعوتِ حق کی یاد دہانی

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف .

اس آیت میں امر بالمعروف نہی عن المنکر اور خدا پر ایمان رکھنے کی دعوت کا اعادہ کیا گیا ہے اور جیسا کہ آیہ ۱۰۱ کے ذیل میں کہا گیا ہے یہ آیت بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک اجتماعی فریضہ کے طور پر بیان کرتی ہے۔ جبکہ گذشتہ آیت نے اس کے ایک خاص مرحلہ کو بیان کیا تھا جو خصوصی اور واجب کفائی ہے اور اس کی تفصیلی تشریح بیان کی جا چکی ہے۔

تو جو طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین اُمت کہا گیا ہے جسے انسانی معاشرہ کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی معاشرے کی اصلاح ایمان، دعوتِ حق اور فتنہ و فساد کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہیں۔

ضمنی طور پر اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دو عظیم فرائض دین اسلام میں جو دعوت رکھتے ہیں وہ گذشتہ ادیان میں نہ تھی اور اس اُمت کا بہترین ہونا واضح ہے کیونکہ یہ آخری آسمانی دین کی حامل ہے اور آخری دین تکامل کی اساس پر کامل ترین دین ہے۔ مندرجہ بالا دو آیات میں مزید دو نکتوں کی طرف بھی توجہ کیا گیا ہے:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ ”کنتم“ (تم تھے) فعل ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے یعنی تم گذشتہ زمانے میں بہترین اُمت تھے اس لفظ کے بارے میں اگرچہ مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں، لیکن اکثریت کا نظریہ یہ ہے کہ فعل ماضی کی تعبیر تاکید کے لیے ہے اور قرآن مجید میں اس قسم کی تعبیرات کثرت سے موجود ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس مقام پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایمان خدا پر مقدم کیا گیا ہے جس سے ان دو عظیم خدائی فرائض کی اہمیت و عظمت مترشح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان دو عظیم فرائض کی انجام دہی دائرہ ایمان پھیلانے اور تمام انفرادی و اجتماعی قوانین کے اجراء کی ضمانت ہے اور عملی طور پر اجراء قانون کا ضامن خود قانون پر مقدم ہوتا ہے۔ تمام باتوں کو چھوڑ کر اگر ان دو فرائض کو انجام نہ دیا جائے تو دلوں میں ایمان کی جڑیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں اور اس کے ستون بھی گر جاتے ہیں۔ یہی سبب سے انہیں ایمان پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اس بیان سے اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ مسلمان اس وقت تک ایک ممتاز اُمت شمار ہوتے رہیں گے جب تک نبی کی دعوت دینے اور فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے کو فراموش نہیں کریں گے اور جب انہوں نے اس سے صرف نظر کر لیا تو یہ بہترین اُمت رہیں گے اور نہ انسانی معاشرے کے لیے فائدہ مند۔

اس بات کی طرف بھی توجہ ہونا چاہیے کہ اس آیت میں تمام مسلمانوں سے خطاب کیا جا رہا ہے جیسا کہ قرآن میں کئی مقامات پر یہی انداز و روش ہے۔ کچھ لوگوں نے اس سے مبالغہ یا سابق مسلمان مراد لیے ہیں لیکن اس پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

ولو امن اهل الكتاب لكان خيرا لهم منهم المؤمنون و اكثرهم الفاسقون





بعد ازاں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ مذہب جو اس طرح روشن ہے اور وہ تو ان میں جو اس قدر با عظمت ہیں ان کے فائدے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بنا برآں اگر اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ان باتوں پر ایمان لے آئیں تو ان کا اپنا ہی فائدہ ہے، لیکن بہت افسوس کا مقام ہے کہ ان کی اقلیت نے با ہلارتہ تعصب پر ٹھوکر مار کر کھلے دل سے اسلام قبول کیا ہے جب کہ ان کی اکثریت فرمان خداوندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے پیغمبر اکرم کے متعلق اپنی کتب میں موجود بشارتوں کی بھی پرواہ نہیں کی اور وہ اپنے کفر و تعصب پر اسی طرح ڈٹے رہے۔

۱۱۱۔ لَنْ يَصْرَوْكُمْ اِلَّا اَذْحٰقًا وَاِنْ يِقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمْ اَلْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَنْصُرُوْنَ ۝  
 ۱۱۲۔ ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذَّلٰلَةَ اِنَّ مَا تَقْفُوْا اِلَّا يَحْبِلُ مِنَ اللّٰهِ وَجَلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءٌ وَّوَبَغَضِبَ مِنَ اللّٰهِ وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةَ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِآيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۱ اور وہ (اہل کتاب خصوصاً یہودی) تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی آزار و اذیت کے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر (بھاگ) جائیں گے۔ اس کے بعد کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔  
 ۱۱۲ وہ جہاں کہیں ہوں گے ان پر ذلت و رسوائی کی مہر لگی ہوئی ہے مگر یہ کہ وہ خدا سے رابطہ قائم کریں (اور اپنی ناپسندیدہ روش پر تجدید نظر کریں) یا لوگوں سے وابستگی کے ذریعے (ادھر ادھر سے مدد حاصل کر لیں)۔  
 اور وہ خدا کے غضب میں گھرے ہوئے ہیں اور بیچارگی کی مہر ان پر ثبت ہو چکی ہے۔ کیونکہ وہ آیات خداوندی کا انکار کرتے تھے اور خدا کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ سب کچھ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہے اور وہ (دوسروں کے حقوق پر) تجاوز کرتے ہیں۔

شان نزول

جب بعض روشن ضمیر سردارانِ یہود مثلاً عبد اللہ بن سلام اپنے رفقاء کے ہمراہ دین اسلام میں داخل ہو گئے تو یہودیوں کے بعض سرداران کے پاس آئے اور انہیں سزائش و ملامت کی یہاں تک کہ انہیں دھمکی دی اور کہا کہ تم اپنے آباؤ اجداد کا بین چھوڑ کر اسلام کیوں لے آئے ہو۔ اس پر مندرجہ بالا آیات انہیں اور باقی مسلمانوں کو شرم و سنانے کے لیے نازل ہوئیں۔



تفسیر

لن یضروکم الا اذی وان یقاتلوکم یولوکم الادبار ثم لا ینصرون

بعض مسلمان اپنی سابقہ کافر قوم کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا تھے وہ انہیں قبولِ اسلام پر سزائش و ملامت کرتے تھے اور بعض اوقات انہیں دھمکیاں دیتے تھے یہ آیت انہیں بشارت دیتی ہے کہ منافقین تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور بہت کم ضرر پہنچا سکتے ہیں اور بدکلامی سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتے۔

ان دونوں آیات میں درحقیقت مسلمانوں کے لیے چند پیشین گوئیاں اور خوشخبریاں ہیں جو تمام کی تمام حضور کے دور میں ظاہر ہوئیں:

- ۱ اہل کتاب کبھی مسلمانوں کو کوئی قابلِ امتنا ضرر نہیں پہنچا سکیں گے اور ان کے معمولی نقصانات دیر پا نہیں ہوں گے (لن یضروکم الا اذی)۔

- ۲ جب وہ مسلمانوں کے ساتھ میدانِ کارزار میں نبرد آزما ہوں گے تو انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا اور آخری فتح و کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوگی اور یہودیوں کی حمایت کے لیے کوئی بھی نہیں کھڑا ہوگا (وان یقاتلوکم یولوکم الادبار ثم لا ینصرون)۔

- ۳ یہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوں گے اور ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں گے مگر یہ کہ اپنے پروگرام کو تبدیل کریں اور خدا کی راہ پر چلیں یا دوسرے لوگوں سے مل جائیں اور وقتی طور پر ان کی طاقت سے فائدہ اٹھائیں (ضربت علیہم الذلۃ این ما اتقفوا)۔

بہت جلد یہ تینوں وعدے نبی اکرم کے زمانے میں پورے ہو گئے خصوصاً جازکے یہودی (بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع، بنی مصطلق اور خیبر کے یہودی) کئی مرتبہ مسلمانوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں آنے سامنے ہوئے اور بالآخر سب شکست سے دوچار ہو کر روپوش ہو گئے

ضربت علیہم الذلۃ اینما اتقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس۔

ثقفوا کا مادہ ثقف (بروزن، تعف) ہے۔ اور ثقافت کے لغوی معنی کسی چیز کو مہارت کے ساتھ پالنے کے ہیں اور جس چیز کو انسان بارکینینی اور مہارت کے ساتھ حاصل کرے اسے ثقافت کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے اس جملے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جہاں کہیں ہوں ذلت کی مہر ان کی پیشانی پر ثبت ہو چکی ہے۔

اگرچہ ان آیات میں یہودیوں کا نام لے کر ان کو نہیں پکارا گیا، تاہم سورۃ بقرہ کی آیت ۴۱ اور ان آیات کے قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بھی یہودیوں کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد اس جملے کے ذیل میں کہا گیا ہے کہ صرف دو صورتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اس ذلت کی مہر کو مٹا سکتے ہیں پہلی صورت خدا کی طرف بازگشت اور اس سے رشتہ جوڑنا ہے اور اس کے سچے دین پر ایمان لانا ہے (الابحبل من اللہ) یا لوگوں سے وابستگی اور ان کا سہارا لینا ہے (وحبل من الناس)۔

اگرچہ ان دو تعبیرات (حبل من اللہ وحبل من الناس) کے بارے میں مفسرین نے کئی احتمالات ذکر کئے ہیں لیکن جو کچھ کہا گیا



ہے وہ آیت کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ جس وقت ”حبیل من اللہ“ (فدا سے ارتباط) ”حبیل من الناس“ (لوگوں سے ارتباط) کے مقابلے میں ہو تو اس سے دو مختلف معانی مراد ہوں گے زیر کر ان میں سے ایک ایمان لانے کے معنی میں ہے اور دوسرا مسلمانوں کی طرف سے امن و امان ہونے کے معنی میں۔

بنابراین آیت کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہوگا کہ یا تو وہ اپنی زندگی کے پروگرام پر تجدید نظر کریں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں اور اپنے انکار سے شیطنت و کینہ پروری کو مٹادیں اور یا لوگوں سے وابستگی پیدا کر کے اپنی نفاق آلود زندگی کو جاری رکھیں۔

وَبَاؤُا بَغْضِبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ .

”باؤ لغت میں رجوع کرنے اور سکونت کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ غلام و درزیوں کی بنا پر خدا کی سزا کی مستحق ہو گئی ہے اور وہ غضبِ خداوندی کو اپنی منزل مقصود قرار دے چکی ہے۔

”مسکنت“ کے معنی میں ”بیچارگی“ بالخصوص ایسی سنت بیچارگی جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو اور یہ ”سکونت“ کے مادہ سے ہے۔ کیونکہ مسکین افراد کمزوری اور احتیاج کی وجہ سے اپنی جگہ سے حرکت کی قدرت نہیں رکھتے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ مسکین کا معنی صرف مال و دولت کی وجہ سے محتاج نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی کمزوری و ناتوانی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ مسکنت و ذلت میں یہ فرق ہے کہ ”ذلت“ دوسروں کی طرف سے وارد ہوتی ہے جبکہ ”مسکنت“ کسی شخص کی ذاتی اور اندرونی کم مائیگی و کم بینی کا معنی دیتی ہے۔

اس لحاظ سے اس جملے کا معنی یہ ہے کہ یہودی اول تو اپنی کارستانیوں کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے دھتکارے گئے ہیں اور غضبِ خدا میں گرفتار ہوئے ہیں پھر آہستہ آہستہ یہ ان کے لیے ایک ذاتی صفت بن گیا ہے حتیٰ کہ وہ تمام امکانات کے باوجود احساسِ حقارت میں مبتلا ہیں۔ ان لیے اس جملے میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بَغْيٍ وَّحَقِّ .

آیت کے آخری حصے میں یہودیوں کی بدبختی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اگر وہ ایسی بدبختی میں گرفتار ہیں تو اس کی وجہ نسلی و فاندانی ہے نہ کہ دوسری خصوصیات بلکہ یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اول تو یہ خدا کی آیات کا انکار کرتے تھے اور ثانیاً یہ کہ پیشوا یا ان نفاق اور نجات دہندگان بشر کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف نوعیت کے گناہوں، ظلم و ستم کرنا، دوسروں کے حقوق پر قبضہ کرنا اور باقی لوگوں کے منافع پر تجاوز کرنا میں مبتلا تھے اور ستم ہے کہ جو قوم اس قسم کے اعمال کا ارتکاب کرے گی، اس کی حالت بھی ان سے مشابہ ہوگی۔

## یہودیوں کی عبرت ناک داستان

یہودیوں کی تاریخ گذشتہ آیات کے مطالب و مفاہیم کی مکمل تائید کرتی ہے اور ان کی موجودہ حالت بھی اس کی بشارت دیتی ہے۔ ان آیات میں ضحبت علیہم الذلۃ (ان پر مہر ذلت لگ چکی ہے) تشریحی حکم نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین اس کے قائل ہیں بلکہ یہ تکوینی ہے اور تاریخ کا اہل فیصلہ ہے کہ جو قوم گناہوں میں ڈوبی ہوئی ہو اور جن کا پروگرام دوسروں کے حقوق پر ہاتھ ڈالنا اور بشریت کے رہنماؤں کو قتل کرنے پر مشتمل ہو ان کا انجام کار یہی ہوگا مگر یہ کہ وہ اپنی طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کریں اور اس راستے سے پلٹ آئیں اور یا دوسرے لوگوں



سے رابطہ قائم کر کے چند روزہ زندگی گذار لیں۔ جو واقعات اس دور میں اسلامی ممالک میں رونما ہو رہے ہیں یعنی مسلمانوں کے مقابلے میں مہریت کا ایک خاص مقام حاصل کرنا، انہیں دوسروں کی ماییت حاصل ہونا اور بہت سے دیگر عوامل جن کی وجہ سے انہیں مقام حاصل ہے یہ سب امور اس حقیقت کے شاہد ہیں جو ان آیات سے معلوم ہوتی ہے۔

شاید گذشتہ تلخ تجربات اور ان حوادث سے جنہوں نے ان کی تاریخ کی راہ کو بدل دیا ہے یہ باعث نہیں کروہ اپنے پروگرام میں تبدیلی نظر کریں اور وہ دیگر اقوام کے ساتھ صلح و اشتی کے ساتھ پیش آئیں اور دوسروں کے حقوق کا احترام کر کے ان کے ساتھ صلح آمیز زندگی گذاریں۔

۱۱۳۔ لیسوا سِوَاءَ مَنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ أَنْتَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ○

۱۱۴۔ يَوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ○

۱۱۵۔ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلَيْهِم بِالْمُتَّقِينَ ○

ترجمہ

۱۱۳ وہ سب برابر نہیں ہیں۔ اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو (حق و ایمان کے ساتھ) قائم ہے اور وہ اوقات شب میں مسلسل حالت سجدہ میں آیات خدا کی تلاوت کرتے ہیں۔

۱۱۴ وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیک کاموں کی انجام دہی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں اور وہ نیک لوگوں میں سے ہیں۔

۱۱۵ جو نیک اعمال وہ سر انجام دیتے ہیں انہیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جائے گا اور وہ اچھی جزا پائیں گے، اور خدا پر مہیزگاروں کو جاتا ہے۔

شان نزول

کہا جاتا ہے کہ جب عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھا۔ کچھ لوگوں کے ہمراہ مسلمان ہو تو یہودیوں کے سرداروں کو بہت رنج پہنچا اور وہ اس بات کے درپے ہو گئے کہ انہیں شرارت کا الزام دیں تاکہ یہ لوگوں کی نگاہ میں گرجائیں تاکہ ان کا عمل دوسروں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید نہ بنے لہذا علماء یہود نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم سے صرف شریر لوگ مسلمان ہوئے ہیں اگر وہ صحیح لوگ ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کا دین نہ چھوڑتے اور ملت یہود کے ساتھ خیانت نہ کرتے۔ خداوند عالم نے ان آیات کو نازل کر کے ان کا دفاع کیا ہے۔



تفسیر

”ليسوا سواء من اهل الكتاب امة قائمة يتلون آيات الله اناء الليل“

گذشتہ آیات میں یہودیوں کے بڑے افراد کی شدید مذمت کے بعد قرآن کریم اس آیت میں عدالت کے پیش نظر اور ان کے اچھے افراد کے حقوق کے احترام کی وجہ سے اور یہ حقیقت بتانے کے لیے، کہ ان سب کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا، کہتا ہے کہ اہل کتاب تمام کے تمام ایک جیسے نہیں بلکہ تباہ کار افراد کے مقابلے میں ایسے نیک طینت افراد بھی موجود ہیں جو خدا کی اطاعت اور ایمان پر ثابت قدم ہیں وہ ہمیشہ نیم شب کو آیاتِ خدا کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور عظمت پروردگار کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہیں اور خدا اور وزیرِ جبرائیل پر ایمان رکھتے ہیں، امر بالمعروف و نہی من المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ صالح اور با ایمان افراد ہیں۔

اسی طرح بھائے اس کے کہ خدا یہودی نسل کی کئی طور پر مذمت کرے اور ان کی مخالفت کرے یا ان کے خون کو بُرا کہے، صرف ان کے بڑے اعمال کی نشاندہی کرتا ہے اور ان افراد کی تعظیم و تکریم کرتا ہے اور اچھائی سے یاد کرتا ہے جنہوں نے فاسد اکثریت سے جدا ہو کر حق و ایمان کے سامنے تسلیمِ غم کیا ہے اور یہی اسلام کی روش ہے کہ کبھی رنگ یا نسل و قبیلہ کو مد نظر نہیں رکھتا بلکہ وہ صرف لوگوں کے خفاہ اور ان کے اعمال کو نظر میں رکھتا ہے۔

ضمناً چند ایک روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیات صرف عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھیوں کے لیے منحصر نہیں بلکہ ان کے علاوہ نجران کے چالیس عیسائی، ہمشہ کے بائیس افراد اور آٹھ رومی بھی اس آیت کے مصداق ہیں اور اہل کتاب کی وسیع تعبیر اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

”وما يفعلوا من خير فلن يكفروه“

یہ آیت دراصل پہلی آیات کی تکمیل کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے اس گروہ کے نیک اعمال کی بہترین جزا ہوگی یعنی گذشتہ عمر میں اگر چٹھیلوں کے مرتکب رہے ہوں، جب انہوں نے اپنی روش بدلی اور پرہیزگاروں کی صف میں شامل ہو گئے تو یہ اپنے نیک اعمال کا ثمرہ دیکھ لیں گے اور خدا کی طرف سے ہرگز ناقدری نہیں پائیں گے۔

”والله عليم بالمتقين“

باوجودیکہ خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے، اس جملے میں خصوصیت سے کہتا ہے کہ خداوند عالم پرہیزگاروں سے آگاہ ہے اور یہ تعبیر پرہیزگار لوگوں کی اقلیت کی نمازی کرتی ہے۔ خصوصاً پیغمبر کے زمانے کے یہودیوں میں سے تو یہ راستہ اختیار کرنے والے بہت ہی اقلیت میں تھے اور یہ نظری بات ہے کہ اس قسم کے کم تعداد افراد نظر میں نہیں رہتے لیکن پروردگار عالم کے وسیع علم کی تیز نگاہ سے یہ لوگ ہرگز مخفی نہیں رہیں گے اور خدا ان سے آگاہ ہے۔ ان کے نیک اعمال کم ہوں یا زیادہ ہرگز رائیگاں نہیں ہوں گے۔

سے ”آنا“، دراصل ”آنا“، ”بروزن“ ”دنا“ کی جمع ہے اور ”آنا“، ”بروزن“ ”فنا“ کا معنی ہے اوقات۔



۱۱۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا  
 وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

۱۱۵۔ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صُرٰٓصِبٰتٌ  
 حَرَّتْ قَوْمًا ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتُهُمْ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ  
 اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۴ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ہرگز اپنے اموال اور اولاد کے ذریعے اللہ کے عذاب و سزا سے نہیں بچ سکتے۔ وہ اہل جہنم ہیں اور ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے۔

۱۱۵ جو کچھ وہ اس دنیاوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں وہ جلانے والی گرم ہوا کی مانند ہے جو اس قوم کی زراعت پر چل پڑے جس نے اپنے اور پر ظلم کیا (اور نامناسب وقت پر زراعت کی) پس وہ اسے نیست و نابود کر دے۔ خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اور پر ظلم کیا ہے۔

تفسیر

”ان الذین کفروا لن تغنی عنهم اموالهم ولا اولادهم من الله شیئا“

گذشتہ آیت میں جن حق بخور با ایمان افراد کی تائش کی گئی ہے۔ ان کے مقابلے میں بے ایمان اور شکر لوگ ہیں ان کی حالت ان دو آیات میں بیان کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے، وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہرگز اپنے مال و دولت اور اولاد کی کثرت کے گھنڈے میں خدا کی سزا سے چھٹکارہ نہیں پاسکتے کیونکہ روز جزا صرف نیک عمل، صدق ایمان اور خلوص نیت ہی انسان کے کام آئے گا نہ کہ اس جہاں کے مادی امتیازات۔

”یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتى اللہ بقلب سلیم“

اس دن مال و اولاد ذرہ برابر فائدہ نہیں دیں گے مگر یہ کہ وہ پاک و صاف دل سے کہ بارگاہ الہی میں حاضر ہو۔

(الشعراء آیہ ۸۸-۸۹)

مادی وسائل میں سے صرف دولت اور اولاد کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے ہوا ہے کہ اہم ترین مادی سرمایہ ایک تو افرادی قوت ہے جس



کی طرف اولاد سے اشارہ کیا گیا ہے اور دوسرا اقتصادی سرمایہ ہے اور دیگر مادی وسائل کا سرچشمہ یہی دونوں چیزیں ہیں۔  
قرآن واضح طور پر اعلان کر رہا ہے کہ صرف مال و متاع اور افرادی قوت کے بل بوتے پر خدا کے ہاں امتیاز حاصل نہیں کیا جاسکتا اور  
انہی پر بھروسہ کرنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے مگر یہ کہ انہیں ایمان اور خلوص نیت کے ساتھ صحیح راستوں میں خرچ کیا جائے، ورنہ  
بصورت دیگر ان کے مالکوں کا انجام کار دہائی عذاب ہے (اولئک اصحاب النار ہم فیہا خالدون)۔

”مثل ما ینفقون فی ہذہ الحیوۃ الدنیا کمثل دبیح فیہا صر۔۔۔۔۔۔“

صر اور صرا ایک ہی اصل سے ہیں اور ان کے معنی شدت کے ساتھ جڑواں چیز کو باندھنے کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد ہوا کی  
شدت و سختی ہے چاہے وہ ہوا جلانے والی ہو یا ٹھنڈی اور خشک کرنے والی۔

اس آیت میں ان کی ریاکارانہ سخاوت اور خرچ کرنے کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور ایک بہترین مثال کے ذریعے ان کے  
انجام کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

قرآن کریم کفار کے خرچ کرنے کو سخت قسم کی جلانے والی یا بہت سرد اور خشک کر دینے والی ہوا سے تشبیہ دیتا ہے جو کسی زراعت  
پر پھل پڑے اور اسے خشک کر دے۔ البتہ ہوا کی نظرت و طبیعت جلادینے والی نہیں ہے چنانچہ نسیم بہار ٹنگوٹوں پر نوازش کرتی ہے۔ غنچوں  
کے دہن کھول دیتی ہے اور درختوں کے سانچوں میں روح چھونک کر انہیں بار آور کر دیتی ہے۔ اسی طرح انفاق اور خرچ کرنے کا سرچشمہ بھی  
ایمان و خلوص ہو تو اسی طرح ثمر آور ہے۔ وہ اجتماعی مشکلات کو بھی حل کر دیتا ہے اور احسان کرنے والے کے دل میں ایک دیرپا اثر بھی چھوڑ  
جاتا ہے اور اس کے قلب میں اچھی صفات اور فضائل کے سرسپھے پھوٹ پڑتے ہیں۔ لیکن اگر یہ حیات آفرین باونسیم طوفان بن جائے  
یا بہت زیادہ ٹھنڈی ہوا میں تبدیل ہو جائے تو وہ جس پھول اور سبزہ پر پلے گی اسے تباہ کر دے گی۔

بے ایمان اور گناہ آلود افراد کا چونکہ انفاق میں صحیح مقصد نہیں ہوتا اس لیے خود نمائی اور ریاکاری کی روح کو جلانے والی خشک ہوا  
ان کے انفاق کی زراعت پر پھل پڑتی ہے اور اسے ناکارہ بنا دیتی ہے۔ اس قسم کے اخراجات نہ اجتماعی مشکلات کا سدباب کر سکتے ہیں  
(چونکہ زیادہ تر یہ بے جا صرف ہوتے ہیں) اور نہ خرچ کرنے والے کے لیے کوئی اخلاقی ثمرہ دیتے ہیں۔ توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ارشاد ہوا ہے:  
حروث قوم ظلموا یعنی اس جلانے اور خشک کرنے والی ہوا کا نشانہ ایسے لوگوں کی زراعت ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یہ اس بات کی  
طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ زراعت کے لیے وقت اور جگہ کے انتخاب میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور انہوں نے ایسی زمینیں تیار کر لی  
کی ہے کہ جو طوفانی ہواؤں کی زد میں تھی اور ایسا وقت چننا ہے جو گرم ہوا کے چلنے کا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنے اوپر خود ظلم کیا ہے۔ یوں  
ہی بے ایمان افراد انفاق کرتے وقت اور جگہ کے انتخاب میں اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور اپنا سرمایہ نامناسب مقام پر برباد کرتے ہیں لگژری  
تفصیل اور آیت کے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تشبیہ درحقیقت دو علیحدہ علیحدہ چیزوں کے درمیان ہے ایک تو ان کے انفاق کو بے موقع و  
بے محل زراعت سے تشبیہ دی گئی ہے اور دوسری خرچ کرنے کی وجہ اور علت کو ٹھنڈی اور جلانے والی ہوا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بنا بریں آیت میں کچھ تقدیر ضرور ہے اور مثل ما ینفقون کے معنی یہ ہیں کہ ان کے انفاق کے اسباب و علل کی مثال خشک ہوا  
اور جلانے والی ہوا کی طرح ہے (خبر کیسے لگا)۔



بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت ان اموال کی طرف اشارہ کرتی ہے جو دشمنانِ اسلام دین کو تباہ و برباد کرنے کے لیے صرف کرتے تھے اور اس کے ذریعے وہ منافقینِ اسلام کو رسولِ اسلام کے خلاف اکٹاتے تھے یا وہ اموال مراد ہیں جو یہودی اپنے علماء کو کتبِ آسمانی میں تحریر کرنے کے عوض دیتے تھے لیکن واضح ہے کہ آیت کے مفہوم میں عمومیت ہے اور یہ ان لوگوں کے علاوہ اس قسم کے باقی افراد کے لیے بھی ہے۔

”وما ظلمہم اللہ ولكن انفسہم یظلمون“

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ خدا نے اس سلسلے میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اور پر ظلم کیا ہے اور وہ اپنا سرمایہ خود برباد کرتے ہیں کیونکہ فاسد اور بُرے کام کا نتیجہ فاسد اثر کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

۱۱۸۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةَ مَنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُوَامًا عَنَيْتُمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ** ○

۱۱۹۔ **هَآأَنْتُمْ أَوْلَاءُ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَ الْقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ** ○

۱۲۰۔ **إِنْ تَمَسَّسَكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ تَصَبَرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضْرِكْكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ** ○

ترجمہ

۱۱۸۔ اے ایمان والو! اپنوں کے علاوہ کسی کو رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں کوتاہی نہیں کریں گے وہ تمہاری تکلیف اور رنج پر خوش ہوتے ہیں ان کے دل کی دشمنی اور عداوت ان کے منہ سے نکل پڑتی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی شدید تر ہے۔ ہم نے آیات (اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر) تمہارے لیے واضح کر دی ہیں بشرطیکہ تم عقل و خرد سے کام لو۔

۱۱۹۔ تم عجیب لوگ ہو کر انہیں دوست رکھتے ہو لیکن وہ تمہیں دوست نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہو لیکن



وہ تمہاری آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے) اور جس وقت وہ تم سے ملے ہیں تو (جھوٹ موٹ) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ و غضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ ان سے) کہہ دو کہ تم اپنے غصہ میں عمل مرو خدا سینوں میں چھپے ہوئے (اسرار) سے آگاہ ہے۔

۱۲۰ اگر تمہیں کوئی راحت ملتی ہے تو انہیں بڑا لگتا ہے اور اگر تمہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آجائے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں لیکن تم اگر ان کے مقابلے میں ثابت قدمی اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو ان کی (خائن) سازشیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ خدا اس چیز پر اعطاء رکھتا ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

### شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیات اُس وقت نازل ہوئیں جب کچھ مسلمان یہودیوں سے قربت داری و ہمسائیگی رشتہ رفاقت یا قبل اسلام کے عہد و پیمان کی وجہ سے دوستی رکھتے تھے اور ان کے ساتھ اس خلوص و محبت سے پیش آتے تھے یہاں تک مسلمانوں کے بعید آن پر ظاہر کر دیتے تھے۔ اس طریقے سے یہودی مسلمانوں کے رازوں سے آگاہ ہو جاتے تھے حالانکہ وہ اندرونی طور پر مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اگرچہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو ان کے دوست ظاہر کرتے تھے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ چونکہ وہ لوگ تمہارے دین میں نہیں آئے اس لیے انہیں اپنا راز دار نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہارے بارے میں کسی برائی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو۔

### تفسیر

#### اغیار کو رازداں نہ بناؤ

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ۔۔۔۔۔“

”بطانت“ کے لغوی معنی ہیں پنہلا لباس اور اس کے مقابلے میں ”ظہارہ“ (اوپر کا لباس) ہے یہاں یہ رازداں سے کنایہ ہے اور ”خیال“ اصل میں کسی چیز کے نیست و نابود ہونے کے معنی میں ہے اور زیادہ تر ان نقصانات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو عقل انسانی پر اثر انداز ہوں۔

گذشتہ آیات میں مسلمانوں اور کفار کا تقابل کیا گیا۔ اس آیت میں ایک حساس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور ایک حسین و لطیف تشبیہ کے ذریعے تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنے ہم مسلک افراد کے علاوہ کسی کو اپنا دوست اور ہمراز نہ بناؤ اور اغیار کو اپنے اندرونی راز نہ بتاؤ یعنی کفار تمہاری دوستی کے لائق نہیں اور نہ ہی انہیں تمہارا دوست اور ہمراز ہونا چاہیے کیونکہ وہ مسلمانوں کو گزند پہنچانے میں





کو تاہی نہیں کرتے (لایا مونکہ خبالا)۔ سابقہ دوستی ہرگز ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی کہ وہ مذہب و ملک کی بنا پر تمہاری تکلیف و نقصان کا نہ سوچیں بلکہ ان کی ہمیشہ خواہش یہ ہے کہ تم غم و اندوہ میں مبتلا رہو (وذا ما اعنتم)۔ وہ عموماً اپنی رفتار و گفتار میں امتیاط برتتے ہیں اور سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں تاکہ تم پر ان کے راز فاش نہ ہوں اور نہ ان کی منفی باتوں کا تمہیں علم ہو۔ لیکن اس کے باوجود دشمنی و عداوت کے آثار ان کی باتوں سے ٹپکتے ہیں اور کبھی کبھار آشوری طور پر کچھ باتیں ان کی زبان پر آ جاتی ہیں جو ان کے دلوں میں آگ کی چنگاریوں کی مانند ہیں اور ان کی وجہ سے ان کے باطن کو سمجھا جاسکتا ہے (قد بدت البغضاء من احوالہم)۔

آیت وہ حقیقت بیان کر رہی ہے جس کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبے میں اشارہ فرمایا ہے کہ:

”ما اضمرا حدیثیا الا ظہر فی صفحات وجہہ او فلتات لسانہ“

کوئی شخص اپنے باطن میں کسی راز کو نہیں چھپا سکتا مگر یہ کہ وہ اس کے چہرے کے رنگ اور اکھڑی اکھڑی، توجہ سے خالی ہلکے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس سے خداوند عالم نے دشمنوں کے باطن کو پہچاننے کے طریقہ کی نشاندہی کی ہے اور ان کی اندرونی باتوں کے متعلق فرمایا ہے کہ جو کچھ عداوت اور دشمنی وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے کئی درجے زیادہ ہے جس کا وہ زبان سے اظہار کرتے ہیں (وما تخفی صدورہم)۔

اس کے بعد مزید کہا گیا کہ ہم نے یہ آیات اس لیے بیان کیں کہ ان میں تدبیر کرنے سے تم دوست، دشمن کو باسانی سمجھ سکو گے اور دشمنوں کے شر سے خلاصی حاصل کرو گے (اقتد بینا لکم الایات ان کنتم تعقلون)۔

ہا انتم اولاء تحبونہم ولا یحبونکم وتومنون بالکتاب کلہ۔۔۔۔

اے گروہ سلیم! تم ان سے قرابت، ہمسائیگی یا کسی اور سبب سے دوستی کا رشتہ قائم کرتے ہو مگر اس سے غافل ہو کر وہ تمہیں ہرگز دوست نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم اللہ کی طرف سے نازل کردہ تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہو (چاہے وہ تمہاری کتاب ہو یا ان کی آسمانی کتب) لیکن وہ تمہاری آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

”واذ القوکم قالوا امتنا واذ اخلوا عنوا علیکم الانامل من الغیظ“

اہل کتاب کا یہ گروہ دو غلاپن کرتا ہے جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ہم تمہارے دین کی تصدیق کرتے ہیں لیکن جب علیحدگی میں ہوتے ہیں تو کینہ و عداوت اور غصے سے اپنی انگلیوں کی پوریں کاٹتے ہیں (قل موتوا بعیظکم)۔ کہہ دو! اپنے غصے میں بل مرو اور یہ غیظ و غضب مرتے دم تک تم سے جدا نہیں ہوگا۔

ان اللہ علیہ بذات الصدور“

تم ان کی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو لیکن خدا ان کی خبر رکھتا ہے کیونکہ وہ دلوں میں چھپے ہوئے بھیجیوں سے واقف ہے۔

ان تمسکم حسنة تسوہم وان تصبکم سیئة یفرحوا بہا۔۔۔۔

اس آیت میں ان کے بغض و کینہ کی ایک علامت بیان کی گئی ہے کہ اگر تمہیں فتح و کامیابی نصیب ہو تو وہ ناخوش ہوتے ہیں اور تمہیں



کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو وہ سرور ہوتے ہیں۔

”و ان تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً ان اللہ بما یعملون محیط“

لیکن اگر تم ان کی کینہ پروریوں کے مقابلے میں صبر سے کام لو اور خود دار و پرہیزگار ہو جاؤ تو وہ اپنی خائن سازشوں کے ذریعے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس پر خدا مکمل کنٹرول رکھتا ہے۔ بنا برائیں آیت کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے دشمنوں کی بڑی سازشوں سے بچنے کے لیے استقامت، ہوشیاری اور تقویٰ شرط ہے اور اسی صورت میں ان سے مامون رہنے کی ضمانت دی گئی ہے۔

### مسلمانوں کے لیے تنبیہ

خداوند عالم اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو اپنا عزیز نہ سمجھیں اور مسلمانوں کی راز کی باتیں ان کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ یہ خطرے کی نشاندہی عمومی شکل میں ہے، ہر زمانے اور ہر حالت میں مسلمانوں کو اس تنبیہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے لیکن تہافت ہے کہ قرآن کے بہت سے ماننے والے اس تنبیہ سے غفلت برتتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت سی مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ عصر حاضر میں بھی مسلمانوں کے گرد و پیش ایسے خفیہ دشمن ہیں جو اپنے آپ کو ان کا دوست ظاہر کرتے ہیں اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی حمایت کا دم بھرتے ہیں لیکن ان کی کارستانیاں ان کا جھوٹ ظاہر کرتی ہیں۔ مسلمان ان کے ظاہر سے دھوکا کھا کر ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ مسلمانوں کے لیے پریشانی اور روسیاء ہی کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے اور ان کی راہ میں کانٹے بچھا کر ان کی مشکلات میں اضافہ کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں گذشتہ چند سالوں میں مسلمان دو بڑی جنگوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ پہلی جنگ میں انہیں دردناک شکست کا سامنا کرنا پڑا جب کہ دوسری جنگ میں وہ واضح کامیابی و کامرانی سے جھک رہے تھے اور دشمنوں کا دخت ناک عیب اور ناقابل شکست ہونے کا افسانہ صحرائے سینا اور جولان کی پہاڑیوں کے معرکے میں پہلے دن دفن ہو گیا اور مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کامیابی کا ذائقہ چکھا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا کہ اس مختصر سی مدت میں حالات دگرگوں ہو گئے۔

اس سوال کے لیے ایک طویل و مفید جواب کی ضرورت ہے لیکن اس شکست و کامیابی کا ایک مؤثر عامل یہ تھا کہ پہلی جنگ میں افیاز بن میں سے بعض ظاہر دوستی کا دم بھرتے تھے مسلمانوں کے جنگی منصوبوں سے آگاہ تھے لیکن دوسری جنگ میں سوائے دو تین اسلامی سربراہوں کے کوئی ان کے منصوبوں سے واقف نہیں تھا اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا اور یہ اس حکیم قرآنی کی غفلت کی تین دلیل تھی۔

۱۲۱۔ وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ نُبِئَ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

۱۲۲۔ إِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ○



ترجمہ

۱۲۱ اور (یاد کرو) وہ وقت جب تم صبح کے وقت اپنے گھروالوں سے مومنین کے لیے لشکر جنگ انتخاب کرنے باہر نکلے۔ خدا سننے اور جاننے والا ہے (جنگ کے بارے میں جو بات چیت کی گئی اور جو انکار بعضوں کے دماغ میں پرورش پا رہے ہیں خدا انہیں جانتا ہے)۔

۱۲۲ اور (یاد کرو) وہ وقت جب تم میں سے دو گروہوں نے سستی کا مظاہر کرنے کا مصمم ارادہ کیا (اور چاہا کہ وہ راستے سے پلٹ جائیں) اور خدا ان کا مددگار تھا (کہ وہ اس فکر سے باز آجائیں) اور اہل ایمان کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر

”و اذ غدوت من اہلک تبویئ المؤمنین مقاعد للقتال و اللہ سمیع علیم“

یہاں سے ایک اہم اور وسیع اسلامی واقعہ یعنی جنگ احد کے بارے میں آیات شروع ہوئی ہیں۔ گذشتہ آیات کے قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات جنگ احد کے بعد نازل ہوئیں اور اس وحشتناک جنگ کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بہت سے مفسرین کا بھی یہی نظر یہ ہے۔

سب سے پہلے یہ پیغمبر کے مدینہ سے کوہ احد کے دامن میں لشکر گاہ کے انتخاب کے لیے باہر آنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبر یاد کرو! اس دن کو کہ صبح کے وقت تم اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر مدینہ سے باہر آئے تاکہ دشمن سے جنگ کرنے کے لیے مومنین کے لیے کوئی لشکر گاہ تیار کر سکو۔ اس روز مسلمانوں کے درمیان پیغمبر کی اس کی طرف ہم واقعہ احد کی تفصیل میں اشارہ کریں گے۔ مقام جنگ کے انتخاب کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف تھا کہ آیا مدینہ میں ہو یا باہر اور راستہ نے اکثریت کے نظریہ کو قبول کر لیا اور لشکر گاہ شہر سے باہر کوہ احد کے دامن میں منقل کر دی۔ فطری طور پر ان میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے کچھ باتیں دل میں پھپھار کھی تھیں اور کئی وجوہات کی بنا پر انہیں ظاہر کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے ”و اللہ سمیع علیم“ کا جملہ گویا ان سب کی حالت کی غمازی کرتا ہے کہ خدا تمہاری باتوں کو بھی سنتا ہے اور تمہارے منہ سے بھی جانتا ہے۔

”اذھقت طائفتان منکم ان تغشدا...“

اس جملے کا روئے سخن اس ماجرے کے ایک اور پہلو کی طرف ہے اور وہ یہ کہ اس وقت مسلمانوں کے دو گروہ (تاریخ کے مطابق قبیلہ اوس میں سے بنو سلمہ اور خزرج میں سے بنو عاصبہ) نے پنپتہ ارادہ کر لیا کہ وہ جنگ سے پہلو تہی کرتے ہوئے ایک راستے سے مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ مدینہ کے اندر جنگ کرنے کے حق میں تھے لیکن پیغمبر اکرم نے اس بات کو قبول نہ کیا علاوہ ازیں یہاں کہ واقعہ کی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا کہ عبداللہ بن سلول تین سو یہودیوں کے ہمراہ لشکر اسلام میں آیا تھا اور اس صورتحال کی وجہ سے وہ لوگ بھی مدینہ کی طرف واپس آگئے۔ اس بات نے دو مسلمان گروہوں کے ٹوٹ جانے کے پنپتہ ارادوں کو متزلزل اور کمزور کر دیا لیکن یہاں کہ آیت کے





ذیل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں گروہ اپنے ارادے سے پلٹ آئے اور دیگر مسلمانوں سے آئے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ واللہ ولہما وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون یعنی خدا ان دو گروہوں کا مددگار و معاون ہے اور اہل ایمان کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔  
 ضمنی طور پر اس بات کی طرف بھی متوجہ رہنا چاہیے کہ واقعہ احد کا ذکر ان آیات کے بعد جو کفار پر اعتماد نہ کرنے کے بارے میں تھیں۔  
 اس زندہ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے بھی گذر چکا ہے اور بعد میں بھی تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ پیغمبر اکرم نے ان یہودیوں کو اجازت نہ دی جو بظاہر مسلمانوں کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور وہ اسلامی لشکر گاہ میں ٹھہرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ پھر بھی بریکار تھے اور ان نازک حالات میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ ہونا مناسب نہ تھا۔

## جنگِ احد

### اسباب جنگ

اس مقام پر ضروری ہے کہ پہلے جنگِ احد کے مجموعی واقعات کا تذکرہ کیا جائے۔ روایات اور اسلامی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب کفار مکہ جنگِ بدر میں شکست خوردہ ہوئے اور ستر مقتول ستر قیدی چھوڑ کر مکہ کی طرف پلٹ گئے تو ابوسفیان نے لوگوں کو خبردار کیا کہ وہ اپنی عورتوں کو مقتولین بدر پر گریہ و زاری نہ کرنے دیں کیونکہ آنسو نم و اندوہ کو دور کر دیتے ہیں اور اس طرح محمد کی دشمنی اور عداوت ان کے دلوں سے زائل ہو جائے گی۔ ابوسفیان نے خود یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب تک جنگ بدر کے قاتلوں سے انتقام نہ لے لے اس وقت تک وہ اپنی بیویاں سے ہمبستری نہیں کرے گا۔ بہر حال قریش ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے تھے اور انتقام کی صدا شہر مکہ میں بلند ہو رہی تھی۔

ہجرت کے تیسرے سال قریش تین ہزار سوار اور دو ہزار پیدل فوج کے ساتھ بہت سا سامانِ جنگ لے کر آپ سے جنگ کرنے کے لیے مکہ سے نکلے اور میدانِ جنگ میں ثابت قدمی سے لڑنے کے لیے اپنے بڑے بڑے بٹ اور اپنی عورتیں بھی ہمراہ لے آئے۔

### جناب عباس کی بروقت اطلاع

حضرت رسول خدا کے چچا حضرت عباس جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور قریش کے درمیان ان کے ہم مشرب و ہم مذہب تھے۔ لیکن اپنے بھتیجے سے فطری محبت کی بنا پر جب انہوں نے دیکھا کہ قریش کا ایک طاقتور لشکر پیغمبر سے جنگ کرنے کے لیے مکہ سے نکلا ہے تو فوراً ایک خط لکھا اور قبیلہ بنی غفار کے ایک آدمی کے ہاتھ میں پہنچایا اور حتی الامکان اس واقعہ کو پردہ راز میں رکھنے کی کوشش کی گئی پیغمبر نے مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ جس دن عباس کا قاصد آپ کو موصول ہوا آپ نے چند مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مکہ و مدینہ کے راستے پر جائیں اور لشکر کفار کے کوائف معلوم کریں۔ آپ کے دو نمائندے ان کے حالات معلوم کر کے بہت جلدی واپس آئے اور قریش کی قوت و طاقت سے آنحضرت کو مطلع کیا اور یہ بھی اطلاع دی کہ یہ طاقتور لشکر خود ابوسفیان کی کمان میں ہے۔

اسی ظاہر مسلمان نہیں ہوئے تھے (مترجم)



پیغمبر اکرمؐ نے چند روز کے بعد تمام اصحاب اور اہل مدینہ کو بلایا اور ان درمیش حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے میٹنگ کی۔ اس میں جبکہ کے خط کو بھی پیش کیا گیا اور اس کے بعد مقام جنگ کے بارے میں رائے لی گئی۔ اس میٹنگ میں ایک گروہ نے رائے دی کہ جنگ دشمن سے مدینہ کی تنگ گھبوں میں کی جائے کیونکہ اس صورت میں کمزور مرد، عورتیں بلکہ کینزیں بھی مددگار ثابت ہو سکیں گی۔ عبداللہ بن ابی نے تائیداً کہا یا رسول اللہ! آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ہم اپنے قلعوں اور گھروں میں ہوں اور دشمن ہم پر کامیاب ہو گیا ہو۔ اس رائے کو آپؐ بھی اس وقت کی مدینہ کی پوزیشن کے مطابق نظر استمان دیکھتے تھے۔ کیونکہ آپؐ بھی مدینہ ہی میں ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن نوجوانوں اور جنگجوؤں کا ایک گروپ اس کا مخالف تھا۔ چنانچہ سعد بن معاذ اور قبیلہ اوس کے چند افراد نے کھڑے ہو کر کہا اسے رسولؐ خدا! گذشتہ زمانے میں عربوں میں سے کسی کو یہ جرات نہ تھی کہ ہماری طرف نظر کرے جبکہ ہم مشرک اور بت پرست تھے، اب جبکہ ہمارے درمیان آپؐ کی ذات ستودہ صفات موجود ہے۔ کس طرح وہ ہمیں دبا سکتے ہیں اس لیے شہر سے باہر جنگ کرنی چاہیے۔ اگر ہم میں سے کوئی مارا گیا تو وہ جام شہادت نوش کرے گا اور اگر کوئی بچ گیا تو اسے جہاد کا اعزاز و افتخار نصیب ہوگا۔ اس قسم کی باتوں اور جوش شجاعت نے مدینہ سے باہر جنگ کے حامیوں کی تعداد کو بڑھا دیا یہاں تک کہ عبداللہ بن ابی کی پیشکش سرد خانے میں جا پڑی۔ خود پیغمبرؐ نے بھی اس مشورے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے طرفداروں کی رائے کو قبول فرمایا اور ایک صحابی کے ساتھ مقام جنگ کا انتخاب کرنے کے لیے شہر سے باہر تشریف لے گئے آپؐ نے کوہ احد کا دامن شکر گاہ کے لیے منتخب کیا کیونکہ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام زیادہ مناسب تھا۔

## مسلمانوں کی دفاعی تیاریاں

جمعہ کے دن آپؐ نے یہ مشورہ لیا اور نماز جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے آپؐ نے حمد و ثناء کے بعد مسلمانوں کو لشکر قریش کی آمد کی اطلاع دی اور فرمایا کہ تہ دل سے جنگ کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور پورے ہندبے سے دشمن سے لڑو تو خداوند تقدوس تمہیں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرے گا اور اسی دن آپؐ ایک ہزار افراد کے ساتھ شکر گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؐ خود لشکر کی کمان کر رہے تھے۔ مدینہ سے نکلنے سے قبل آپؐ نے حکم دیا کہ لشکر کے تین علم بناٹے جائیں جن میں ایک مہاجرین اور دو انصار کے ہوں۔ پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ اور احد کے درمیانی فاصلے کو پانچ پادہ طے کیا اور سارے راستے لشکر کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ خود لشکر کی صفوں کو منظم و مرتب رکھا تا کہ وہ ایک ہی یدھی صف میں مارچ کریں۔

ان میں سے کچھ ایسے افراد کو دیکھا جو پہلی دفعہ آپؐ کو نظر پڑے۔ پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ عبداللہ بن ابی کے ساتھی کچھ یہودی ہیں اور اس مناسبت سے مسلمانوں کی مدد کے لیے آئے ہیں آپؐ نے فرمایا کہ مشرکین سے جنگ کرنے میں مشرکین سے مدد نہیں لی جا سکتی مگر یہ کہ یہ اسلام قبول کر لیں۔ یہودیوں نے اس شرط کو قبول نہ کیا اور سب مدینہ کی طرف پلٹ آئے۔ یوں ایک ہزار میں سے تین سو افراد کم ہو گئے۔

لیکن مفسرین نے لکھا ہے کہ چونکہ عبداللہ بن ابی کی رائے کو رد کیا گیا تھا اس لیے وہ اثنائے راہ میں تین سو سے زیادہ افراد کو لے



مدینہ کی طرف پلٹ آیا۔ بہر صورت پیغمبر اکرمؐ لشکر کی ضروری چھان چٹک (یہودیوں یا ابن ابی کے ساتھیوں کو نکلانے) کے بعد سات سو افراد کو ہمراہ لے کر کوہ احد کے دامن میں پہنچ گئے اور نماز فجر کے بعد مسلمانوں کی صفوں کو آراستہ کیا۔ عبداللہ بن جبیر کو پاس ماہر تیر اندازوں کے ساتھ پہاڑ کے درہ پر تعینات کیا اور انہیں تاکید کی کہ وہ کسی صورت میں اپنی جگہ نہ چھوڑیں اور فوج کے پھلے حصے کی حفاظت کریں اور اس حد تک تاکید کی کہ اگر ہم دشمن کا مکہ تک چھپا کریں یا ہم شکست کھا جائیں اور دشمن ہمیں مدینہ تک جانے پر مجبور کر دے پھر بھی تم اپنا مورچہ نہ چھوڑنا۔ دوسری طرف سے ابوسفیان نے خالد بن ولید کو منتخب سپاہیوں کے ساتھ اس درہ کی نگرانی پر مقرر کیا اور انہیں ہر حالت میں وہیں رہنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب اسلامی لشکر اس درہ سے ہٹ جائے تو فوراً لشکر اسلام پر چھپے سے حملہ کر دو۔

## آغاز جنگ

دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف بستہ ہو کر جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے اور یہ دونوں لشکر اپنے نوجوانوں کو ایک خاص انداز سے برانگیختہ کرتے تھے۔ ابوسفیان کعبہ کے بتوں کے نام لے کر اور خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے جنگی نوجوانوں کی توجہ مبذول کر کے ان کو ذوق و شوق دلاتا تھا جب کہ پیغمبر اسلامؐ خدا کے اسم مبارک اور انعامات اعلیٰ کے حوالے سے مسلمانوں کو جنگ کی ترغیب دیتے تھے۔ اچانک مسلمانوں کی صفوں میں اللہ اکبر سے میدان اور دامن کوہ کی فضا گونج اٹھی جب کہ میدان کی دوسری طرف قریش کی لڑکیوں نے دف اور سارنگی پر اشعار گا گا کر قریش کے جنگجو افراد کے احساسات کو ابھارا۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی مسلمانوں نے ایک شدید حملے سے لشکر قریش کے پرنسپل اڑا دیئے اور وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور لشکر اسلام نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ خالد بن ولید نے جب قریش کی یقینی شکست دیکھی تو اس نے چاہا کہ درہ کے راستے نکل کر مسلمانوں پر چھپے سے حملہ کیا جائے لیکن تیر اندازوں نے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ قریش کے قدم اکھڑتے دیکھ کر تازہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے دشمن کو شکست خوردہ سمجھ کر مالِ غنیمت جمع کرنے کے لیے اچانک اپنی پوزیشن چھوڑ دی۔ ان کی دیکھا دیکھی درے پر تعینات تیر اندازوں نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا۔ ان کے کمانڈر عبداللہ بن جبیر نے انہیں آپ کا حکم یاد دلایا مگر سوائے چند (تقریباً دس افراد) کے کوئی اس اہم جگہ پر نہ ٹھہرا۔

حکم پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالد بن ولید نے درہ خالی دیکھ کر بڑی تیزی سے عبداللہ بن جبیر پر حملہ کیا اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے چھپے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اچانک مسلمانوں نے ہر طرف چمکی تلواریں کی تیز دھاوا لگائی اور اپنے سروں پر دیکھا تو حواس باختہ ہو گئے اور اپنے آپ کو منظم نہ رکھ سکے۔ قریش کے جھگڑوں نے جب یہ صورتحال دیکھی تو وہ بھی پلٹ آئے اور مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اسی موقع پر لشکر اسلام کے بہادر افسر سید الشہداء حضرت حمزہؓ نے دوسروں مسلمانوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ سوائے چند شیع رسالت کے پر دانوں کے باقی مسلمانوں نے دشت زدہ ہو کر میدان کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ اس خطرناک جنگ میں جس نے سب سے زیادہ فداکاری کا مظاہرہ کیا اور پیغمبر اکرمؐ پر ہونے والے دشمن کے ہر حملے کا دفاع کیا وہ حضرت علی بن ابی طالبؓ علیہ السلام تھے۔ حضرت علیؓ بڑی جرات اور بے جگری سے جنگ کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ کی تلوار ٹوٹ گئی اور پیغمبر اکرمؐ نے اپنی تلوار آپ کو عنایت فرمائی جو ذوالفقار کے نام سے مشہور ہے۔ بالآخر آپ ایک مورچہ میں ٹھہر گئے اور حضرت علیؓ مسلسل آپ کا دفاع کرتے رہے یہاں تک کہ بعض مورخین کی تحقیق کے مطابق حضرت علیؓ کے جسم کو ساٹھ زخم آئے اور اسی موقع پر قاصد وحی نے پیغمبر سے





عرض کیا: اے محمد! یہ ہے مواسات و معاونت کا حق۔ تو آپ نے فرمایا (ایسا کیوں نہ ہو کہ) علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ تو جبرئیل نے اضافہ کیا: میں تم دونوں سے ہوں۔ امام صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ پیغمبر نے قاصد وحی کو آسمان میں یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ لاسیف الاذوالفقار ولا فتحی الا علیؑ (ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علیؑ کے سوا کوئی جو انفر د نہیں)۔ اس انشاد میں یہ آواز بلند ہوئی کہ محمد قتل ہو گئے۔

### کون پکارا کہ محمد قتل ہو گئے ہیں

بعض سیرت نگار رقمطراز ہیں کہ ابن قعد نے اسلامی سپاہی مصعب کو پیغمبر سمجھ کر اس پر کاری ضرب لگائی اور با آواز بلند کہا: لات وعزى کی قسم محمد قتل ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ افواہ چاہے مسلمانوں نے اڑائی یا دشمن نے لیکن مسلمانوں کے لیے نفع رسان ثابت ہوئی اس لیے کہ جب آواز بلند ہوئی تو دشمن میدان چھوڑ کر مکہ کی طرف چل پڑے ورنہ قریش کا فاتح لشکر ہو حضورؐ کے لیے دلوں میں کینہ رکھتا تھا اور انتقام لینے کی نیت سے آیا تھا کبھی میدان نہ چھوڑتا۔ قریش کے پانچ ہزار افراد پر مشتمل لشکر نے میدان جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد ایک رات بھی صبح تک وہاں نہ گذاری اور اسی وقت مکہ کی طرف چل پڑے۔

پیغمبرؐ کی شہادت کی خبر نے بعض مسلمانوں میں زیادہ اضطراب و پریشانی پیدا کر دی۔ جو مسلمان اب تک میدان کارزار میں موجود تھے، انہوں نے اس خیال سے کہ دوسرے مسلمان پر اگندہ نہ ہوں، آنحضرتؐ کو پہاڑ کے اوپر لے گئے تاکہ مسلمانوں کو پتہ چل جائے کہ آپؐ بقیر حیات ہیں۔ یہ دیکھ کر جھگوڑے واپس آ گئے اور آنحضرتؐ کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے۔ آپؐ نے ان کو ملامت و سزائش کی کہ تم نے ان خطرناک حالات میں کیوں فرار کیا؟ مسلمان شرمندہ تھے انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا: اے رسول خدا! ہم نے آپؐ کی شہادت کی خبر سنی تو خوف کی شدت سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یوں مسلمانوں کو جنگ اُحد میں بہت زیادہ جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہو گئے لیکن مسلمانوں کو اس شکست سے بہت بڑا درس ملا جو بعد کی جنگوں میں ان کی کامیابی و کامرانی کا باعث بنا، آئندہ آیات میں انشاء اللہ اس کا ذکر آجائے گا۔

۱۲۳۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○

۱۲۴۔ اِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ اَلَنْ يَكْفِيَكُمْ اَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ اَلْفٍ

مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنَزَّلِينَ ○

۱۲۵۔ بَلَىٰ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوا وَيَاْتُوكُم مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمِدُّكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ

اَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ○



۱۳۳ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝

۱۳۴ لَيَقْطَعَنَّ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتُهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ ۝

ترجمہ

۱۳۳ خدا نے بدر میں تمہاری مدد کی (اور تم خطرناک دشمنوں پر فتیاب ہوئے) جب کہ تم اُن کی نسبت ناتواں تھے پس خدا سے ڈرو (اور دشمن کے مقابلے میں حکم پیغمبر کی نافرمانی نہ کرو) تاکہ تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرنے والوں میں شمار ہو۔

۱۳۴ جس وقت تم مومنین سے کہتے تھے کہ کیا یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار ملائکہ (آسمان سے) اتار کر تمہاری مدد کرے۔

۱۳۵ ہاں! (آج بھی) اگر تم صبر و استقامت اور پرہیزگاری اختیار کرو اور جب دشمن تم پر چڑھ آئے گا تو خدا پانچ ہزار مضموم نشان رکھنے والے فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا۔

۱۳۶ لیکن یہ سب کچھ تو صرف تمہیں بشارت دینے کے لیے اور تمہارے اطمینان کی خاطر ہے ورنہ کامیابی تو فقط خدائے توانا و حکیم کی طرف سے ہے۔

۱۳۷ (یہ وعدہ جو خدا نے تمہارے ساتھ کیا ہے) اس لیے ہے تاکہ شکر کفار کے ایک حصہ کو قطع کر دے یا انہیں ذلت کے ساتھ پٹائے تاکہ وہ مایوس ہو کر (اپنے ملائے کو) پلٹ جائیں۔

تفسیر

جنگ کا خطرناک مرحلہ

جنگ اُحد کے انتقام پر مشرکین کا فتیاب لشکر بڑی تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف پلٹ گیا لیکن راستے میں انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ انہوں نے اپنی کامیابی کو ناقص کیوں چھوڑ دیا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مدینہ کی طرف پلٹ جائیں اور اسے غارت و تاراج کر دیں اور اگر محمدؐ زندہ ہوں تو انہیں قتل کر دیں تاکہ ہمیشہ کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی فکر ختم ہو جائے۔ اسی بنا پر انہیں واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا اور درحقیقت جنگ اُحد کا یہ خطرناک مرحلہ تھا کیونکہ کافی مسلمان شہید اور زخمی ہو چکے تھے اور فطری طور پر وہ از سر نو جنگ کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے جبکہ اس کے برعکس اس مرتبہ دشمن مضبوط جذبہ کے ساتھ جنگ کر سکتا تھا اور اس کا تہی تیغ ماحصل کر سکتا تھا۔ اس بات کی اطلاع جلد ہی آپؐ تک پہنچ گئی۔



اگر اس موقع پر آپ غیر معمولی جرات اور بے مثال ہمت کا مظاہرہ نہ کرتے تو تاریخ اسلام ہمیں پر ختم ہو جاتی۔ یہ آیات اس نازک مرحلے پر نازل ہوئیں اور ان سے مسلمانوں کے جذبے کو تقویت پہنچی۔ اس کے فوراً بعد آپ کی طرف سے مشرکین کی طرف جانے کا ایک عمومی حکم ہوا۔ یہاں تک کہ جنگ کے زخمی (جن میں حضرت طلحہ بھی تھے جنہیں ساتھ سے زیادہ زخم آئے تھے) ابھی دشمن سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور مدینے سے چل پڑے۔ یہ خبر سردارانِ قریش تک پہنچی اور وہ مسلمانوں کے اس عجیب و غریب جذبے سے وحشت زدہ ہوئے اور سوچنے لگے کہ شاید تازہ دم فرج مدینے سے مسلمانوں کے ساتھ آئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ نئی جنگ کا نتیجہ ان کے لیے نقصان کا باعث ہو۔ لہذا انہوں نے اپنی سابقہ کامیابی پر اکتفا کرنے اور مکہ کی طرف پلٹ جانے میں ہی بہتری بھی اور وہ تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف چل پڑے۔

”وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ“

جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ آیات مسلمانوں کے جذبے کو تقویت دینے کے لیے نازل ہوئیں اور ان میں پہلے مسلمانوں کی میدانِ بدر کی کامیابی کی طرف اشارہ کیا گیا تاکہ اس کے ذکر سے ان کے دلوں میں آئندہ کے لیے جوش و جذبہ بڑھ جائے۔ ارشاد ہوا کہ خدائے تمہیں بدر میں کامیابی سے سرفراز فرمایا جب کہ تم دشمن کی نسبت کمزور تھے تو تعداد اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے تمہارا اور دشمن کا کوئی تقابل ہی نہ تھا (تمہاری تعداد ۳۱۳ اور بہت کم ساز و سامان تھا جب کہ مشرکین کے پاس بہت زیادہ ساز و سامان تھا اور ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی) ان حالات میں تم خدا سے ڈرو اور اپنے پیشوا (پیغمبر اکرم) کی حکم دہلی کو نہ ڈہراؤ تاکہ اس طرح سے اس کی گونا گوں نعمات کا شکر،

بِالْأُذُنِ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ۔

”اذ تقول للمؤمنين ان يكفيكم الله ان يمدكم ربكم بثلاثة الاف من الملائكة.....“

بعد ازاں میدانِ بدر میں فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد کرنے کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اس دن کو فراموش نہ کرو جب پیغمبر نے تم سے کہا تھا کہ کیا تمہاری مدد کے لیے تین ہزار فرشتے کافی نہیں ہیں۔

بلى ان تصبروا وتتقوا وياتوكم من فورهم هذا يمددكم ربكم بخمسة آلاف.....

ہاں! اگر آج بھی پائنداری اور استقامت کا مظاہرہ کرو، قریش کے مقابلے میں نکلو، تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو اور گذشتہ کی طرح فرمانِ رسول کی مخالفت نہ کرو تو اس صورتحال میں اگر مشرکین تیزی کے ساتھ تمہاری طرف پلٹ آئیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں کی شکل میں فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

وما جعله الله الا بشري لكم ولتطمئن قلوبكم به وما النصر

۱۔ ”بدر“ ایک شخص کا نام تھا۔ وہ مکہ و مدینہ کے درمیانی علاقے میں رہتا تھا۔ اس کا ایک کواں تھا۔ اسی کے نام سے اس علاقے کا نام بھی ”بدر“ ہو گیا۔ لغوی ماخذ سے ”بدر“ ”پر“ اور ”کامل“ کو کہتے ہیں، اسی لیے چودھویں کے چاند کو بھی بدر کہتے ہیں۔

۲۔ ”فورہ“ کا اصل معنی ہے دیگ وغیرہ کا جوش اور ابال۔ اسی مناسبت سے تیزی سے انجام پذیر ہونے والے کاموں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنی جیسے دیگ میں ابال سے کھانے والی چیز تیزی سے اوپر نیچے آتی ہے یہ کام بھی اسی طرح انجام پذیر ہوا ہے۔





الامن عند الله۔۔۔۔۔

لیکن یہ بات یاد رہے کہ تہاری مدد کے لیے ملائکہ کی آمد تو صرف تہاری تشویق، اطمینان قلب اور تقویت جذبہ کے لیے ہے۔ ورنہ کامیابی تو صرف خدا کی طرف سے ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام کاموں میں اس کی حکمت کار فرما ہے۔ وہ کامیابی کے راستے بھی جانتا ہے اور اسے جاری کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

”لیقطع طرفا من الذین کفروا او یکبتھم فینقلبوا خائبین“

اگرچہ مفسرین حضرات اس آیت کی تفسیر میں اختلافات کے شکار ہیں لیکن اگر سابقہ آیات کی طرح خود آیات اور موجودہ تاریخ سے مدد لی جائے تو اس آیت کی تفسیر بھی واضح ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ یہ جو دشمن سے نئی جنگ کرنے کی صورت میں فرشتوں کے ذریعہ تہاری مدد کا وعدہ کیا گیا ہے یہ اس بنا پر ہے کہ شکر مشرکین کے حصّہ کو قطع کر دے اور انہیں ذلت کے ساتھ پٹا دے۔ آیت میں ”طرف“ کا معنی ٹکڑا ہے اور ”یکبتھم“ کبت سے ہے جس کے معنی کسی کو زبردستی اور ذلیل کر کے واپس کرنے کے ہیں۔

اس مقام پر فرشتوں کا مسلمانوں کی مدد کرنا، اس کی کیفیت اور اس کی ضرورت کے سلسلہ میں چند سوالات ہو سکتے ہیں جن کا جواب شرح و بسط کے ساتھ سورہ انفال آیت ۱۲ تا ۱۴ کے ذیل میں پیش کیا جائے گا۔

۱۲۸۔ لیس لك من الامر شیء او یتوب علیہم او یعد بہم فاتھم مظالمون ○

۱۲۸ کسی قسم کا اختیار اقرار اور جنگ سے فرار کرنے والے مسلمانوں کے فیصلے کے بارے میں تمہیں نہیں ہے مگر یہ کہ خدا چاہے کہ انہیں درگزر کر دے یا سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔

تفسیر

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اور اس کے واقعات سے متعلق ہے۔ سابقہ آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ البتہ آیت کی تفسیر میں دو باتیں تو جو مطلب ہیں پہلی یہ کہ آیت مستقل ایک جملہ ہے لہذا ”او یتوب“ کا معنی ”الا ان یتوب علیہم“ ہے۔

اس آیت کا مطلب یوں بنتا ہے کہ ان کے انجام کار کے بارے میں تم کچھ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا انہیں بخش دے یا اس ظلم کی وجہ سے انہیں سزا دے اور لفظ ”انہیں“ سے مراد کفار ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ حتیٰ کہ انہوں نے پیغمبر اکرم کے دندان مبارک کو شہید کیا اور جنیں مبارک کو زخمی کر دیا یا وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے میدان کارزار سے فرار کیا ہے اور جنگ کے اختتام پر نادم و پشیمان ہوئے اور آپ سے معافی طلب کی۔ آیت بتلا رہی ہے کہ ان کی عفو و بخشش یا سزا و عذاب خدا کے ہاتھ میں ہے اور پیغمبر اکرم حکم خدا کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیتے۔

دوسری تفسیر اس طرح کی گئی ہے ”لیس لك من الامر شیء“ جملہ مقررہ ہے (جس کا پہلے اور بعد والے جملوں سے



ربط نہ ہو اور جملہ "اوتیوبنا علیہم" کا عطف "اویکتہم" پر ہے۔ اس صورت میں دونوں آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا کا میاں بی کے اسباب تمہارے قبضہ میں دے دیگا اور کفار کے لیے چار قسم کا انجام مقرر کرے گا یا شکر مشرکین کے ایک حصہ کو نیست و نابود کرے گا یا انہیں کسی ذریعہ سے واپس جانے پر مجبور کر دے گا یا انہیں شائستگی اور توبہ کی صورت میں بخش دے گا اور یا انہیں ظلم کی وجہ سے سزا دے گا۔ خلاصہ یہ کہ ان کے ہر گروہ کے ساتھ عدالت و حکمت کا برتاؤ دروار کئے گا اور تم ان کے بارے میں اپنی طرف سے کسی قسم کا اقدام نہیں کر سکتے۔

اس آیت کی شانِ نزول روایات میں مختلف انداز سے پیش کی گئی ہے۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب جنگ اُحد میں انھیں کے دندان مبارک شہید ہوئے اور جبین مبارک زخمی ہو گئی اور مسلمانوں کو بہت سخت نقصان پہنچا تو پیغمبر کفار کے سرور و فردا کے متعلق سوچنے لگے کہ یہ لوگ کس طرح راہِ ہدایت پر آئیں گے اور فرمایا:

"کیف یصلح قوم فعلوا ہذا بنبیتہم و هو یدعوہم الی ربہ"

یہ گروہ کیسے فلاح پائے گا جس نے اپنے پیغمبر سے یہ سلوک کیا جب کہ وہ انہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس مقام پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور پیغمبر کو تسلی و تسخنی دی گئی کہ آپ ان کی ہدایت کے جو ابداہ نہیں ہیں بلکہ آپ کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے۔

### ایک استنباہ اور اس کا ازالہ

یہاں دو نکات توجہ طلب ہیں:

(۱) نابغہ روزگار مفسر مؤلف "المنار" کا مفہوم ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کو حصولِ کامیابی کے لیے مادی وسائل سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں ایک ناقابلِ فراموش درس دیتی ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا انہیں کامیابی کی نوید سناتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان مادی وسائل، سامانِ حرب و ضرب اور منصوبہ بندی کو فراموش کر دیں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور کامیابی کے لیے پیغمبر کی دعا کا انتظار کریں۔ پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے "لیس لك من الامر من شیء" یعنی کامیابی کا معاملہ تیرے سپرد نہیں بلکہ وہ مشیتِ ایزدی کے تابع ہے۔ لہذا خدا نے ان کے لیے جو راستے مقرر کیے ہیں ان سے استفادہ کیا جائے اور پیغمبر کی دعا بھی اگرچہ مؤثر ہے لیکن اس میں استثنائی پہلو موجود ہے اور وہ معینِ مواقع کے ساتھ مضمون ہے مؤلف موصوف کی یہ گفتگو اگرچہ نطق و حکمت سے لبریز ہے لیکن یہ آیت کے ان مطالب سے مناسبت نہیں رکھتی جو کفار کی سزا یا توبہ کے بارے میں ہیں۔ لہذا اسے اس آیت کی تفسیر نہیں کہا جاسکتا۔

(۲) یہ آیت مخالفینِ اسلام کے بارے میں معفو و بخشش یا سزا کے متعلق پیغمبر سے ہر قسم کے اختیارات سلب کر رہی ہے لیکن یہ اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ معفو و درگزر کے لیے دعا اور شفاعت مؤثر ہیں۔ کیونکہ آیت بالا کا مقصد یہ ہے کہ آپ خود سے کوئی کام انجام نہیں دے سکتے البتہ خداوند تعالیٰ کے حکم و اذن سے معافی دے سکتے ہیں اور سزا بھی دے سکتے اور کامیابی کے عوامل بھی فراہم کر سکتے ہیں حتیٰ کہ پروردگار عالم کے اذن و اجازت سے حضرت عیسیٰ کی طرح مردوں کو بھی زندہ کر سکتے ہیں۔ جو لوگ جملہ "لیس لك من الامر من شیء" کے حوالے سے پیغمبر اکرم کی طاقت کا انکار کرتے ہیں اور ان کے سلبِ اختیارات



پر اصرار کرتے ہیں، انہوں نے درحقیقت قرآن کی دیگر آیات کو فراموش کر دیا ہے قرآن بمید سورہ نساء آیت ۶۴ میں کہتا ہے:

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا

اگر وہ لوگ جب اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے، تمہارے پاس آجاتے اور معافی طلب کرتے اور پیغمبر ان کے لیے طلب مغفرت کرتے تو خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

اس آیت کی روشنی سے آپ کی استغفار کو گناہ کی بخشش کا ایک عامل شمار کیا گیا ہے۔

آئندہ کے مباحث میں مناسب آیات کے ذیل میں اس مطلب پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

۱۲۹۔ **وَاللَّهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ يُغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ**

ترجمہ

۱۲۹ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے (اور مناسب سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دے دیتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

درحقیقت یہ آیت گذشتہ آیت کی تاکید ہے کہ بخشنا اور سزا دینا پیغمبر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ وہ حکم خداوندی کے تابع ہے آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے قبضہ قدرت میں ہے پیدا کرنا اسی خدا کا کام ہے۔

”وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“

باوجودیکہ اس کا عذاب بہت سخت ہے وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ کوئی حرج نہیں کہ ہم یہاں ایک مسلم اسکالر کی پُر از حکمت گفتگو کی طرف اشارہ کریں جو سخت ہونے کے باوجود بعض سوالوں کا جواب مفسر عالی قدر (علامہ طبرسی) اس آیت کے ذیل میں رقمطراز ہیں کہ ایک عالم سے پوچھا گیا کہ خداوند عالم کس طرح اپنے بندوں کو ان کے گناہوں کی بناء پر باوجود اپنی وسیع و بے پایاں رحمت کے عذاب دے گا تو اس عالم نے جواب دیا کہ خدا کی رحمت ہی کی حکمت کو ختم نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی رحمت کا سرچشمہ ہمارے جذبہ ترقم کی طرح احساسات اور رقت قلبی نہیں ہے بلکہ اس کی رحمت ہمیشہ اس کی حکمت سے وابستہ ہوتی ہے اور حکمت کا اقتضایہ ہے کہ معصیت کاروں کو (سوائے خاص موارد کے) سزا دی جائے۔

۱۳۰۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا**





اللَّهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ۝

۱۳۱۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝

۱۳۲۔ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ ۝

ترجمہ

۱۳۰۔ اے ایماندارو! (بڑھا چڑھا کر سو) نہ کھاؤ خدا سے ڈرو تاکہ فلاح پا جاؤ۔

۱۳۱۔ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

۱۳۲۔ اور خدا اور پیغمبر کی اطاعت کرو تاکہ رحمت (الہی) تمہارے شامل حال ہو۔

تفسیر

قرآنی آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط

گذشتہ آیات میں جنگ اُمد کے واقعات اور بہت سے درس موجود ہیں جو مسلمانوں نے اس عبرت آموز واقعے سے حاصل کیے لیکن زیر نظر تین اور بعد والی چھ آیات چند ایک اقتصادی، اجتماعی اور تربیتی پروگراموں پر مشتمل ہیں اور ان نو آیات کے بعد پھر از سر نو جنگ اُمد کا تذکرہ ہے۔ جو سکتا ہے کہ یہ انداز بیان بعض لوگوں کے لیے باعثِ تعجب ہو۔ لیکن بنیادی امر پر توجہ کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے:

قرآن کوئی کلاسیکی کتاب نہیں ہے جو کئی فصول و ابواب کی حامل ہو اور اس کے ابواب و فصول کے درمیان ایک خاص ربط ملحوظ رکھا گیا ہو بلکہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو تیس سال کی مدت میں مختلف تربیتی ضروریات کے مطابق مختلف اوقات و مقامات میں قسط وار نازل ہوتی رہی۔ ایک دن واقعہ اُمد پیش آتا ہے اور مختلف جنگی پروگرام چند ایک آیات کے ضمن میں بتائے جاتے ہیں دوسرے روز ایک اقتصادی مسئلہ درپیش آتا ہے مثلاً سود یا حقوق کا مسئلہ سامنے آچلا ہے مثلاً شادی بیاہ سے متعلق مسائل یا ایک تربیتی اور اخلاقی معاملہ درپیش ہوتا ہے مثلاً توبر اور پھر کئی ایک آیات کا نزول ہوتا ہے۔ البتہ تمام سورتیں اور آیات قرآن ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور وہ یہ کہ سب کی سب ایک انسان سازی اور اعلیٰ ترین سطح کے ایک تربیتی پروگرام کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں اور ایک پُر امن مادی اور روحانی لحاظ سے ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ لہذا اگر مندرجہ بالا آیات قبل و بعد کی آیات سے کوئی خاص ربط نہیں رکھتیں تو اس کی یہی وجہ ہے۔



## سود خوری کی حرمت کے چند مراحل

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کا یہ طریقہ ہے کہ وہ معاشرے کی ایسی برائیاں جن کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں ان کی بیخ کنی کرنے کے لیے آہستہ آہستہ زمین ہموار کرتا ہے اور لوگوں کو تدریجاً ان کے مفاسد سے آگاہ کرتا ہے اور جب قرآنی احکام قبول کرنے کے لیے آمادگی حاصل ہو جائے تو ان تصحیحی شکل میں بیان کر دیتا ہے (خصوصاً ایسے مواقع پر جہاں گناہ سے آلودگی کا امکان بہت زیادہ ہو)۔

یہ بھی واضح ہے کہ دنیا سے عرب زمانہ جاہلیت میں سود خوری میں شدت سے تلوث تھی، خصوصاً مکہ کا گرد و نواح سود خوروں کا مرکز تھا اور ان کی بہت سی قبیح اجتماعی برائیوں کا سبب یہی بڑا کاروبار تھا۔ بنا براین قرآن مجید نے سود خوری ختم کرنے کے لیے حرمت کا حکم چار مراحل میں بیان کیا ہے:

(۱) پہلے پہل سود کے بارے میں سورہ روم آیہ ۳۹ میں ایک اطلاقی نصیحت پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ رَبِّا لَّيْرُبُوْا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَمَا  
اَتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوٰةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ قَا وَّلَيْكَ هُمْ الْمَضْعُوْنَ

یعنی صرف کوتاہ نظر افراد کی نگاہ میں سود کھانے والوں کی ثروت میں سود لینے سے زیادتی ہوتی ہے لیکن خدا کے ہاں اس میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی بلکہ زکوٰۃ اور راہِ خدا میں خرچ کرنا دولت و ثروت کی زیادتی کا باعث ہے۔

(۲) سورہ نسا آیہ ۱۶۱ میں یہودیوں کی غلط رسوم و عادات پر تنقید کرتے ہوئے ان کی سود خوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

”وَ اِخْذْهُمُ الرِّبٰوُ وَقَدْ نَهٰوْا عَنْهُ“

ان کی ایک بڑی عادت یہ تھی کہ وہ سود کھاتے تھے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔

(۳) زیر بحث آیت میں بیجا اس کی تفسیر کے ذیل میں بتایا جائے گا، سود کی حرمت کا صریح حکم ذکر ہوا ہے لیکن سود کی صرف ایک قسم کی طرف جو بہت بڑی قسم ہے۔ اشارہ ہوا ہے۔

(۴) آخر میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ سے لے کر ۲۷۹ تک ہر قسم کی سود خوری کی شدت سے ممانعت کا اعلان کیا گیا ہے اور اسے خدا سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا الرِّبٰوُ اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ---

اس آیت میں سود کی قبیح ترین قسم کی حرمت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور ”اضعافاً مضاعفاً“ (چند در چند) کی تعبیر موجود ہے۔ ربائے فاحش سے مراد یہ ہے اصل سرمایہ ہی اضافی سود کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے۔ یعنی سود پہلے مرحلے میں اصل سرمائے میں جمع ہو جائے اور آئندہ اصل سرمائے میں سود جمع ہونے پر جو سرمایہ بنا ہے اس پر سود لگے اور اسی ترتیب سے ہر مرتبہ کا سود اضافی سرمایہ بن کر



گذشتہ سرمائے میں جمع ہوتا جائے اور سرمائے کی نئی رقم تشکیل دیتا جائے۔ اس طرح طویل مدت میں ایک دوسرے پر سود کی زیادتی کی وجہ سے مقروض کے قرضہ کا مجموعہ اصل قرضہ سے کئی گنا زیادہ ہو جائے اور اس کی زندگی مکمل طور پر دیوالیہ ہو جائے جیسا کہ روایات و تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ اگر مقروض قرض کی مدت ختم ہونے پر قرض نہیں ادا کر سکتا تھا تو قرض خواہ سے تقاضا کرتا کہ وہ سود اور اصل قرض کا مجموعہ نئے سرمائے کی شکل میں اسے بطور قرض دیدے اور اس کا سود لے۔ ہمارے دور میں بھی اس قسم کی ظالمانہ سود خوری کثرت سے رائج ہے۔

”وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ“

آیت کے آخر میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے: اگر فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو تو تقویٰ اپناؤ اور اس گناہ

سے بچو۔

”وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ“

یہ آیت از سر نو تقویٰ کی تاکید کرتی ہے اور اس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ڈراتی ہے۔ لفظ ”کافرین“ کے ساتھ تعبیر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولی طور پر سود خوری ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے اور سود خوروں کے لیے بھی اس آگ کا ایک حصہ ہے جو کفار کی خاطر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ بنیادی طور پر کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ باقی رہے گناہگار اور مصیبت کار تو ان کے لیے اس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا وہ کفار سے شباہت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

”وَ اطِيعُوا اللَّهَ وَ الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ“

گذشتہ آیت کی دھمکی اس تشویق و ترغیب کے ساتھ تکمیل پاتی ہے جو اس آیت میں مطیع اور فرمانبرداروں کے لیے ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور سود خوری چھوڑ دو تاکہ تم پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہو۔

۱۳۳۔ وَ سَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَ الْأَرْضُ  
أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝

۱۳۴۔ الَّذِينَ يَنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَ الضَّرَّاءِ وَ الْكَاطِمِينَ الْغَيْظِ وَ الْعَافِينَ  
عَنِ النَّاسِ وَ اللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

۱۳۵۔ وَ الَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا  
لِذُنُوبِهِمْ وَ مَن يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَ لَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا  
فَعَلُوا وَ هُمْ يَعْلَمُونَ ۝





۱۳۳۴- أُولَٰئِكَ جَزَاءُ هُمْ مَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا  
الأنهارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝

ترجمہ

۱۳۳۳ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کے لیے جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

۱۳۳۲ وہی لوگ جو تنگی اور کشادگی میں خرچ کرتے ہیں اور اپنا غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں اور خدا نیکو کار لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۳۳۱ اور وہ لوگ کہ جب وہ کسی عمل بد کا ارتکاب کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور خدا کے سوا گناہوں کو بخشنے والا کون ہے اور وہ گناہ پر اصرار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔

۱۳۳۰ ان کی جزا پروردگار کی بخشش اور وہ باغات بہشت ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے اور یہ عمل کرنے والوں کے لیے کتنا اچھا معاوضہ ہے۔

تفسیر

سعادت کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت

”وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ“

”سارِعُوا“ سارعت سے ہے جس کے معنی ہیں کسی مقصد تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لیے دو یا دو سے زیادہ افراد کی کوشش۔ نیک کاموں میں یہ قابل ستائش ہے اور برے کاموں میں مذموم۔

گذشتہ آیات کے بعد کہ جو بدکاروں کو جہنم کی تہدید اور نیک لوگوں کو رحمت الہی کی تشویق کرتی ہیں، اس آیت میں نیک لوگوں کی کوشش اور جستجو کو معنوی مقابلے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس کا آخری مقصد خدا کی بخشش اور بہشت کی دائمی وابدی نعمات ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ اس مقصد تک رسائی کے لیے ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرو۔

درحقیقت قرآن ایک نفسیاتی پہلو کی طرف توجہ مبذول کرتا ہے کہ انسان اگر کسی کام کی انجام دہی میں تنہا ہو تو عموماً اس کام کو وہ حسبِ عادت تاخیر سے پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے لیکن اگر اس میں مقابلے کا پہلو ہو اور مقابلہ بھی ایسا جس میں ایک بیش بہا انعام پر داؤ لگایا گیا ہو تو



وہ اپنی تمام تر قوت و توانائی صرف کرتا ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش رفت کرتا ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقابلے کا پہلا مقصد مغفرت قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر معنوی مقام تک رسائی گناہوں کی آلودگی سے پاک و صاف ہونے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہذا سب سے پہلے اپنے آپ کو گناہ سے پاک کیا جائے اور اس کے بعد مقام تقرب الہی کی طرف قدم اٹھایا جائے

”وَجَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ“

اس معنوی مقابلے کا دوسرا ہدف بہشت ہے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے عرض کے برابر ہے۔ (یعنی زمین کے عرض کے برابر ہے) اس آیت میں عرض سے مراد علم ہندسہ کی اصطلاح نہیں ہے کہ عرض طول کے مقابلے میں ہو، بلکہ اس سے مراد وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ اس طرح قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت جتنی ہے اور سورہ المدید کی آیت ۲۱ میں یہی تعبیر معمولی فنی کے ساتھ آئی ہے۔

”سَابِقُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ“

اس آیت میں مسامتت کی بجائے صراحت کے ساتھ لفظ مسابقت آیا ہے اور سماء مفرد کی شکل میں ہے اور اس کے ساتھ الف لام جنس کے اعتبار سے ہے جو یہاں عموم کا مفہوم دے رہا ہے اور کاف سے تشبیہ معلوم ہوتی ہے بایں طور کہ مثل بحث آیت میں تصریح کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بہشت کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے لیکن سورہ المدید کی آیت میں ہے کہ اس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی مانند ہے لیکن دونوں تعبیروں کا معنی و مفہوم ایک ہے۔ آیت کے آخر میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ بہشت اس عظمت کے ساتھ پر سیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے ”أَعَدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ“

اب یہاں یہ سوال ذہن میں آٹھ سکتا ہے:

اولاً یہ کہ کیا جنت و جہنم پیدا ہو چکے ہیں اور وہ وجود خارجی رکھتے ہیں یا بعد میں لوگوں کے اعمال کے حساب سے ایجاد ہوں گے۔

ثانیاً یہ کہ اگر وہ خلق ہو چکے ہیں تو وہ کہاں ہیں (اس طرف تو جہنم کرتے ہوئے کہ قرآن کہتا ہے کہ صرف جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے)۔

کیا جنت و دوزخ اس وقت موجود ہیں؟

اکثر علماء اسلام کا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں اس وقت وجود خارجی رکھتے ہیں اور قرآنی آیات کا ظاہری معنی بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ نمونہ کے طور پر:

(۱) مثل بحث آیت اور دیگر کثیر آیات میں اعدت (تیار کی جا چکی ہے) استعمال ہوا ہے یا بعض دوسری تعبیرات جو اسی مادہ سے ہیں جو بعض مقامات پر بہشت کے بارے میں اور بعض جگہ دوزخ کے بارے آئی ہیں۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے

۱۔ سورہ توبہ آیت ۸۹، سورہ فتح آیت ۶، بقرہ آیت ۲۴، آل عمران ۱۳۱ و ۱۳۲، سورہ المدید آیت ۲۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔



کہ بہشت و دوزخ اس وقت تیار موجود ہیں اگرچہ انسانوں کے نیک و بد اعمال کے نتیجے میں ان میں وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے (غور کریں)۔

(۲) معراج سے متعلق سورۃ والنجم کی آیات میں یوں ہے:

وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ عِنْدَ هَابِجَتِهِ الْمَأْوَىٰ  
 دوسری مرتبہ پیغمبر نے جبرئیل کو سدرة المنتہیٰ کے پاس دیکھا جہاں دائمی جنت ہے (والنجم - ۱۵ تا ۱۳)۔  
 یہ تعبیر جنت کے وجود پر دوسری شہادت ہے۔

(۳) سورہ تکوین آیت ۶۰، ۶۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝ لَتَكْفُرُنَّ وَلَكِن لَّمَّا كَفَرْنَا سَنَاقِلُنَا  
 اگر تمہیں علم یقین ہوتا تو دوزخ کا مشاہدہ کرتے پھر اُسے میں یقین کے ساتھ دیکھتے۔  
 معراج سے مربوط اور دیگر آیات میں بھی اس مسئلہ کی واضح نشاندہی کی گئی ہے۔

### جنت اور دوزخ کہاں ہیں

اس بحث کے بعد یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر یہ دونوں موجود ہیں تو کہاں ہیں اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ جنت و جہنم اس دنیا کے باطن میں موجود ہیں ہم زمین و آسمان اور مختلف کرات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن ان کے اندر موجود دنیا میں ہیں انہیں ہم نہیں دیکھ پاتے کہ جہاں کثرت سے موجودات ہیں جو ہماری آنکھوں کی قوت اور اک سے ماورا ہیں اور آیات كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ لَتَكْفُرُنَّ وَلَكِن لَّمَّا كَفَرْنَا سَنَاقِلُنَا بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چند ایک احادیث سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ بعض بندگانِ خدا اس جہاں میں اتنی قوتِ بینائی رکھتے تھے کہ وہ یہاں رہ کر جنت و جہنم کو اپنی حقیقت میں نگاہوں سے دیکھ سکتے تھے۔ مزید توضیح کے لیے ایک مثال دی جا سکتی ہے۔ ایک طاقتور ریڈیائی آڈیو کی لہریں بھیجنے والے کسی خطہ ارض میں موجود ہر جو فضائی لہروں کی مدد سے پوری دنیا میں تلاوتِ قرآن کا دل آویز زمزمہ بہت ہی دلنشین اور روح پرور آواز سے نشر کر رہا ہو۔ اسی طرح کا ایک اور آکر زمین کے کسی خطہ میں موجود ہو جو بہت ہی پریشان کن آواز دوسری فضائی لہروں میں پھیلا دے۔ جس وقت ہم ایک مقام پر بیٹھے ہوں تو اپنے ارد گرد کے لوگوں کی آواز تو ہم سن سکتے ہیں لیکن ان دو لہروں کا احساس تک نہیں ہوتا جو فضائے عالم میں پرواز کر رہی ہیں۔ لیکن اگر ان کو گرفت میں لینے والی مشین موجود ہو تو فوراً وہ ہمارے کانوں میں پڑ جائیں گی اگرچہ عام حالت میں ہمارے کان اس کے سننے سے عاجز ہوتے ہیں۔ گزشتہ مثال اگرچہ کئی لحاظ سے ناقص ہے تاہم جنت و دوزخ جیسے باطنی امور کی تصویر کشی کے لیے کافی ہے۔

۱۰ تو جہاں کہ عالم آخرت کی جنت اس سے مختلف ہے جس میں حضرت آدمؑ رہے تھے۔ کیونکہ وہ حضرت آدمؑ کی خلقت سے قبل موجود تھی۔





دوسرا پہلو یہ ہے کہ عالم آخرت اور جنت و جہنم اس عالم مادی پر حاظر کئے ہوئے ہیں اور یہ اس کے اندر اس جنم کی مانند ہیں جو اس دنیا کے اندر ایک علیحدہ مستقل عالم میں رہتا ہے اور وہ اس عالم سے جدا نہیں اسی طرح عالم دنیا بھی عالم آخرت کے اندر واقع ہے۔ یہاں قرآن کریم نے جو جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے مساوی قرار دی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی نظر میں زمین اور آسمان سے زیادہ وسیع چیز کوئی نہیں۔ لہذا قرآن نے جنت کی عظمت و وسعت کی تصویر کشی زمین و آسمان کی وسعت کے حوالے سے کی، اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا جیسا کہ اگر شکم مادر میں ایک بچہ ہو اور ہم چاہیں کہ اس سے گفتگو کریں تو ایسی منطق میں اس سے بات کریں گے کہ جو اس کے لیے قابل ادراک ہو۔

گذشتہ تبصرے سے ہمارے اس سوال کا جواب بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اگر جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو پھر جہنم کہاں ہے؟ کیونکہ پہلے جواب کی رُو سے دوزخ بھی اس جہان کے اندر ہے اور اس جہاں میں ان دونوں کے موجود ہونے میں کوئی اشکال نہیں (جیسا کہ آواز کی لہریں بھیجنے والی مشین کی مثال میں اس کا ذکر ہو چکا ہے) باقی ربا دوسرا جواب کہ جنت و دوزخ اس جہاں پر محیط ہیں تو یہ کچھ زیادہ روشن ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ دوزخ اور جنت دونوں اس جہاں پر محیط ہوں اور جنت کچھ زیادہ وسیع ہو۔

## پرہیزگاروں کی نشانیاں

”الذین یسفقون فی السراء والضراء۔۔۔۔۔“

گذشتہ آیت میں پرہیزگاروں کو دائمی جنت کی نوید سنائی گئی تھی، اس لئے اس آیت میں ان کا تعارف کرایا جا رہا ہے اور ان کی پانچ اعلیٰ امتیازی خصوصیات بیان کی گئیں ہیں:

1 وہ ہر حالت میں خرچ کرتے ہیں چاہے وہ آرام و فراخ دستی میں ہوں یا پریشانی اور محرومیت میں مبتلا ہوں۔ وہ اس عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ دوسروں کی مدد کرنے اور نیکی کا جذبہ ان کی رُوح کی گہرائیوں میں اترتا ہوا ہے۔ اسی بنا پر وہ ہر حالت میں اس کے لیے اعلیٰ طور پر تیار ہوتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ آسودگی کی حالت میں خرچ کرنا سخاوت جیسی بلند صفت کی نشاندہی نہیں کرتا البتہ وہ لوگ جو ہر حالت میں ضرورت مندوں کو نوازتے ہیں، وہ اس کا بے ثبوت ہتیا کرتے ہیں کہ ان میں یہ صفت راسخ ہے۔ ہاں! اس مقام پر ذہنوں میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ تنگ دستی کی حالت میں انسان کیونکر خرچ کر سکتا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے کہ تنگ دستی افراد بھی اپنی قدرت کے مطابق دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ خرچ و انفاق صرف مال و ثروت میں منحصر نہیں بلکہ خدا کے ہر عطیے سے اس کا تعلق ہے۔ چاہے مال و ثروت ہو، نعمتِ علم و دانش ہو یا دیگر نعماتِ الہی۔ اس عمل سے خدا چاہتا ہے کہ صاحبانِ دولت کے علاوہ قربانی و فداکاری کی رُوح غریبوں کے دلوں میں بھی پروان چڑھ جائے تاکہ وہ بسیار اخلاقی برائیوں سے دور ہوں جو بہت زیادہ ہیں اور جن تمام کا سرچشمہ بخل ہے۔ اس مقام پر ان لوگوں کا جواب موجود ہے جو راہِ خدا میں قلیل امداد کو کم سمجھتے ہیں بلکہ ان کے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر ایک امداد پر علیحدہ علیحدہ نظر رکھتے ہیں ورنہ یہی تھوڑی تھوڑی امداد کیا اگر جمع کی جائیں مثال کے طور پر ایک ملک کے تمام رہنے والے امیر و غریب تھوڑے تھوڑے پیسے بندگانِ خدا کے لیے جمع کریں تو



وہ بڑے سے بڑا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انفاق کا اخلاقی اور روحانی اثر زیادہ خرچ کرنے سے نہیں ہے بلکہ اس کے تمام اثرات انفاق کرنے والے کی تہ پر مرتب ہوتے ہیں۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہاں پر ہیزگاروں کی پہلی عمدہ صفت انفاق (راہ خدا میں خرچ کرنا) ذکر ہوئی ہے کیونکہ یہ آیات سود خوروں اور سامراجیوں کے مد مقابل صفات کو بیان کر رہی ہیں کہ جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں خوشی اور تنگدستی کی حالت میں مال و دولت کی قربانی تقویٰ کی واضح ترین علامت ہے۔

۲

والکاظمین الغیظ۔ وہ اپنے غصے کو پی جاتے ہیں۔  
 ”کظم“ کے لغوی معنی پانی بھری مشک کے دھانے کو باندھنے کے ہیں اور کنیہ کے طور پر ان لوگوں کی صفت بیان کی جاتی ہے کہ جو آتشِ غیظ و غضب سے بھرے ہوں لیکن اسے استعمال نہ کریں۔ لفظ غیظ کا معنی شدتِ غضب ہے جو ایک روحانی تہیمان ہے جو طبیعت کے خلاف چیزوں کو دیکھ کر انسان پر طاری ہو جاتا ہے اور انسان کو آپے سے باہر کر دیتا ہے۔ غصے کی حالت خطرناک ترین حالت ہوتی ہے اور اگر اسے روکا نہ جائے تو ایک دیوانگی کا عالم ہوتا ہے اور اعصابی نظام کنٹرول سے باہر ہو جاتا ہے۔ جس سے معاشرے میں بہت سے جرائم نمودار ہوتے ہیں۔ اس لیے درج بالا آیت میں پرہیزگاروں کی دوسری صفت غصے کو پی جانا ظاہر کی گئی ہے۔ حضرت رسول خدا فرماتے ہیں:

”من کظم غیظاً و هو قادر علی انفاذہ ملاہ اللہ امتا و ایمانا“

جو شخص اپنے غصے کو پی جائے جبکہ اسے استعمال کرنے پر قادر ہو تو خدا اس کے دل کو امن و ایمان کی روشنی سے منور کرتا ہے۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ غصے پی جانا انسان کی معنوی و روحانی ترقی اور ایمان کی پختگی کے لیے بہت مؤثر ہے۔  
 و العافین عن الناس۔ اور وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

۳

غصے کو پی جانا (اپنے مقام پر) بڑی اچھی خوبی ہے لیکن یہ انسان کے دل کو بغض و کینہ سے پاک نہیں کرتا لہذا بغض و کینہ کی بُرائی ختم کرنے کے لیے ان دونوں (غصے کو پی جانا اور درگزر کرنا) کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ البتہ ایسے افراد سے درگزر کرنا سزاوار ہے کہ جو اس کے اہل ہوں۔

واللہ یحب المحسنین۔ اور وہ نیکی کرنے والے (لوگ ہونے کی وجہ سے) اللہ کو محبوب ہیں۔

۴

اس حصے میں غفور و بخشش سے بلند تر صراط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح ترقی و تکامل کے مراتب کی تصویر کشی کی گئی ہے اور وہ اس طرح کہ انسان نہ صرف اپنا غصے پی جائے اور غفور و بخشش سے کینہ کے داغ دل سے دھو ڈالے بلکہ بُرائی کے مقابلے میں احسان اور نیکی کر کے (جہاں مناسب ہو) مد مقابل کے دل سے بھی دشمنی کی بیج کٹی کر دے اور اس کے دل میں نرمی پیدا کر دے تاکہ پھر کبھی اس قسم کا مادہ سر نہ اٹھائے۔

خلاصہ یہ کہ پہلے غصے کے مقابلے میں اپنے اوپر قابو پانے کا حکم ہے اس کے بعد اپنے دل کو پاک و صاف کرنے کا فرمان ہے اور آخر میں مد مقابل کے دل کو پاک کرنے کا ارشاد ہے۔

مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے جو شیعہ اور سنی کتب میں موجود ہے وہ یہ کہ ایک دفعہ

حضرت امام علی بن حسین زین العابدین کی ایک کینز آپ کے ہاتھ دھلا رہی تھی کہ پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس سے امام کا جسم اقدس زخمی ہو گیا۔ امام نے غصہ میں سر اٹھایا تو کینز نے فوراً کہا: خدا قرآن میں فرماتا ہے ”والکاظمین الغیظ“ امام نے فرمایا: میں نے اپنا غصہ پی لیا اس نے عرض کیا: ”والعافین عن الناس“ امام نے فرمایا: میں نے تجھے معاف کیا خدا تجھے معاف کرے۔ اس نے پھر کہا: ”والله يحب المحسنین“ امام نے فرمایا: میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔ یہ حدیث اس بات پر واضح شاہد ہے کہ مذکورہ تین مراحل میں سے ہر ایک دوسرے سے بلند تر ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً ..... وَهَانُوا بِهَا فِي يَوْمٍ هَالِكٍ

”لفظ فاحشہ“ فحش یا فحشاء سے ہے جس کا معنی ہے ہر وہ عمل جو بہت ہی بُرا ہو اور یہ مفہوم عفت و پاک دامنی کے منافی اعمال میں منحصر نہیں ہے کیونکہ اصل میں یہ حد سے تجاوز کے معنی میں ہے جس میں ہر طرح کا گناہ شامل ہے۔

درج بالا آیت میں پرہیزگاروں کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ لوگ گذشتہ مثبت صفات سے متصف ہونے کے علاوہ اگر کسی گناہ کے مرتکب ہو جائیں تو فوراً یا دُخدا میں پڑ جاتے ہیں اور توبہ کر کے پھر کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب تک یا دُخدا میں مشغول ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور وہ گناہ کا اس وقت مرتکب ہو جاتا ہے جب کئی طور پر اس کا دل یا دُخدا سے خالی ہو اور وہ محو غفلت ہو۔ لیکن پرہیزگار افراد میں یہ غفلت زیادہ مرتب نہیں رہتی بلکہ وہ بہت جلد یا دُخدا میں مصروف ہو جاتے ہیں اور گذشتہ کمی کی تلافی کر لیتے ہیں اور اس وقت وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے اور صرف اسی سے گناہوں کی بخشش طلب کرنا چاہیے۔

”وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ“

کون ہے خدا کے علاوہ جو گناہوں کو بخشتا ہے۔

اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ آیت میں فاحشہ کے علاوہ اپنے اوپر ظلم کرنے کا ذکر بھی ہوا ہے (لَا تظلموا انفسکم) ممکن ہے کہ ان دونوں میں فرق یہ ہو کہ فاحشہ سے گناہان کبیرہ اور ظلم سے گناہان صغیرہ مراد ہوں۔ آیت کے آخری حصہ میں تاکید کہا گیا ہے (وَلَمْ يَصِرْوا اَعْلٰی مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ) اور وہ علم و آگاہی کی صورت میں گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔ اس آیت کے ذیل میں حضرت امام محمد باقر سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

”الاصرار ان یذب الذنب فلا یتغفر الله ولا یحدث نفسه بتوبة فذلک الاصرار“

گناہ پر اصرار کرنا یہ ہے کہ انسان گناہ کرے اور اس کے بعد استغفار نہ کرے اور توبہ کی فکر میں نہ رہے یہ ہے گناہ پورا کرنے کا کتاب امالی صدوق میں امام جعفر صادق سے ایک پر معنی حدیث منقول ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ جب درج بالا آیت نازل ہوئی اور توبہ کرنے والوں کو خدا کی طرف سے بخشش کی خوشخبری دی گئی تو ابلیس بہت ہی پریشان ہو گیا اس نے بلند آواز سے اپنے تمام یار و انصار کو بلا کر ایک اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس دعوت کی دہر پوچھی تو اس نے اس آیت کے نزول کی بنا پر اظہار پریشانی کیا تو اس کے ایک مہنوائے کہا کہ میں انسانوں کو اس گناہ کی دعوت دے دے کہ اس آیت کو بے اثر کر دوں گا۔

تفسیر عیاشی زیر نظر آیت کے ضمن میں۔





ابلیس نے اس کی تجویز کو قبول نہ کیا ایک دوسرے نے اس قسم کی پیشکش کی کہ وہ بھی منظور نہ ہوئی کہ اس کے دوران ایک کہنہ مشق شیطان کہ جس کا نام وسواسِ خناس تھا، کہنے لگا میں اس مشکل کو حل کرتا ہوں۔ ابلیس نے پوچھا کیسے؟ وہ کہنے لگا: ولاد آدم کو وعدوں اور امیدوں کے ساتھ گناہ میں آلودہ کر دوں گا اور جب وہ گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے تو ان کے دلوں سے یاد خدا کو دور کر دوں گا۔ ابلیس نے کہا: یہی راستہ درست ہے اور یہ ذمہ داری رہتی دنیا تک اس کے سپرد کر دی۔

واضح ہے کہ سہل انگاری اور شیطانی دوسوسوں کا نتیجہ فراموش کاری ہے اور صرف وہ لوگ اس میں گرفتار ہوتے ہیں جو اس کے سامنے سر جھکا دیں اور اصطلاح کے مطابق وسواسِ خناس کے ساتھ قریبی تعلق استوار کر لیں۔ لیکن بیدار مغز اور کامل ایمان کے حامل لوگ اس بات پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ جب کبھی ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اولین ہر موقع پر اس کے آثار کو توبہ و استغفار کے ذریعے دھو ڈالتے ہیں اور اپنے دل کے درپے شیطان اور اس کے شکر کے لیے بند کر دیتے ہیں اس طرح وہ ان میں داخل نہیں ہو پاتے۔

اولئك جزاؤهم مغفرة من ربهم وجنت تجرى من تحتها الانهار  
خلدین فیہا۔

اس آیت میں ان پر ہیزگاروں کی جزا اور اجر بیان کیا گیا ہے (کہ جن کی صفات گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہیں)۔ وہ پروردگار کی بخشش اور بہشت بریں ہے، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں (اور ایک لحظہ کے لیے ان سے پانی منقطع نہیں ہوتا) وہ جنت کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ درحقیقت اس مقام پر پہلے تو معنوی و روحانی نعمات مغفرت، تلب و روح کو پاکیزہ کرنے اور روحانی ترقی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اس کے بعد مادی نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں کہا گیا کہ ”و نعم اجر العاملین“ یہ کیسی ہی اچھی جزا اور اجر ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے جو کہ مرد میدان ہیں نہ کہ سست بیکار افراد جو ہمیشہ اپنے وعدوں اور ذمہ داریوں میں لاپرواہی برتتے ہیں۔

۱۳۷۔ قَدْ خَلَّتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۖ فَنَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَاَنْظُرُوْا كَيْفَ

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِيْنَ ۝

۱۳۸۔ هٰذَا بَيٰنٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۳۷۔ تم سے پہلے کچھ سنتیں موجود تھیں (اور ہر قوم کی سرنواخت ان کے اعمال و صفات کے مطابق تھی اور تمہارا حال بھی ان کا سا ہے) زمین میں پل پھر کر دیکھو (کہ آیاتِ خدا کی تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔

۱۳۸۔ یہ بیان ہے لوگوں کے لیے اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔



## تفسیر

## گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ

قرآن مجید کا ایک انفرادی اسلوب ہے کہ یہ گذشتہ ادوار کو موجودہ اور زمانہ حاضر کو گذشتہ تاریخ سے مربوط کرتا ہے اور حقائق کو سمجھنے کے لیے موجودہ نسل کا گذرے ہوئے لوگوں کے ساتھ فکری و ثقافتی ربط لازمی اور ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ ان دو زمانوں (ماضی اور حال) کے پختہ ارتباط سے آنے والوں کی ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ زیر نظر آیت میں کہتا ہے کہ "قد خلت من قبلک سنن فسیروا فف الا سرحض خدا کی کچھ سنتیں (تعلیمات) گذشتہ اقوام میں تھیں جو ہرگز صرف ان کے لیے مخصوص نہ تھیں اور وہ قوانین زندگی کے سلسلہ کی ایک شکل میں تمام گذرے ہوئے اور آنے والوں کیلئے جاری ہوتی تھیں۔ ان سنتوں میں مومن و مجاہد اور شتمہ و بیدار مغز افراد کی پیشرفت اور بلند پروازی کی نشاندہی کی گئی ہے اور اسی طرح بے ایمان اور گناہ کی نجاست سے آلودہ اقوام کی شکست و ریخت کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے جو کہ تاریخ بشریت میں ثبت ہے۔

تاریخ ہر قوم کے لیے زندگی سے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ تاریخ کا کمال ہے کہ وہ گذشتہ لوگوں کی اخلاقی خصوصیات ان کے بُرے سبلے کام اور ان کے نظریات و افکار ہمارے سامنے دہراتی ہے اور مختلف معاشروں کی ترقی و منزل اور کامیابی و ناکامی کے اسباب کی نشاندہی کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ لوگوں کی تاریخ انسانی معاشروں کی روحانی و معنوی زندگی کا آئینہ ہے اور آنے والوں کی بیداری کا سبب ہے۔ بنابرین قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ زمین میں چلو پھرو اور گذشتہ قوموں، سربراہوں، سرکش فرعونوں اور جبار بادشاہوں کی طاقت و بربریت کے آثار میں غور و فکر کرو اور دیکھو کہ جب انہوں نے خدا کا انکار کیا اور خدا کے پیغمبروں کو جھٹلایا اور زمین میں ظلم و فساد کی بنیاد رکھی تو ان کا انجام کیا ہوا۔ گذشتہ لوگوں کے آثار آنے والوں کے لیے پند و نصیحت کا سامان ہیں اور لوگ ان سے مستفید ہو کر زندگی کی راہ سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

## جہاں گردی

گذشتہ لوگوں کی زندگی کے جو نشانات زمین کے مختلف خطوں میں قدیم ادوار سے باقی ہیں، وہ زندہ اسناد اور بولنے والی تاریخ ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کے متعلق لکھی ہوئی تاریخ کی نسبت ان سے زیادہ بہرہ ور ہو سکتے ہیں کیونکہ ان نشانات سے ہم ان اقوام کی جہانی ساخت، ان کا زاویہ فکر اور ان کی قدرت و عظمت کو باسانی جان سکتے ہیں جب کہ صفحات تاریخ صرف وقوع پذیر واقعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ستلوگوں کے حملات کی ویرانی، ابراہم مصر کی تعجب خیز عمارتیں، بابل کے برج، کسریٰ کے محل، قوم سبا کے آثار تمدن اور اس طرح کی بیسیوں نشانیاں جو اس عالم کے گوشہ و کنر میں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نشانی زبان حال سے ان لوگوں کی تاریخ بیان کرتی ہے اور بے زبانی کی زبان میں باتیں کرتی ہے۔ یہ حقیقت اس وقت آشکار ہو جاتی ہے جب کوئی نکتہ سنج شاعر ان حملات کے خرابوں میں جا کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنی روح میں ایک اضطراب محسوس کرتا ہے اور یہ بیان انگیز اشعار کہتا ہے جیسا کہ خاقانی اور دوسرے مالی



شہرت یافتہ شعرا نے کسریٰ وغیرہ کے ٹوٹے پھوٹے مملکت کے اندر سے یہ آوازیں دل کے کانوں سے سنی ہیں اور انہیں ادبی شاہکاروں کی زینت بنایا ہے۔

ان زندہ تاریخی آثار میں سے ایک کا مطالعہ کرنا ایک ضخیم تاریخی کتاب پڑھنے کے برابر ہے یہ مطالعہ انسان کی روحانی بیداری کے لیے ایک موثر چیز ہے کیونکہ جب ہم ان آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اچانک ایسا لگتا ہے کہ ان دیرانوں میں زیرِ ناک بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو گئی ہیں اور پہلے جوش و دلولہ کا مظاہرہ کر رہی ہیں لیکن جب ہم دوبارہ ان کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو انہیں خاموش و فراموش شدہ دیکھتے ہیں۔ ان دو حالتوں کا موازنہ اس راز کو طشت از بام کرتا ہے کہ خود سرفراز کتنے کوتاہ نظر ہیں کہ جو بہت جلدی گذر جانے والی ہوسرازیوں کے لیے بزرگوار کالی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ مسلمان روئے زمین پر سیروسیاحت کریں اور گذشتہ لوگوں کے آثار کا مشاہدہ کر کے ان سے عبرت حاصل کریں۔

اسلام میں بھی جہاں گردی اور سیروتفریح کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے لیکن آج کے جوش پرست سیاحوں کی طرح نہیں بلکہ گذشتہ لوگوں کے آثار و انجام کے مطالعہ اور گوشہ ہائے عالم میں عظمت خدا کے مشاہدہ کے لیے اور اسی کا نام قرآن نے "سیر وافی الارض" رکھا ہے اور کئی ایک آیات میں اس کا حکم دیا ہے۔ مثلاً

۱۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ حَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ۔

(نمل - ۶۹)

یعنی ان سے کہیں کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہوا۔

۲۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ

(مکعبت - ۲۰)

یعنی کہو کہ زمین میں گھوم پھر کر دیکھو کہ خدا نے کیسے تخلیق کی۔

(الحج - ۴۶)

۳۔ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونْ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا۔۔۔۔۔

کیا یہ لوگ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ ان کے دل اس سے کچھ عقل حاصل کرتے

۴۔ خاتمانی اپنے ایک مشہور قصیدے میں جبکہ وہ ایوانِ مدائن میں آنسو بہا رہا تھا، کہتا ہے:

بریدہ من خندیدہ کاہنجا ز چہ می گرید خندند برآن دیدہ کاہنجا نشود گریان  
یعنی وہ میری آنکھوں پر ہنسا کر یہاں کیوں روتی ہیں اور وہ ان آنکھوں پر تپتی ہیں جو یہاں رویں۔  
معروف عالم مرحوم شیخ ابیوروی تحت ہمیشہ کے سامنے کہے ہوئے اپنے مشہور قصیدے میں کہتے ہیں:  
جم عبرت مردم شد، افسر ز شس گم شد سرخشت سر نعم شد، ہاں امی سرا ہاں ہاں  
یہ تحت ہمیشہ آج باعث عبرت ہے کہ آج اس پر بیٹھنے والا ماکم موجود نہیں ہے۔  
اسی پرندہ خوشان است گر پند زبان غواہی رو آید "اور ثنا" از مکتب قسردان خوال  
یہ تو خاموش لوگوں کی نصیحت ہے اور اگر تو زبان کی نصیحت چاہتا ہے تو مکتب  
قرآن سے "اور ثنا" کی آیت پڑھ۔



یہ آیت کہتی ہے کہ یہ معنوی و روحانی سیاحی اور زمین کی سیر انسان کے دل کو دائمی، آنکھ کو بینائی اور کان کو سماعت عطا کرتی ہے اور اسے سکوت و جمود سے خلاصی دلاتی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسلامی حکم و قانون بہت سے دیگر قوانین کی طرح طاق نسیاں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ اب مسلمان اسے بھی نظر التفات سے نہیں دیکھتے یہاں تک کہ بعض علماء نے اپنی فکر کا دائرہ صرف گرد و پیش تک محدود رکھا ہے۔ وہ گویا اس عالم کے علاوہ کسی اور عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں اور دنیا کے اجتماعی انقلابات و وسائل سے بے خبر ہیں اور ان جزوی اور کم اثر کاموں میں اپنے آپ کو مشغول کر رکھا ہے جو اصولی اور بنیادی کاموں کے مقابلے میں خاص قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ اس دنیا میں پوپ اور میسائیوں کے بڑے بڑے پادری صدیوں کی گوش نشینی اور علیحدگی کے بعد زمین کی سیر و سیاحت کے لیے نکلتے ہیں تاکہ وہ ضروریات زمانہ کو بھیس۔ تو اس صورت میں کیا مسلمانوں کو قرآن کے اس حکم پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہیے اور اپنے محدود فکری تنگ دائرے سے نہیں نکلنا چاہیے تاکہ عالم اسلام اور مسلمانوں میں ایک انقلاب و حرکت کا فرما ہو۔

هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ .

اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو کچھ گذشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے وہ تمام انسانوں کے لیے ایک واضح اعلان اور تمام پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت کا ایک بہترین ذریعہ ہے یعنی باوجودیکہ یہ بیانات تمام انسانوں کے لیے ہمہ گیر پہنچتے ہیں لیکن ان سے ہدایت کا فرم صرف پرہیزگار ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۳۹۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزِنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○  
 ۱۴۰۔ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلَهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا  
 بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ○  
 ۱۴۱۔ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِينَ ○  
 ۱۴۲۔ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ  
 وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ○

۱۴۳۔ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ○

ترجمہ

۱۳۹ اور سست نہ ہو جاؤ اور حزن و ملال نہ کرو اور تم ہی برتر ہو اگر تم ایمان والے ہو۔

۱۴۰ اگر تمہیں (میدانِ احد میں) زخم لگے ہیں (اور تمہیں نقصان پہنچا ہے) تو اس گردہ کو بھی (میدانِ بدر میں) اسی طرح زخم لگ چکے ہیں اور ہم (شکست و کامیابی کے) ان دنوں کو لوگوں میں اُلٹ پھیر کرتے رہتے ہیں (کیونکہ یہ اس جہان کی زندگی کی غامضیت ہے) یہ اس لیے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ پہچانے جائیں اور خدا تم میں سے قربان ہونے والوں کو منتخب کر لے اور



خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

۱۴۱ اور اس لیے کہ خدا صاحب ایمان لوگوں کو خالص قرار دے (اور وہ الگ ہو جائیں) اور کافروں کو رفتہ رفتہ نابود کر دے۔

۱۴۲ کیا تمہارا گمان ہے کہ تم ہر طرف دعویٰ ایمان کی بنا پر جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے جبکہ ابھی تک خدا نے تم میں سے مجاہدین اور ماہرین کو شخص اور جدا نہیں کیا۔

۱۴۳ اور تم موت (اور راہِ خدا میں شہادت) کی تمنا کرتے تھے جبکہ ابھی تمہارا اور اس کا آنا سامنا نہیں ہوا تھا اور پھر تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور تمہیں وہ نظر آرہی تھی لیکن تم اپنے تئیں اس کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھے، تمہارے گفتار و کردار میں کتنا فرق ہے۔

## شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں کئی ایک روایات ہیں مجموعی طور پر ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان آیات کا ضمیر میں جو جنگِ اُحد کے بارے میں پہلے آچکی ہیں۔ یہ آیات جنگِ اُحد کے اسباب و نتائج کا بہترین تجزیہ پیش کرتی ہیں اور ضمنی طور پر مسلمانوں کی روحانی تقویت اور ان کی تسنی کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ کیونکہ جیسا بیان کیا گیا ہے کہ جنگِ اُحد کچھ مسلمانوں کی نافرمانی اور جنگی اصولوں سے انحراف کی وجہ سے شکست پر منتج ہوئی اور اس میں اسلام کی چند درخشاں شخصیات نے ہام شہادت نوش فرمایا جن میں سے سرفہرست پیغمبر اکرم کے چچا حضرت حمزہ کا نام گرامی آتا ہے۔ پیغمبر اکرم اسی رات اپنے صحابہ کے ہمراہ شہداء کی لاشوں کے قریب گئے شہداء کی لاشوں کی عظمت کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ ایک ایک شہید کی لاش مبارک کے پاس بیٹھتے اور گریہ کرتے اور ان کے لیے طلبِ مغفرت کرتے بعد میں ان سب کی لاشوں کو کوہِ اُحد کے دامن میں بہت ہی رنج و ملال کے ساتھ دفن کیا گیا۔ ان حساس لمحات میں درج بالا آیات کا نزول ہوا کیونکہ اس موقع پر مسلمان روحانی تقویت اور شکست کے نتائج سے معنوی فائدہ حاصل کرنے کے شدید محتاج تھے۔

تفسیر

## جنگِ اُحد کے نتائج

وَلَا تَقْتُلُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَانْتُمُ الْاَعْلَمُونَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔

”تہنوا“ ”وہن“ کے مادے سے لیا گیا ہے۔ وہن لغت میں ہر قسم کی سستی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق جسم سے ہو یا ارادہ و ایمان سے۔ اس آیت میں پہلے تو مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک جنگ میں شکست کی وجہ سے تم میں



سستی اور کمزوری پیدا ہو اور تم محزون ہو کر آخری کامیابی سے مایوس ہو جاؤ۔ کیونکہ بیدار مغز افراد جس طرح کامیابیوں سے استفادہ کرتے ہیں اسی طرح شکست سے بھی درس حاصل کرتے ہیں اور اس کے سائیر میں کمزوری کے نقاط اور شکست کی وجوہات تلاش کرتے ہیں اور انہیں دور کر کے آخری کامیابی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

أنتم الاعلون ان کنتم مؤمنین " اتم ہی برتر ہو اگر تم میں ایمان ہو (ایک بہت ہی پر معنی جملہ ہے۔ یعنی تمہاری شکست درحقیقت روح ایمان اور اس کے آثار کو بیٹھنے کی وجہ سے تھی۔ اگر تم فرمان خدا اور رسول کو پائے نافرمانی سے نزو دنتے تو اس قسم کی مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے تاہم تمہیں رنج و ملال نہیں ہونا چاہیے اگر راہ ایمان پر ثابت قدم رہے تو آخری فتح تمہاری ہوگی اور ایک میدان میں شکست سے دوچار ہونے کا معنی حتمی شکست نہیں ہے۔

ان یعسسکم قرح فقد منس القوم قرح مشلہ۔

"قرح" کا معنی ایسا زخم ہے جو بدن میں کسی خارجی عامل کی وجہ سے پیدا ہو۔ اس آیت میں ایک دوسرا درس آخری کامیابی تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے کہ تمہیں دشمن سے کتر تو نہیں ہونا چاہیے۔ وہ سخت سنگین شکست سے دوچار ہوئے تھے، ان کے ستر آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بہت سے لوگ زخمی اور قید ہوئے تھے۔ بائیں ہمدہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہے بلکہ میدان اُحد میں تمہاری غفلت کی وجہ سے انہوں نے اپنی شکست کی تلافی کی ہے۔ اب اگر تم اس میدان میں شکست کھا گئے ہو تو تم بھی نقصان کی تلافی کیے بغیر بیٹھ نہ جاؤ۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ اگر تمہیں زخم لگے ہیں تو ان کو بھی اس طرح کے زخم لگے ہیں۔ بنا بریں تمہاری سستی اور غم و اندوہ کی وجہ کیا ہے۔ بعض مفسرین اس آیت میں زخموں سے مراد کفار کے وہ زخم لیتے ہیں جو انہیں جنگ اُحد میں لگے تھے۔ لیکن پہلے تو یہ زخم مسلمانوں کے زخموں جیسے نہیں تھے۔ لہذا یہ لفظ مشلہ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے اور دوسرا یہ کہ یہ بچکے جملہ کے ساتھ بھی مناسبت نہیں کچھ جس کی تفسیر عقوبت آجائے گی۔

وتلك الايام نذ اولها بين الناس وليعلم الله الذين امنوا ويتخذ منكم شهداء

اس حصے میں پہلے ایک سنت الہی کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ انسانی زندگی میں تلخ و شیریں حوادث آتے رہتے ہیں کہ جن میں سے کسی کے لیے پائیداری نہیں ہے۔ فتوحات و ناکامیاں، قدرتیں اور ناتوانیاں سب کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ لہذا ایک میدان کی شکست اور اس کے آثار کو پائیدار نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ شکست کے عوامل اور اسباب کا مطالعہ کر کے ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے استفادہ کیا جائے اور اسے کامیابی سے بدلایا جائے دنیا میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور زندگی اپنے اصول کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے اور خدا ان ایام کو لوگوں کے درمیان گردش دیتا رہتا ہے تاکہ ان حوادث و واقعات میں سے سنت مکمل آشکار ہو جائے۔ لہذا ان ناگوار واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ "وليعلم الله الذين امنوا" یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ صاحبان ایمان افراد ایمان کے دعویداروں سے الگ ہو جائیں۔ دوسرے نظروں میں جب تک دردناک واقعات

۱۰ "ایام" "یوم" کی جمع ہے۔ "یوم" کا معنی ہے دن۔ "لوگوں کی کامیابی کے زمانے کو بھی ایام کہا جاتا ہے۔ "نذ اولها" "معاولہ" سے ہے اس کا معنی ہے ایک چیز کو مختلف لوگوں کے درمیان گردش دینا۔





کسی قوم میں واقع ذہنوں تو ان کی صفیں ایک دوسرے سے متنفس نہیں ہوں گی کیونکہ کامیابیاں لوگوں کو غفلت کی نیند سلا دیتی ہیں جب کہ شکستیں تیار افراد کے لیے بیدار کرنے والی ہوتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت کی نشاندہی کرتی ہیں۔

”وینتخذ منکم شہداء“ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس شکست کے نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ تم راہ اسلام میں شہداء میں اور قربانیاں پیش کرو اور جان لو کہ یہ پاک دین و آئین تمہیں مفت میں نہیں مل گیا مبادا آئندہ اسے تھوڑی سی قیمت پر ہاتھ سے دے بیٹھو۔ جو قوم مقدس مقاصد اور اہداف کے لیے قربانی دے، وہ انہیں کم تر سمجھتی ہے لیکن جب ان کے لیے قربانیاں دے تو پھر خود اور آئندہ نسلیں بھی انہیں عظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ لفظ شہداء سے مراد یہاں گواہ ہوں یعنی خدا چاہتا ہے کہ اس حادثہ سے تم میں سے کچھ گواہ لے کر کس طرح نافرمانیوں کا انجام شکست ہو کر رہا ہے اور آئندہ جب کبھی انہیں اس قسم کے حادثوں کا سامنا ہو یہ گواہ ان کے لیے معلم کا کردار ادا کریں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ خدا ظالموں کو درست نہیں رکھتا۔ اس لیے ان کی حمایت بھی نہیں کرے گا۔

### پرورش و تربیت کا میدان

ولیم حص الله الذین امنوا۔۔۔۔۔

”ولیم حص“ تمہیں کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک و صاف کرنا ”یمحق“ مادہ محق (بروزن مرد) سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کا آہستہ آہستہ کم ہونا۔ اسی مناسبت سے مہینے کی آخری رات کو ”محاق“ کہا جاتا ہے کیونکہ آہستہ آہستہ چاند کی روشنی کم اور ختم ہو جاتی ہے۔

اس آیت میں جنگ احد کے ایک اور فطری نتیجہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کی شکستیں جانتوں کی کمزوری اور میوب کے پہلو واضح کرتی ہیں اور ان میوب کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا چاہتا تھا کہ اس معرکہ حق و باطل میں باایمان افراد کو خالص قرار دے اور انہیں کمزوری کے نقاط کی نشاندہی کرے تاکہ وہ آئندہ کی اس قسم کی آزمائش کی کٹھالی سے گزر کر اپنی ہوشیاری کا اندازہ لگالیں جیسا کہ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

”فی قلب الاحوال یعد جواهر الرجال“

حالات کی دگرگونی اور زندگی کے کٹھن حوادث میں لوگوں کے جوہر کا پتہ چلتا ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں سے باخبر ہوتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں بعض شکستیں ایسی اصلاح پرورد ہوتی ہیں کہ جن کے اثرات انسانی معاشروں میں ظاہری خواب آور کامیابیوں سے کئی درجے زیادہ ہوتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تفسیر المنار کا مؤلف اپنے استاد مصر کے عظیم مفتی محمد عبدہ سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو خواب میں دیکھا اور آپ نے اس سے فرمایا کہ اگر مجھے میدان احد میں فتح و شکست کا متاثر قرار دیا جاتا تو میں اس میدان میں شکست کو ترجیح دیتا کیونکہ یہ شکست تاریخ اسلام میں ایک اصلاح کنندہ عامل بن گئی۔

ولیمحق الحاضریں

یہ جملہ درحقیقت پہلے جملہ کا نتیجہ ہے کیونکہ جب تو نہیں حوادث کی کٹھالی میں مضبوط اور پاک ہو گئے تو ان میں کفر و شرک کی برائی کو دور کرنے



اور اپنے معاشرہ کو ان گندگیوں سے پاک کرنے کی کافی آمادگی پیدا ہو گئی یعنی پہلے خود پاک ہونا چاہیے اور پھر دوسروں کو پاک کرنا چاہیے حقیقت میں جس طرح کر چاند اپنی جلوہ گرمی کے ساتھ آہستہ آہستہ کم روشن ہو جاتا ہے اور وہ حالت محاق میں چلا جاتا ہے، اسی طرح کفر و کفر اور ان کے حامیوں کی عظمت مسلمانوں کی مضبوطی اور پاکیزگی سے زوال پذیر ہو گئی۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما يعلم الله الذين جاهدوا منكم ويعلم الصابرين

قرآن مجید اقدس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایک فکری اشتباہ کی تصحیح کرتا ہے کہ تم یہ خیال کرتے ہو کہ جہاد میں استقامت کا مظاہرہ کیے بغیر بہشت بریں میں قیام پذیر ہو جاؤ گے کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ اس معنوی سعادت کے اندر داخل ہونا صرف مسلمان کہلانے یا عمل کے بغیر صرف عقیدہ سے ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو معاملہ نہایت سہل ہوتا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے اور جب تک حقیقی عقائد کی میدانِ عمل میں مکھی نہ ہو کوئی شخص بھی ان سعادتوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا آزمائش کی منزل پر (حق و باطل کی) صفیں ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتی ہیں اور مجاہد و مجاہد بے قیمت و بے ارزش افراد سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

## کھوکھلی باتیں

ولقد كنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوه فقد رايتموه وانتم تنظرون۔

جنگ بدر میں بعض مسلمانوں کی پر افتخار شہادت کے بعد بعض مسلمان جب باہم مل بیٹھے تو ہمیشہ شہادت کی آرزو کرتے اور کہتے کھل یہ اعزاز میدانِ بدر میں ہمیں بھی نصیب ہوتا۔ یقیناً ان میں کچھ لوگ سچے بھی تھے لیکن ان میں ایک جھوٹا گروہ بھی تھا جس نے اپنے آپ کو سب سے زیادہ بہر حال زیادہ وقت نہیں گزارا تھا کہ جنگ احد کا دشتناک معرکہ درپیش ہوا تو ان سچے مجاہدین نے بہادری سے جنگ کی اور جامِ شہادت نوش کیا اور اپنی آرزو کو پایا لیکن جھوٹوں کے گروہ نے جب لشکرِ اسلام میں شکست کے آثار دیکھے تو وہ قتل ہونے کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ آیت انہیں سرزنش کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تم ایسے لوگ تھے کہ جو دلوں میں آرزو اور تمنائے شہادت کے دعویدار تھے، پھر جب تم نے اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو کیوں بھاگ کھڑے ہوئے۔

## جنگ احد میں شکست کے اسباب کا مختصر جائزہ

اد پر کی آیات میں بعض ایسی قابل توجہ تعبیرات نظر آتی ہیں جن میں سے ہر ایک جنگِ احد کی شکست کے کسی نہ کسی راز سے پردہ اٹھاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ چند ایک ایسے عوامل موجود تھے کہ جن کی بنا پر یہ دغرائش اور عبرت آموز حادثہ رونما ہوا۔

۱ بعض نوسلوں میں معانیِ اسلام کے ادراک میں اشتباہ پیدا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ صرف ایمان کا اظہار ہی کامیابی کے لیے کافی ہے۔ لہذا تمام جنگوں میں نسبی امداد کے ذریعے خدا ان کی حمایت کرے گا۔ اس طرح انہوں نے کامیابی کے فطری عوامل صحیح منصوبہ سازی اور ضروری وسائل فراہم کرنے کے سلسلے میں سنتِ الہی کو پس پشت ڈال دیا۔

۲ فوجی نظم و ضبط کی پابندی نہ کرنا، پیغمبرِ اکرم کا تاکید فرمایا تھا کہ تیرا انداز اپنے حساس ہونے پر ڈٹے رہیں، اس فساد کی مخالفت اس شکست کا ایک موثر عامل بنی۔



۳ نو مسلموں کی دنیا پرستی کر جنہوں نے جنگی غنائم کی جمع آوری کو دشمن کا پھینکا کرنے پر ترجیح دی اور اسلام اتار کر قیمت حاصل کرنے کے لیے پل پڑے حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ راہِ خدا میں جہاد کرتے وقت ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔

۴ تکبر و غرور جو جنگِ بدر کی کامیابی سے پیدا ہوا تھا یہاں تک کہ وہ دشمن کی طاقت کو اپنے اذعان سے نکال بیٹھے تھے اور اس کے ساز و سامان کو معمولی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ اس شکست کا چوتھا اہم عامل تھا۔ یہ وہ کمزور پہلو تھے جنہیں اس شکست کے کھولتے ہوئے پانی سے دھونے کی ضرورت تھی۔

۱۳۳۔ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۗ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝

۱۳۴۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّوَجَّلاً ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝

ترجمہ

۱۳۳۔ محمد صرف خدا کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا انہیں قتل کر دیا جائے تو تم اٹھے پاؤں پھر جاؤ گے (اور ان کے فوت ہونے سے اسلام کو چھوڑ کر کفر و بت پرستی کے زمانہ کی طرف پلٹ جاؤ گے) اور جو شخص پلٹ جائے گا وہ ہرگز خدا کو کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا اور خدا تعالیٰ عنقریب شکر گزاروں (اور استقامت رکھنے والوں) کو جزا دے گا۔

۱۳۴۔ اور کوئی شخص علم خدا کے بغیر نہیں مرتا یہ معینِ خدا سر نوشت ہے (اس بنا پر غمناک اور دوسرے لوگوں کی وفات سنتِ الہی ہے) تو جو شخص بھی دنیا کا ثواب اور جزا چاہتا ہے (اور اپنی زندگی میں اس کے لیے کوشش کرتا ہے) تو اس میں کچھ نہ کچھ ہم سے دیں گے اور جو آخرت کا ثواب اور جزا چاہتا ہے تو اس میں اسے عطا کریں گے اور عنقریب شکر گزاروں کو جزا دیں گے۔





## شانِ نزول

یہ آیت بھی جنگ اُمد کے ایک حادثہ کے بارے میں ہے اور وہ یہ کہ جس وقت جنگ کی آگ مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان شعلہ زن تھی، اچانک ایک آواز بلند ہوئی اور کسی نے کہا: "میں نے محمد کو قتل کر دیا" میں نے محمد کو قتل کر دیا۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے جب ایک شخص عمرو بن قیس عمارثی نے ایک پتھر آنحضرت کی طرف پھینکا اور پیغمبر کی پیشانی اور دندان مبارک شہید ہو گئے، پتھر پھٹ گیا اور آپ کا رخسار مبارک لہو لہان ہو گیا۔ اس موقع پر سہرا ایک دشمن چاہتا تھا کہ آپ کو قتل کر دے۔ اس دور میں لشکر اسلام کے ایک اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار بن عمر نے ان کے حملوں کو تو روک دیا لیکن خود شہید ہو گیا۔ اس کی شکل چونکہ پیغمبر سے ملتی جلتی تھی تو دشمن نے یہی گمان کیا کہ پیغمبر خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں۔ یہ آواز فضا سے عالم میں گونج اٹھی اس آواز سے جناب بت پرستوں کے جذبات پر مثبت اثر پیدا ہوا اتنا ہی مسلمانوں میں عجیب اضطراب پیدا ہو گیا چنانچہ ایک کثیر گروہ کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے اور وہ بڑی تیزی سے میدان جنگ سے نکل گئے یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے سوچا کہ پیغمبر تو شہید ہو گئے ہیں لہذا اسلام ہی کو خیر باد کہہ دیا جائے اور بت پرستوں کے سرداروں سے امان طلب کر لی جائے لیکن ان کے مقابلے میں فداکاروں اور جانثاروں کی بھی ایک قلیل جماعت تھی جن میں حضرت علیؑ، ابو جہاد اور طلحہ جیسے بہادر لوگ موجود تھے جو باقی لوگوں کو پامردی اور استقامت کی دعوت دے رہے تھے۔ ان میں سے انس بن نضر لوگوں کے درمیان آیا اور کہنے لگا: اے لوگو! اگر محمد شہید ہو گئے ہیں تو محمد کا خدا تو قتل نہیں ہوا۔ چلو اور جنگ کرو اسی نیک اور مقدس ہدف کے حصول کے لیے درجہ شہادت پر فائز ہو جاؤ یہ گفتگو تمام کرتے ہی انہوں نے دشمن پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ تاہم جلد ہی معلوم ہو گیا کہ پیغمبر اکرمؐ سلامت ہیں اور اطلاع اشتباہی گئی تھی۔ مندرجہ بالا آیت اسی مقام پر نازل ہوئی اور اس نے پہلے گروہ کی مذمت کی۔

تفسیر

## شخصیت پرستی کی ممانعت

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل اذ ان مات او قتل انقلبتم على اعقابكم  
جنگ اُمد کے واقعات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ آیت مسلمانوں پر ایک اور حقیقت واضح کرتی ہے وہ یہ کہ اسلام شخصیت پرستی کا دین نہیں ہے اور فرض کر لیں کہ اگر پیغمبر اس میدان جنگ میں بام شہادت نوش فرماتے تب بھی مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ لڑائی کو جاری رکھتے کیونکہ پیغمبر کی (طبعی) وفات یا شہادت سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ابد تک باقی رہنے والا دین حق ہے۔ شخصیت پرستی ایک خطرناک مسئلہ ہے جو بامقصد لڑائی کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی خاص شخص چاہے وہ پیغمبر خاتم ہی کیوں نہ

۱۰ بعض تواریخ میں ہے کہ چند آدمیوں نے مل کر آنحضرتؐ پر حملہ کیا تھا جس کے نتیجے میں آپ کو زخم آئے۔



ہوں سے بے مقصد کی وابستگی کا معنی یہ ہے کہ جب وہ شخص اس دنیا سے چلا جائے تو پیشرفت کی کوشش اور اس کی تلاش ختم ہو سکتی ہے اور یہ وابستگی اجتماعی رشد و ترقی کے نہ ہونے کی ایک واضح نشانی ہے۔ شخصیت پرستی سے مقابلہ آپ کی حقانیت اور عظمت کی ایک اور نشانی ہے کیونکہ آپ نے اگر اپنی ذات کے لیے قیام کیا ہوتا تو آپ اس فکر کو لوگوں میں فروغ دیتے کہ تمام چیزیں ان کے وجود سے وابستہ ہیں اور اگر وہ درمیان سے چلے جائیں تو تمام چیزیں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ لیکن آپ جیسے صحیح اور سچے رہبر کبھی اس قسم کے انکار لوگوں میں پنپنے نہیں دیتے بلکہ نعمتی کے ساتھ ان کی بیخ کنی کرتے ہیں اور انہیں اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ ہمارا مقصد ہماری ذات سے بلند ہے اور وہ ہمارے چلے جانے سے نابود نہیں ہوگا۔ لہذا قرآن صراحت کے ساتھ اوپر کی آیت میں اعلان کرتا ہے کہ محمد صرف خدا کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں ان سے پہلے بھی بھیجے ہوئے افراد تھے جو دنیا سے چلے گئے۔ کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہوں تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور بت پرستی کا راستہ اختیار کرو گے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ آیت میں رجعتِ قہقہری (پہچھے کی طرف پلٹنے) کے لیے "انقلابتہ علی اعقابکم" کے الفاظ لائے گئے ہیں کیونکہ اعقاب جو کہ عقب (بروزنِ خشن) کی جمع ہے اس کا معنی ایڑی ہے اور یہ رجعتِ قہقہری کی واضح تصویر کشی ہے۔

ومن ینقلب علی عقبیہ فلن ینضر اللہ شیئا

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ پیچھے کی طرف پھر جائیں اور کفر و بت پرستی کے دور کی طرف لوٹ جائیں وہ صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں نہ کہ خدا کو۔ کیونکہ اس عمل سے نہ صرف ان کی نیک نیتی جاتی رہتی ہے بلکہ جو کچھ اب تک کما چکے ہیں وہ بھی تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھیں گے۔

وسیعزی اللہ الشاکرین

آیت کے آخر میں اس قبیل جماعت کی طرف اشارہ کیا گیا جو تمام مشکلات اور پیغمبرِ اکرم کی خبرِ شہادتِ امام ہونے کے باوجود جہاں سے دست بردار نہیں ہوئی۔ اس میں ان کی جدوجہد کو سراہا گیا ہے اور ان کا تعارف شاکرین اور نعماتِ الہی سے بہرہ ور ہونے والے اشخاص کے عنوان سے کرایا گیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: خدا ان شکر گزاروں کو اچھی جزا دے گا۔ اس آیت نے تمام مسلمانوں اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے شخصیت پرستی کا مقابلہ کرنے کا ایک نصیحت آموز درس دیا ہے کہ ہر مقصد مسائل کسی ایک یا کئی محدود اشخاص سے وابستہ نہیں ہوتے بلکہ وہ کئی ایک اصول اور ابدی پروگراموں کے گرد گھومتے ہیں اور افراد کے بدلنے یا ان کے فوت ہو جانے سے انہیں معطل نہیں ہونا چاہیے، چاہے وہ فرد خدا کے عظیم پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں اور اصولی طور پر ایک مذہب اور پروگرام کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے اس لیے کہ جو پروگرام اور مشن کسی شخص واحد سے مربوط ہوتے ہیں وہ تادیر نہیں رہتے بلکہ بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن انیسویں سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر اسلامی اداروں کے پروگرام ابھی تک اشخاص سے قائم ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ پارہ تکمیل تک نہیں پہنچتے۔ لہذا مسلمانوں کو چاہیے کہ درج بالا آیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف اداروں کی داغ بیل اس طرح ڈالیں کہ وہ لائق و فائق افراد سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں تاہم وہ کسی شخص سے وابستہ نہ رہیں۔

وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ مکتوبا متوجلا

بیا کہ کہا جا چکا ہے کہ میدانِ احد میں پیغمبر کی شہادت کی بے بنیاد خبر نے بہت سے مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں ڈال دیا



تک کہ وہ میدان چھوڑ گئے بلکہ بعض تو اسلام سے ہی علیحدہ ہونا چاہتے تھے اس لیے از سر نو اس آیت میں اس گروہ کو تنبیہ اور بیداری کے لیے ارشاد ہوا کہ موت خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ہاں ہر شخص کے لیے مقرر شدہ وقت ہے جس سے وہ بھاگ نہیں سکتا۔ بنا برآں اگر پیغمبر اس میدان میں جام شہادت نوش فرمائیے تو سوائے ایک سنت الہی انجام پانے کے اور کوئی بات نہیں تھی لیکن ان حالات میں مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ لڑائی جاری نہ رکھیں اور دوسری طرف میدان جنگ سے فرار موت سے غلامی نہیں دلا سکتا جیسا کہ میدان جنگ میں شریک ہونا بھی انسان کی موت کو پہلے نہیں لاسکتا۔ اس لیے جان کی حفاظت کے لیے میدان جنگ سے فرار صحیح معنی دار ہے؛ اہل اور اس طرح اہل "معتی" اور "معلق" کے درمیان فرق پر سورۃ انفصام میں ہم سیر حاصل تبصرہ کریں گے۔

وَمَنْ يَرِدْ ضَوَابَ الدُّنْيَا نَفُوتَهُ مِنْهَا وَمَنْ يَرِدْ ضَوَابَ الْآخِرَةِ نَفُوتَهُ مِنْهَا

آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ انسان کی کوشش کسی ضائع نہیں ہوتی۔ اگر کسی کا مقصد صرف مادی فوائد تک محدود ہو اور مقصد جنگِ اُحد کے بعض سپاہیوں کی طرح صرف مالِ فنیست جمع کرنا ہو تو بالآخر کچھ نہ کچھ اس سے بہرہ ور ہوگا لیکن اگر اس کا مقصد عظیم ہو اور حیاتِ جاودانی اور انسانی فضائل کی راہ میں کوشش کی جائے تو پھر بھی اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا۔ بنا برآں جب دنیا یا آخرت کا حصول دونوں ہی کوشش کے محتاج ہیں تو پھر انسان کیوں اپنے وجود کے سرمائے کو بلند ترین اور پائیدار راستہ میں صرف نہ کرے۔ اس کے بعد دوبارہ تاکید کیا گیا کہ ہم بہت جلد شکر گزاروں کو جزا دیں گے (وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ)۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں یہی جملہ فعلِ غائب کی شکل میں ذکر ہوا تھا اور یہاں فعلِ متکلم کی صورت میں ہے جس سے وعدہ خداوندی کی انتہائی تاکید ہوتی ہے اور سادہ الفاظ میں خدا کہتا ہے کہ ان کی جزا کا میں ضامن ہوں۔ تفسیر مجمع البیان میں امام باقر سے اس آیت کے ذیل میں منقول ہے:

حضرت علیؑ کو اُحد کے دن آٹھ زخم لگے تھے اور پیغمبر نے "ام سلیم" اور "ام عطیہ" کو حکم دیا کہ وہ دونوں حضرت علیؑ کے زخموں کا علاج کریں۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ حالت پریشانی میں آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کرنے لگیں کہ حضرت علیؑ کے بدن کی کیفیت یہ ہے کہ ہم جب ایک زخم باندھتی ہیں تو دوسرا کھل جاتا ہے اور ان کے بدن کے زخم اس قدر زیادہ اور خطرناک ہیں کہ ہم ان کی زندگی کے باسے میں پریشان ہیں تو حضرت رسولؐ خدا اور کچھ دیگر مسلمان حضرت علیؑ کی عیادت کے لیے ان کے گھر آئے جبکہ ان کے بدن پر زخم ہی زخم تھے تو پیغمبر اکرمؐ اپنے دست مبارک ان کے جسم سے مس کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو شخص ماہِ خدا میں اس حالت کو دیکھے وہ اپنی ذمہ داری کے آخری درجہ کو پہنچ چکا ہے اور جن جن زخموں پر آپؐ ہاتھ رکھتے تھے وہ فوراً ایل جاتے تھے تو اس وقت حضرت علیؑ نے فرمایا کہ الحمد للہ کہ ان حالات میں میں میدان جنگ سے نہیں بھاگا اور دشمن کو پشت نہیں دکھائی، خدا نے ان کی کوشش کی قدر دانی کی اور قرآن کی دو آیات میں آپؐ کی اور مجاہدین اُحد میں سے دیگر قابلِ تقلید افراد کی فداکاریوں کی طرف اشارہ کیا "وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ" اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوا (وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ)۔

۱۴۶ وَكَاتَيْنَ مِنْ نَبِيِّ قَتَلَ مَعَهُ رَبِّيُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ





## يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝

۱۳۷۔ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي

أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

۱۳۸۔ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحَسُنَ ثَوَابُ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ

الْمُحْسِنِينَ ۝

ترجمہ

۱۳۷ اور کتنے پیغمبر تھے جن کی معیت میں بہت سے خدا والوں نے جنگ کی تو انہوں نے راہ خدا میں پہنچنے والی مصیبت کے مقابلے میں سستی نہیں کی اور نہ وہ کمزور و ناتواں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے سر جھکایا اور خدا صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۳۷ ان کی گفتگو صرف یہ تھی کہ پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے کاموں میں زیادتی سے صرف نظر فرما ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کفار پر کامیابی عطا کر۔

۱۳۸ لہذا خدا نے دنیا اور آخرت کا حسن ثواب انہیں دیا اور خدا نیک کار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ زمانوں کے مجاہدین

و کائین من نبی ۔۔۔۔۔

”کائین“ کے معنی ہیں کتنے زیادہ اور ادب کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ لفظ کاف تشبیہ اور ”این“ سے مرکب ہے کہ جواب ایک ہی کلمہ بن چکا ہے اور پہلے اجزاء کا انفرادی معنی متروک ہو گیا ہے اور اس کا معنی ہو گیا ہے ”کتنے زیادہ“  
”رتیون“ ”رئی (بروزن بئی) کی جمع ہے اور ربی اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس کا خدا سے مضبوط اتصال ہو جو صاحب ایمان عالم صابر اور مخلص ہو۔

جنگ اُحد کے واقعات کے بعد اوپر کی آیت گذشتہ زمانہ کے مجاہدین اور اصحابِ انبیاء کی قوت، شجاعت و شہادت کی ایمان



اور استقامت کی یاد دلا کر مسلمانوں کو شجاعت اور فداکاری کی تشویق و ترغیب دلاتی ہے اور ضمنی طور پر میدان سے فرار کرنے والوں کی سرزنش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بہت سے انبیاء ایسے تھے جن کے یار و انصار کی صف میں خدا پرست مجاہد موجود تھے۔ اس کے بعد ان کا طرز عمل یوں بیان کرتی ہے، وہ انبیاء کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، بہت کٹھن مشکلات میں انہوں نے سستی اور ناتوانی نہیں دکھائی اور دشمن کے سامنے کبھی سرخم نہیں کیا اور نہ ہی اپنے آپ کو ان کے سپرد کیا ہے (ما ضعفوا و ما استکانوا) اور واضح ہے کہ خدا ایسے ہی افراد کو پسند کرتا ہے جو لڑائی میں چھپا نہیں دکھاتے (واللہ یحب الصابرين) وہ لوگ جو کبھی سستی یا فرار کی وجہ سے دشمن کے سامنے مشکلات میں گھبر جاتے تھے تو بجائے اس کے کہ میدان ان کے حوالے کر دیں یا اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں یا ان کے دماغ میں کفر و ارتداد کی غلش پیدا ہو، وہ بارگاہِ خداوندی سے صبر و استقامت اور پامردی کی درخواست کرتے تھے اور کہتے تھے "ربنا اغفر لنا ذنوبنا و اسرھنا فی امرنا و ثبت اقدامنا و انصرنا علی القوم الکافرين" پروردگارا! ہمارے گناہوں کو بخش دے ہماری جلد بازی سے درگزر فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھا اور ہمیں کافروں پر کامیابی عطا کر۔ وہ اس قسم کے طرز فکر عمل سے خدا سے جلد اپنی جزا اور ثواب حاصل کرتے تھے اس دنیا کی جزا بھی جو دشمن پر فتح و کامرانی ہے اور دوسرے جہاں کی جزا ثواب بھی۔ "فاتاھم اللہ ثواب الدنیا و حسن ثواب الاخرۃ"

آیت کے آخر میں انہیں نیکو کاروں میں شمار کر کے ارشاد ہوتا ہے: واللہ یحب المحسنین خدا نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ اس طرح سے خدا تازہ مسلمانوں کے لیے گزشتہ امتوں کے مجاہدین کے پروردگاروں اور مشکلات کے مقابلے میں ان کے طرز عمل کا ذکر ایک درس کے طور پر کر رہا ہے۔

اوپر کی آیات ان چیزوں کے علاوہ کئی اور نکات بھی واضح کرتی ہیں:

- ۱ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ صبر کے معنی میں استقامت و پامردی۔ اس لیے اس آیت میں اسے ضعف اور تسلیم کے مقابلے میں لایا گیا ہے اور بنیٰ ماصبرا اور نیکو کار ایک درجہ میں قرار پائے ہیں کیونکہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: واللہ یحب الصابرين اور دوسری آیت میں ہے واللہ یحب المحسنین۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ نیکو کاری صبر و استقامت کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ ہر نیکو کار شخص کے سامنے ہزار ہا مشکلات کھڑی ہیں۔ اگر اس میں استقامت نہ ہوگی تو وہ بہت جلد ہی اپنا کام چھوڑ دے گا۔
- ۲ حقیقی مجاہد بجائے اس کے کہ وہ اپنی شکست کا سبب دوسرے کو قرار دے یا اسے ذہنی عوامل کا نتیجہ قرار دے، وہ اپنی ذات میں اس کا سرچشمہ تلاش کرتے ہیں اور اپنے اشتباہات کی تلافی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ شکست کا لفظ اپنی زبان پر بھی نہیں لاتے اور اس کے بجائے اپنے نفسوں پر زیادتی کا ذکر کرتے ہیں بخلاف ہمارے کہ ہم آج کی دنیا میں کوشش کرتے ہیں کہ ضعف و کمزوری کے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیں جو ہماری ناکامیوں کا سرچشمہ ہیں اور ان سب کو فاجر جی اسباب کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کبھی ان کمزوریوں کو ختم نہیں کر سکتے۔
- ۳ درج بالا آیت میں دنیاوی جزا کو "ثواب الدنیا" کہا گیا ہے جبکہ آخرت کی جزا کو "حسن ثواب الاخرۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت کی جزا دنیاوی جزا سے بہت زیادہ امتیاز رکھتی ہے کیونکہ دنیاوی جزا اتنی ہی اچھی کیوں



نہ ہودہ آخر فنا ہو جائے گی اور ظلاف مزاج چیزوں کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی، جبکہ آخرت کی جزا سرتاپا بہتر، فاعل اور ہر قسم کی تکلیف سے پاک ہوگی۔

۱۴۹۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَسِرِينَ ○

۱۵۰۔ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ○

۱۵۱۔ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَهُمْ يَنْزِلُ بِهِ سُلْطَانٌ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ○

ترجمہ

۱۴۹۔ اے ایمان والو! اگر ان لوگوں کی اطاعت کرو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تمہیں پیچھے کی طرف دھکیں گے اور آخر کار تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔

۱۵۰۔ (وہ تمہارا سہارا نہیں ہیں) بلکہ تمہارا سہارا اور سرپرست خدا ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

۱۵۱۔ چونکہ وہ (کفار) بلا دلیل کچھ چیزوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں، اس لیے بہت جلد ان کے دلوں پر ہم رعب و خوف طاری کریں گے اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کا ٹھکانا کس قدر بُرا ہے۔

تفسیر

بار بار خطر سے آگاہی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَسِرِينَ

یہ آیات بھی گذشتہ آیات کی طرح جنگ اُحد کے واقعات کا تجزیہ و تحلیل کرتی ہیں اور اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جنگ اُحد کے ختم ہونے کے بعد دشمنان اسلام زہریلے پروپیگنڈا سے نصیحت کے بھیس میں مسلمانوں کے درمیان منافرت و اختلاف کا بیج بوتے تھے اور چند مسلمانوں کی نفیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں اسلام سے بدظن کرنا چاہتے تھے شاید یہودی اور عیسائی بھی اس کام میں منافقین کے شریک تھے۔ بیجا کہ جنگ اُحد میں بھی پیغمبر اکرمؐ کی شہادت کی بے بنیاد افواہ پھیلا کر مسلمانوں کی نفیاتی کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلی آیت مسلمانوں کو کفار کی پیروی کرنے سے ڈراتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تم کفار کی





ہیروئی کرو گے تو وہ تمہیں چھپے کی طرف دھکیں دیں گے اور تعلیمات اسلام کے زیر سایہ روحانی ہمنوی اور مادی ترقی کے بعد تمہیں پہلے نقطہ کی طرف گرا دیں گے جو کفر و فساد ہے اور اس وقت تمہیں بہت زیادہ نقصان پہنچے گا کیونکہ اس سے زیادہ خسارہ اور کیا ہوگا کہ انسان اسلام کو کفر سے اور سعادت کو شقاوت سے اور حق کو باطل سے بدل ڈالے۔

اس کے بعد انہیں تسلی دیتے ہوئے تاکید کی گئی ہے کہ تمہارا بہت بڑا مددگار موجود ہے (بیل اللہ مولانا محمد وحید الناصرین) خدا تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا، جبکہ دوسرے لوگ شکست و ہزیمت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔  
مسئلہ فی قلوب الذین کفروا الرعب۔

یہاں جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں کے مجبوزانہ طور پر نجات پانے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی نصرت و حمایت کا ایک موقع یاد دلاتا ہے۔ آئندہ کے لیے بھی ان کا جوش اُجبارا گیا ہے اور کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے کیونکہ جیسا بیان ہو چکا ہے کہ مکہ کے بُت پرست جنگ اُحد میں شاندار کامیابی حاصل کر چکے تھے اور ظاہراً لشکر اسلام مغلوب ہو چکا تھا اب چاہیے تو یہ تھا کہ وہ میدان کی طرف پلٹ آتے اور مسلمانوں کی باقی ماندہ قوت کو کچل دیتے، مدینہ کو تاخت و تاراج کرتے، پیغمبر کی بے بنیاد خبر شہادت سے مطلع ہونے کے بعد انہیں قتل کر دیتے اور اس بارے میں کسی شک و شبہ کو شکار نہ ہوتے لیکن خدا نے اُن کے دلوں میں ٹھیس خوف ڈال دیا ایسا خوف ہراس جو کفر و بت پرستی کا خاصہ ہے۔ یہ خوف اُن میں اتنا جاگزیں ہوا کہ روایات کے مطابق جس وقت وہ میدان اُحد سے پلٹ کر مکہ کے قریب پہنچے تو ایک شکست خوردہ لشکر کی صورت میں نظر آتے تھے۔ آیت کہتی ہے: ہم بہت جلد ہی کفار کے دلوں میں خوف ڈال دیں گے۔ (یعنی جس طرح جنگ اُحد کے موقع پر تم دیکھ چکے ہو) اسی طرح آئندہ کے لیے بھی یہی امید رکھو۔ قابل تو جبراً امر یہ ہے کہ ان کے دلوں میں رعب و خوف کا سبب یوں بیان کیا گیا ہے: بے اِشْرَکِوَا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یَنْزِلْ بِہِ سُلْطٰنًا یعنی اسی وجہ سے کہ انہوں نے بلا دلیل بہت سی چیزوں کو خدا کا شریک قرار دیا تھا۔ درحقیقت جو بے ہودہ لوگ دلیل و برہان کی پیروی نہیں کرتے اور رائی کو پہاڑ بنا لیتے ہیں اور پتھر اور لکڑی کو اپنا مبود سمجھتے ہیں وہ حوادثِ زمانہ کے مقابلے سے عاجز ہوتے ہیں کیونکہ وہ بہت جلد عاصی کے اشتباہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور زندگی میں کسی معمولی مادہ کا بھی سامنا نہیں کر پاتے۔ مثال کے طور پر وہ یہ سن لیں کہ مدینہ کے مسلمان جنگ اُحد کے زخمیوں کو ساتھ لے ہوئے دوبارہ میدان اُحد میں پلٹ آئے ہیں تو یہ بات ان کی نگاہ میں بہت بڑی ہوتی ہے اور وہ اس سے لرزہ برانداز ہو جاتے ہیں جیسا کہ آج کی دنیا میں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار معمولی سے واقعہ پر پریشان ہو جاتے ہیں اور رائی کو پہاڑ سمجھ لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے لیے حکم اور ضبوط سہارے کا انتخاب نہیں کیا ہوتا۔

وَمَا وَہَمَ النَّارُ وَّبَتَسْ مَشْوٰی الظّٰلِمِیْنَ

یہ افراد اپنے اور معاشرے پر ظلم کرتے ہیں اس بنا پر ان کے لیے سوائے (جہنم کی) آگ کے کوئی پناہ گاہ نہیں اور وہ کسی بڑی پناہ گاہ ہے۔

دشمن کا خوفزدہ ہونا کامیابی کا ایک راستہ ہے

بہت سی روایات میں ملتا ہے کہ پیغمبر اکرم فرمایا کرتے تھے کہ خداوند عالم کی طرف سے مجھے عطا کی گئی خصوصیات میں سے ایک



یہ ہے کہ وہ دشمن کے دل میں خوف ڈال کر مجھے کامیابی سے نوازتا ہے۔

یہ بات جنگ میں کامیابی کے ایک اہم عامل کی طرف اشارہ ہے جو آج کل کے زمانہ میں خصوصاً توجہ کے لائق ہے کہ کامیابی کا اہم ترین عامل مجاہد کا جذبہ ہوتا ہے اور جتنا موثر یہ عامل ہے اتنا ان کی افرادی قوت اور ساز و سامان کی زیادتی بھی موثر نہیں۔ اسلام روح ایمان کو تقویت بخشتا ہے جہاد کے لیے عشق و دلولہ پیدا کرتا ہے۔ اعزاز شہادت کی تمنا پیدا کرتا ہے اور فدا گئے قادر پرچہ بوسہ کرنا سکھاتا ہے اسلام اس روح اور جذبے کی پرورش اپنے مجاہدین میں اعلیٰ ترین طریقہ سے کرتا ہے۔ جبکہ خرافات کے متوالے بت پرست جن کا سہارا بے شعور و بے ارادہ اور بے جان بت تھے اور جو معاد و قیامت اور حیات بعد موت کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، جن کے افکار یہود و گیوں سے آلودہ تھے ان کا جذبہ کمزور اور ناتواں تھا اور مسلمانوں کی ان پر کامیابی کا موثر عامل یہی روحانی امتیاز تھا۔

۱۵۶۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحْسَبُونَهُمْ بِأَذْنِهِ حَتَّى إِذَا فِشَلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مَن بَعْدَ مَا آرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ مِّنكُمْ مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُمْ مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ○

۱۵۳۔ إِذْ تَصْعِدُونَ وَلَا تُلُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلًا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا آصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○

۱۵۴۔ ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنًا نَّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قَتَلْنَا هُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ

۱۵۳۔ کتاب نضال اور مجمع البیان سے مجموع کیجئے۔



مَصْنَا جَعِدُمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ ۖ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ  
وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

ترجمہ

۱۵۲ ندانے تم سے اپنا وعدہ (جنگ اُحد میں دشمن پر کامیابی کا) پچ کر دکھایا جبکہ (ابتداءً جنگ اُحد میں) تم دشمنوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے (اور یہ کامیابی جاری تھی) یہاں تک کہ تم سست ہو گئے اور (مورچوں کو چھوڑنے لگے اور) آپس میں نزاع کرنے لگے اور جو (دشمن پر غلبہ) تم چاہتے تھے وہ تمہیں دکھایا لیکن اس کے بعد تم نے نافرمانی کی۔ تم میں سے بعض دنیا کے خواہشمند تھے اور بعض آخرت کے خواہاں تھے پھر خدا نے تمہیں ان سے پھیر دیا (اور تمہاری فتح شکست سے بدل گئی) تاکہ تمہارا امتحان لے اور اس نے تمہیں معاف کر دیا اور خدا مومنین کے لیے فضل کرنے والا اور نیشنے والا ہے (یاد کرو وہ وقت) جب تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے (اور تمہارا ایک گروہ بیاباں میں بکھرا ہوا تھا) اور تم پیچھے رہ جانے والوں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور پیغمبر پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے۔ اس کے بعد تم پر پے در پے مصائب آئے اور یہ اس لیے تھا (تاکہ جنگی غنائم کے) ہاتھ سے چلے جانے سے تم غلگین نہ ہو اور نہ ہی ان آلام کی وجہ سے جو تم پر آئے ہیں اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

۱۵۳ پھر اس غم و اندوہ کے بعد امن و آرام کا تم پر سایہ نازل کیا اور یہ ایک اونگھ کی صورت میں تھا جو (واقعہ اُحد کی بعد والی رات میں) تم میں سے ایک گروہ کو عارض ہوئی تھی لیکن ایک دوسرے گروہ کو اپنی جان کی فکر تھی (اور انہیں نیند نہیں آئی تھی) وہ لوگ خدا کے بلے میں زمانہ جاہلیت کے سے بُرے گمان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا کامیابی کا کچھ حصہ نہیں نصیب ہو گا۔ کہہ دو: تمام (کامیابیاں اور) کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ اپنے دل میں کچھ باتیں چھپائے ہوئے ہیں جن کا تمہارے سامنے اظہار نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کامیابی میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو ہم قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو: اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو وہ لوگ کہ قتل ہونا جن کی قسمت میں تھا، وہ (دشمن) ان کے بستروں پر آ پڑتے (اور انہیں قتل کر دیتے) اور یہ اس لیے کہ خدا تمہارے سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کی آزمائش کرے اور تمہارے دلوں میں جو (ایمان) ہے اس کے غلوس کو پرکھے۔ اور تمہارے سینوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے باخبر ہے۔





تفسیر

## کامیابی کے بعد شکست

جنگِ اُحد کے واقعات میں گزر چکا ہے کہ مسلمان ابتداً جنگ میں اتحاد اور بڑی دلیری کے ساتھ لڑے اور بلکہ ہی کامیاب ہو گئے اور دشمن کا لشکر پراگندہ و منتشر ہو گیا جس سے سارے لشکرِ اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن کوہِ عینین کے دوسے میں عبداللہ بن جبیر کی سرکردگی میں لڑنے والے تیر اندازوں کی نافرمانی اور ان کے اس حساس مورچے کو چھوڑنے اور دوسرے لوگوں کی مالِ غنیمت جمع کرنے کی مشغولیت سے ورقِ ہی اُلٹ گیا اور لشکرِ اسلام ایک زبردست شکست سے دوچار ہوا۔

کافی شہید دے کر اور بہت نقصان اٹھا کر جب مسلمان مدینہ کی طرف پلٹ آئے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کیا خدا نے ہم سے فتح و کامیابی کا وعدہ نہیں کیا تھا، پھر اس جنگ میں ہمیں کیوں شکست ہوئی؟ اس پر مندرجہ بالا آیات میں انہیں جواب دیا گیا اور شکست کے اسباب کی نشاندہی کی گئی۔ اب ہم آیات کی تفصیلی تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعِدَهُ إِذْ تَحْسَبُونَهُمْ بَاذِنَهُ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ<sup>۱</sup>

اس جملہ میں ارشادِ خداوندی ہے کہ کامیابی کے بارے میں خدا کا وعدہ بالکل درست تھا اور اس کی وجہ ہی سے تم ابتداً جنگ میں کامیاب ہوئے اور حکمِ خدا سے تم نے دشمن کو تتر بتر کر دیا۔ کامیابی کا یہ وعدہ اس وقت تک تھا جب تک تم استقامت و پامردی اور فرمانِ پیغمبر کی پیروی سے دست بردار نہیں ہوئے اور شکست کا دروازہ اس وقت کھلا جب سستی اور نافرمانی نے تمہیں آگھیرا۔ یعنی اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کامیابی کا وعدہ بلا شرط تھا تو تمہاری بڑی غلط فہمی ہے بلکہ کامیابی کے تمام وعدے فرمانِ خدا کی پیروی کے ساتھ مشروط ہیں۔ البتہ یہ کہ خدا نے مسلمانوں سے اس جنگ میں کامیابی کا وعدہ کب کیا تھا، اس بارے میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ مراد عمومی وعدے ہیں جو خدا کی طرف سے مسلمانوں کو دشمنوں پر کامیابی کے بارے میں دیتے جا چکے تھے دوسرا یہ کہ پیغمبر خدا صریحی طور پر جنگِ اُحد سے پہلے وعدہ دے چکے تھے اور ان کا وعدہ خدا کا وعدہ ہے۔

وَتَنَزَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا أَرْسَلْنَاكُمْ مَاتِحِبُونَ

اس میں کوہِ عینین کے تیر اندازوں کی طرف اشارہ ہے اور ان کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ تیر انداز جو پہاڑ کے دوسے پر تھے ان میں مورچہ چھوڑنے کے بارے میں اختلاف پڑ گیا اور ان میں بیشتر نے نافرمانی اور مخالفت کی اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ جیسی تمہاری آرزو تھی ویسی ہی نظروں میں سما جانے والی کامیابی دیکھ لینے کے بعد تم نے راہِ عصیان اختیار کی اور حقیقت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تم نے جو لازمی تھی وہ کوشش کی لیکن اس کو برقرار رکھنے کے لیے تم نے استقامت و پامردی نہیں دکھائی اور ہمیشہ

۱۔ تَحْسَبُونَهُمْ۔ ماہِ حَس سے ہے۔ اس کا معنی ہے کسی کے خواں ختم کر دینا اور اسے قتل کر دینا۔ یعنی تم انہیں قتل کرتے تھے۔

۲۔ إِذَا۔ یہاں پر شرط نہیں "میں" اور "وقت" کے معنی میں ہے۔



کامیابیوں کی حفاظت کرنا ان کے حصول سے زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے۔

منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الاخرة

اس موقع پر تم میں سے ایک گروہ دنیا پاہتا تھا وہ مالِ قیمت اکٹھا کرنے لگا جب کہ دوسرا گروہ جس میں عبداللہ بن جبر اور دیگر تیر انداز شامل تھے جو ثوابِ قدم رہے وہ آخرت اور خدائی جزا و ثواب کے خواہاں تھے۔

ثم صرفکم عنہم لیبیت لیکم

یہاں ورق اٹ گیا اور خدانے تمہاری کامیابی کو شکست سے بدل ڈالا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور تمہیں تنبیہ کرے اور تمہاری تربیت کرے۔

ولقد عفا عنکم و اللہ ذو فضل علی المؤمنین

اس کے بعد خدانے تمہاری ان سب نافرمانیوں سے درگزر کیا جبکہ تم سزا کے مستحق تھے کیونکہ خداوند عالم مؤمنین کے لیے ہر قسم کی نعمتوں کو فروگذار نہیں کرتا۔

اذ تصعدون ولا تلون علی احد و الرسول یدعوکم فی اخرکم ثم

اس آیت میں خدا تعالیٰ مسلمانوں کے لیے جنگِ احد کے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے اور فرماتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب تم ہر طرف منتشر تھے اور بھاگ رہے تھے اور پیچھے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ تمہارے باقی بھائی کس حالت میں ہیں جبکہ غیر مجھے سے تمہیں پکار رہے تھے: "الٰہی عباد اللہ الٰہی عباد اللہ فانہ رسول اللہ" خدا کے بند و میری طرف پلٹ آؤ میری طرف پلٹ آؤ میں خدا کا رسول ہوں لیکن تم میں سے کوئی ان کی پکار پر کان نہیں دھرتا تھا۔

فانابکم غما بغیر

اس وقت یکے بعد دیگرے غم و اندوہ تم پر ٹوٹے کیونکہ تم ایک طرف جنگ میں شکست، کئی افسروں اور بہادر سپاہیوں کی شہادت اور کئی زخمیوں کے غم میں مبتلا تھے تو دوسری طرف پیغمبر اکرم کی خبر شہادت کے پھیل جانے کی پریشانی اور پھر ان کے نبی ہونے کا غم تھا اور یہ سب کچھ مخالفوں اور نافرمانیوں کا نتیجہ تھا۔

لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم و لا ما اصابکم

غم و اندوہ کا یہ سیلاب اس لیے تھا تاکہ اب تم مالِ غنیمت ہاتھ سے جانے پر غمگین نہ ہونے پاؤ اور کامیابی کی راہ میں جو مشکلات اور زخم تمہیں پہنچے ہیں ان کی فکر کرو۔

واللہ خبیر بما تعملون

لہ نضعدون مادہ اعداد سے ہے۔ مفردات میں راضب کے بقول اس کا معنی ہے سطح زمینوں پر چلنا یا اوپر کی طرف جانا جبکہ معبود کا معنی صرف

اوپر کی طرف جانا ہے۔ آیت میں یہ لفظ شاید اس لیے آیا ہے کہ جہاں گئے والوں میں کچھ پہاڑ پر چڑھے گئے تھے اور بعض بیابان میں سرگرداں تھے۔

لہ "اخرویکم" یہاں "وذاکم" کے معنی میں ہے یعنی تمہارے پیچھے۔



خدا تمہارے اعمال سے آگاہ تھا اور پوری طرح سے اطاعت کرنے والوں، حقیقی مجاہدین اور اسی طرح بھاگنے والوں کی کیفیت کو جانتا تھا۔ بنا بریں تم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو فریب زدے اور جو کچھ جنگ اُحد میں ہوا ہے اس کے برخلاف دعویٰ نہ کرے اور اگر واقعات پہلے گروہ میں داخل ہو تو خدا کا شکر ادا کرو ورنہ گناہوں سے توبہ کرو۔

### زمانہ جاہلیت کے دوسرے

ثم انزل عليكم من بعد الغم امنة ناعسا<sup>١</sup>

واقعات اُحد کے بعد والی رات بہت دردناک اور اضطراب انگیز تھی۔ مسلمان سمجھتے تھے کہ قریش کے فاتح سپاہی دوبارہ مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے اور مسلمانوں کے باقی ماندہ مقابلے کی طاقت ختم کر دیں گے اور شاید کسی طور پر بت پرستوں کے واپس آنے کی خبر بھی انہیں پہنچی تھی اور یہ مسلم تھا کہ اگر وہ پلٹ آتے تو جنگ کا خطرناک ترین مرحلہ پیش آتا۔ اس دوران حقیقی مجاہدین اور فرار کرنے والوں میں سے پشیمان افراد جنہوں نے توبہ کر لی تھی اب پروردگار کے نطف و کرم پر اعتماد رکھتے تھے اور آئندہ کے لیے پیغمبر اکرم کے وعدوں پر مطمئن تھے۔

اس حالت وحشت میں وہ آرام کی نیند سو گئے تھے جبکہ جنگی لباس میں ملبوس اور ہتھیاروں سے ایسے تھے لیکن منافق ضعیف الایمان اور بزدل گروہ ساری رات نکل و پریشانی میں مبتلا رہا اور بادلِ سخاوت حقیقی مومنین کی پہرہ داری کرتا رہا۔ درج بالا آیت رات کی اس کیفیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتی ہے کہ پھر اُحد کے دن کے ان تمام غم و اندوہ کے بعد تم پر امن و امان اور راحت و آرام نازل کیا اور یہ وہی ہلکی چھلکی نیند تھی جو تم میں سے ایک گروہ کو آئی۔ لیکن ایک ایسا گروہ بھی تھا کہ جسے صرف اپنی جان کی فکر تھی وہ لوگ سوائے اپنی جانیں بچانے کے اور کوئی چیز نہیں سوچتے تھے۔ اس لیے وہ راحت و آرام سے محروم ہو گئے تھے۔

یہ ایمان کا ایک اہم ترین ثمرہ ہے کہ مرد مومن اس دنیا میں بھی راحت و آرام سے رہتا ہے جبکہ بے ایمان یا منافق اور کمزور ایمان والے افراد کبھی بھی اس کا ذائقہ نہیں چکھتے۔ بعد ازاں قرآن منافقین اور کمزور ایمان والے لوگوں کی گفتگو اور طرز فکر کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے: يظنون بالله غير الحق ظن الجاهلية<sup>٢</sup> وہ خدا کے بارے میں زمانہ جاہلیت کا غلط اور ناحق گمان رکھتے اور اپنی گفتگو میں کہتے کہ شاید پیغمبر کے وعدے غلط ہی ہوں اپنے آپ کو یا ایک دوسرے کو کہتے تھے: هل لنا من الامر من شيء<sup>٣</sup> یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ اس دنیا میں کیفیت کے بعد ہمیں کامیابی نصیب ہو یعنی بہت ہی بعید یا ناممکن ہے۔ قرآن اُن کو جواباً کہتا ہے: قل ان الامر كله لله<sup>٤</sup> کہہ دو، جی ہاں! کامیابی تو خدا کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ چاہے اور تمہیں اس لائق سمجھے تو تمہیں کامیابی نصیب کرے۔ وہ اب بات کو ظاہر کرنے کے لیے تید نہیں تھے جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے کیونکہ وہ اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں کفار کی صف میں ان کا شمار نہ ہو۔

يخفون في انفسهم ما لا يبذون لك

١ امنة، کا معنی ہے امن و امان اور نعاس کا مطلب ہے ہلکی سی نیند یا ادبگھ۔





گویا ان کا خیال تھا کہ جنگ اُحد کی شکست دین اسلام کے ناسخ ہونے کی علامت ہے۔ اسی لیے وہ کہتے تھے: لو کان لنا من الامر شیء ما قتلنا ہلہنا۔ یعنی اگر ہم حق پر ہوتے اور کامیابی ہمارے نصیب میں ہوتی تو یہاں ہمارے اتنے لوگ نہ مارے جاتے۔ نہ! وند عالم ان کے جواب میں دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلے یہ کہ یہ تصور نہ کر دو کہ کوئی شخص میدان جنگ کے سخت حوادث سے بھاگ کر موت سے بچ سکتا ہے (جبکہ ان کا استقبال کرنا چاہیے) جن کی اہل آگنی ہے پانچ وہ اپنے گھروں میں رہ جائیں ان کے بستر پر دشمن آپڑیں گے اور انہیں قتل کر دیں گے (قل لو کنتم فی بیوتکم لہربذ الذین کتب علیہم القتل الی مضا جمعہم)

اصولی طور پر وہ قوم جس کی اکثریت کے خلاف شکست کا فیصلہ اُس کی سمستی کی وجہ سے کیا گیا ہو وہ آخر کار موت کا ذائقہ چکھے گی تو کیا ہی اچھا ہے کہ وہ میدان جہاد میں دشمن کی ضرب سے پُر افتخار مقابلے میں اُسے بیک کہے نہ یہ کہ بستر پر ذلت آمیز فرقت سے اُس کا کام تمام کر دیا جوقہ دوسرا یہ کریرہ حوادث رونما ہونے چاہئیں تاکہ دلوں میں جو کچھ ہے وہ آشکار ہو جائے۔ ملا وہ ازیں لوگوں کی آہستہ آہستہ تربیت ہو اور ان کی نیتیں خالص، ایمان پختہ اور دل پاک ہوں (ولیبتلنی اللہ ملفاً صدورکم لہم صغافی قلوبکم۔ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: و اللہ علیہم بذات الصدور یعنی خدا سینوں کے بھیدوں کو جانتا ہے یہی بنا پر وہ صرف لوگوں کے اعمال پر نگاہ نہیں رکھتا بلکہ وہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں کو بھی آزمائے اور انہیں شرک، نفاق، شک اور تردّد کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک کرے۔

۱۵۵۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ التَّقِی الْجَمْعِیْنِ اِنَّمَّا اسْتَزَلَّہُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْہُمْ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ

ترجمہ

۱۵۵ وہ لوگ جنہوں نے دو گروہوں کے آمنے سامنے ہونے کے دن (جنگ اُحد کے روز) فرار کیا، انہیں شیطان نے اُن کے چند گناہوں کی وجہ سے بہکا دیا اور خدا نے انہیں معاف کر دیا خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔

تفسیر

ایک گناہ دوسرے گناہ کا سرچشمہ ہے

ان الذین تولوا منكم

یہ آیت بھی جنگ اُحد کے واقعات سے متعلق مسلمانوں سے ایک اور حقیقت بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ جو لغزشیں انسان سے شیطانی دوسروں کے باعث صادر ہوتی ہیں، وہ دراصل ان گذشتہ گناہوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی روحانی کمزوریوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جو انسان کے لیے دوسرے گناہوں کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ ورنہ پاک و پاکیزہ دل میں شیطانی توہمات کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔



اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو میدان اُعد سے فرار کر گئے شیطان نے انہیں چند ایک گناہوں کی وجہ سے پھلادیا مگر خدا نے انہیں بخش دیا اور خدا بخشنے والا اور علیم ہے۔ یوں خدا اُن کی آزمائش کرتا ہے تاکہ وہ آئندہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے کوشش کریں وہ پہلے اپنے دل کو گناہ سے پاک کریں۔ اس بات کا امکان ہے کہ اس گناہ سے مراد وہی دنیا پرستی، مال نفیست کو جمع کرنا اور دوران جنگ پیغمبر کی حکم عدولی کرنا ہو یا دوسرے گناہ مراد ہوں جن کے وہ جنگ اُعد سے پہلے مرتکب ہوئے تھے اور انہوں نے ان کی ایمانی قوت کمزور کر دی تھی مفسر عظیم مرحوم طبری اس آیت کے ذیل میں ابو القاسم بلخی سے نقل کرتے ہیں کہ جنگ اُعد کے دن (پیغمبر کے علاوہ) سوائے تیرہ افراد کے تمام بھاگ گئے تھے اور ان تیرہ میں سے آٹھ انصار اور پانچ مہاجر تھے۔ جن میں سے حضرت علی اور طلحہ کے علاوہ باقی ناموں میں اختلاف ہے البتہ دونوں کے بارے میں تمام کا اتفاق ہے کہ انہوں نے فرار نہیں کیا۔

۱۵۶۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذ ضُرِبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ

حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يَحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ  
۱۵۷۔ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مِتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ

مِمَّا يَجْمَعُونَ

۱۵۸۔ وَلَئِن مِّتُّمَّ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تَحْشَرُونَ

ترجمہ

۱۵۶ اسے ایماندارو! تم کفار کی مانند نہ ہو جاؤ کہ جب اُن کے بھائی سفر پر یا جنگ کے لیے جاتے ہیں (اور مریاتے ہیں یا قتل ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور قتل نہ ہوتے (تم ایسا نہ کہو) تاکہ خدا یہ حسرت اُن کے دلوں میں رکھ دے اور زندہ کرنے والا اور مارنے والا خدا ہے (اور زندگی اور موت اُس کے ہاتھ میں ہے) اور وہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

۱۵۷ (اب) اگر تم راہِ خدا میں قتل ہو جاؤ یا مریاؤ (تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا) کیونکہ خدا کی رحمت اور مغفرت ان تمام چیزوں سے جو انہوں نے (ساری زندگی میں) جمع کیا ہے بہتر ہے۔

۱۵۸ اور اگر تم مریاؤ یا قتل ہو جاؤ تو خدا کی طرف پلٹ جاؤ گے (لہذا تم فنا نہیں ہو گے کہ اس سے تم پریشان ہو)۔



تفسیر

## منافقین کی مفاد پرستی

یا ایہا الذین امنوا لا تکونوا کالذین کفروا.....

واقعہ اُحد و بعاث سے مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے پہلی بیکریہ واقعہ اس وقت کے تمام حالات و کیفیات کا آئینہ دار ہے جس میں مسلمانوں کی حتمی صورت حال کی عکاسی ہوتی ہے اور انہیں اپنی کیفیت کی اصلاح کرنے پر ابھارا گیا اور کمزور پہلوؤں کو بہتر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے اس واقعہ کو نہایت اہتمام سے بیان کیا ہے۔ بہت سی گزشتہ اور آئندہ آیات میں بھی اس واقعے سے تربیت کے لیے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ واقعہ دشمنوں اور منافقوں کے لیے زہر پاشی کا کام دیتا تھا اس لیے بہت سی آیات میں اس کو زائل کیا گیا ہے مندرجہ بالا آیات بھی ایسی ہی ہیں۔

مذکورہ بالا آیات منافقین کی تخریبی کارروائیوں کو ناکام بنانے اور مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے پہلے صاحب ایمان افراد سے خطاب کرتی ہیں کہ تم کفار کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جس وقت ان کے بجائی سفر بلیگ لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور وہ قتل ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ افسوس اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو زمر تھے اور زمر قتل ہوتے۔ اگرچہ وہ یہ باتیں ہمدردی کے بھیس میں کرتے ہیں لیکن تم ان زہر ملی باتوں سے بچو اور ایسے جملے زبان پر نہ لاؤ۔

لیجعل اللہ ذلک حسرة فی قلوبہم :

اگر تم مومنین ان کی گمراہ کن باتوں سے متاثر ہوئے اور ایسی ہی باتیں کہیں تو فطری طور پر تمہارے جذبے ماند پڑ جائیں گے اور میدان جنگ کی طرف جانے سے اور راہ خدا میں سفر سے رک جاؤ گے اور اس طرح لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن تم ایسا نہ کرو اور مضبوط جذبے کے ساتھ میدان جہاد میں جاؤ تاکہ ایسی حسرت منافقین کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے رہ جائے۔ اس کے بعد قرآن ان کی زہر آلود باتوں کے تین منطقی جواب دیتا ہے :

- ۱ موت و حیات ہر حالت میں اللہ کے دست قدرت میں ہے، سفر اور جنگ کرنے سے اس کی قطعی و یقینی حالت نہیں بدل سکتی اور خدا بندوں کے سب اعمال سے آگاہ ہے (و اللہ یحی و یمیت و اللہ بما تعملون بصیر)۔
- ۲ اب اگر تم راہ خدا میں مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ اور منافقین کے خیال کے مطابق تم پر موت جلد اُڑے تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ پروردگار کی رحمت و مغفرت ان اموال سے بدرجہا بہتر ہے جو تم یا منافقین اپنی زندگی میں جمع کرتے ہیں (ولئن قتلتم فی سبیل اللہ او متتم لمغفرة من اللہ و رحمۃ خیر مما یجمعون)۔ اصولی طور پر ان دونوں کا آپس میں تقابل نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ان کی پست ذہنیت مال و دولت اور چند روزہ زندگی کو اعزاز جہاد و شہادت پر ترجیح دیتی تھی، اس لیے اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا کہ کہا جاتا کہ جن اموال کو کفار شہوت بھری زندگی اور دنیا پرستی کے جنون میں جمع کرتے ہیں، اس سے وہ اعزاز و حاصل کہیں بہتر ہے جو تم راہ شہادت اور راہ خدا میں مرجانے سے پاتے ہو۔





موت کا معنی فنا اور نابودی نہیں ہے جس سے تم اتنے پریشان ہوتے ہو بلکہ موت دوسری زندگی کے لیے ایک درپہ ہے جو بہت وسیع اور بادل ہے (ولئن متداو قتلتم لا الی اللہ تحشر و ان)۔ مقابل تو میر نکتہ یہ ہے کہ ان آیات میں سفر میں مرجانے کو شہادت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان سفروں سے مراد وہ سفر تھے جنہیں وہ خدا کے لیے کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر میدان جنگ یا بلینی پروگراموں کے لیے سفر کرنا وغیرہ۔ اس دور کے سفر مشکلات و مصائب سے پڑتے تھے بیماریاں بھی آگھیرتی تھیں لہذا ان میں مرجاننا میدان جہاد میں مرنے سے کم نہیں ہوتا تھا بلکہ بعض مفسرین نے اس سے تجارتی سفر مراد لیا ہے لیکن یہ معنی اس آیت سے بہت بعید ہے کیونکہ یہ حصول مال کا ایک ذریعہ تھا اور کافروں کو ایسے سفر پر کیا افسوس ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں میں کمزوری پیدا کرنے کے لیے مؤثر نہیں ہو سکتی تھی نیز اس سلسلے میں مسلمان اگر کافروں سے ہم آہنگ نہ ہوں تو یہ ان کے لیے باعث حسرت و یاس نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا یہاں سفر میں مرنے سے مراد وہ سفر ہے جو میدان جہاد کی طرف تھا یا دیگر اسلامی مقاصد کے لیے۔

۱۵۹۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ۗ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَأَنفَضُوا مِنْ حَوْلِكَ ۗ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝  
 ۱۶۰۔ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرْكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝

ترجمہ

۱۵۹ رحمت الہی کے سبب تم ان کے سامنے نرم (اور مہربان) ہو اور اگر تم سخت خو ہوتے تو وہ تم سے دور ہو جاتے لہذا انہیں معاف کر دو اور ان کے لیے مغفرت طلب کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو لیکن مصمم ارادہ کرو تو دھچکڑا جاؤ اور خدا پر توکل کرو کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔  
 ۱۶۰ اگر خدا تمہاری مدد کرے تو کوئی بھی تم پر غلبہ نہیں پاسکتا اور اگر وہ تمہاری مدد سے دستبردار ہو جائے تو اس کے علاوہ کون تمہاری مدد کرنے والا ہے اور مومنین کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیے۔



## تفسیر

## ام معافی کا حکم

فِي مَا أَحْمَدُ مِنَ اللَّهِ لَنْتَ لَهُم

اگرچہ اس آیت میں گرد و پیش کے حوالے سے عمومی پروگراموں سے متعلق کام پیچیدہ کو دیکھ گئے لیکن شانِ نزول کے لحاظ سے اس کا تعلق جنگِ اُمد کے ساتھ ہے کیونکہ جو لوگ واقعہ اُمد کے دوران جنگ سے فرار ہو گئے تھے، وہ پیغمبر کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے ہمدردی و پشیمانی کے عالم میں معافی کی درخواست کی تو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں پیغمبر اکرم سے انہیں عام معافی دینے کے لیے فرمایا لہذا یہ آیت نازل ہوتے ہی آپ نے فراخ دلی سے توبہ کرنے والے خطاکاروں کو معاف کر دیا۔

درج بالا آیت میں پیغمبر اکرم کی ایک بہت بڑی اخلاقی خوبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم پروردگار کے لطف و کرم کے سبب ان پر نہر بان ہو گئے اور اگر تم ان کے لیے سنگین، سخت مزاج اور تند خو ہو نے اور علماء ان پر لطف و عنایت نہ کرتے تو وہ تمہارے پاس سے بکھر جاتے۔ غلطی — لغت میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی باتیں تیز اور سخت ہوں اور غلیظ القلب اسے کہتے ہیں جو سنگدل ہو اور لطف و محبت کا عملی اظہار بھی نہ سکے۔ اس بنا پر ان دونوں میں سختی کا معنی پایا جاتا ہے لیکن اول الذکر گفتگو میں سختی کرنے اور مؤخر الذکر کام میں سختی کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا خدا تعالیٰ نادانوں اور نگاروں کے لیے پیغمبر اکرم کی کامل نرم دلی اور لطف و عنایت کا ذکر کرتا ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ

اس کے بعد حکم دیا گیا کہ ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائیے اور انہیں اپنے دامنِ مغفول میں جگہ دے دیجئے اور اس جنگ میں انہوں نے جو بے وفائیاں آپ سے کی ہیں اور جو تکالیف اس جنگ میں آپ کو پہنچائی ہیں، ان کے لیے ان کی مغفرت طلب کیجئے اور میں خود ان کے لیے تم سے سفارش کرتا ہوں کہ انہوں نے میری جو مخالفتیں کی ہیں، مجھ سے ان کی مغفرت طلب کرو دوسرے نقطوں میں جو تم سے مربوط ہے اسے تم معاف کر دو اور مجھ سے ربط رکھتا ہے اُسے میں بخش دیتا ہوں۔ پھر اللہ نے فرمانِ خدا پر عمل کرتے ہوئے ان تمام کو عام معافی دے دی۔ واضح ہے کہ غم و درگزر کرنے کے لیے یہ ایک اہم اور بہت مناسب موقع تھا اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو لوگوں کے بکھر جانے کے لیے فضا ہوا رہتی۔ وہ لوگ جو اتنی بڑی شکست کا سامنا کر چکے تھے اور بہت سے مقتول و غمخوار پیش کر چکے تھے (اگرچہ یہ سب کچھ ان کی اپنی غلطی سے ہوا تاہم) ایسے لوگوں کو محبت، دلجوئی اور تسلی کی ضرورت تھی تاکہ ان کے دل اور جسم کے زخم پر مرہم لگ سکے اور وہ ان سے جان بچو کر آئندہ کے معرکوں کے لیے تیار ہو سکیں۔

اس آیت میں ہر رہبر و رہنما کے لیے ایک ناگزیر صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے ان لوگوں سے درگزر کرنا، نرم مزاجی سے کام لینا اور محبت و مہربانی سے پیش آنا جن سے غلطی سرزد ہوئی ہو اور وہ بعد میں پشیمان ہوئے ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے اگر ایک رہبر سخت مزاج اور تند خو ہو اور محبت و ہمدردی کے جذبے سے سرشار نہ ہو تو وہ بہت جلد اپنے پروگراموں میں ناکام ہو جائے



گا اور لوگ اس کے پاس سے منتشر ہو جائیں گے اور وہ رہبری کی ذمہ داری سے محسوس ہو جائے گا۔ اسی لیے نبیؐ کے کلمات قصار میں حضرت علیؑ کا ایک فرمان ہے:

”آلة الرياسة سعة الصدر“  
”رہبری فسلف دلی کے ذریعے ہونی چاہیے۔“

## مشورہ کرنے کا حکم

”وشاورہم فی الامر“

عام معانی میں اس کے بعد ان کی شخصیتوں کی حیات تازہ اور فکری و روحانی طور پر انہیں پھر سے زندہ کرنے کے لیے حکم دیا گیا کہ مسلمانوں سے مختلف کاموں میں مشورہ کیجیے اور ان کی رائے اور نظریہ معلوم کیجیے۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے جنگ اُحد کے شروع میں مختلف کاموں میں مشورہ کیا تھا کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے۔ ان میں سے اکثر کا نظریہ تھا کہ اُحد کے دامن میں لشکر گاہ اور پڑاؤ ہونا چاہیے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نقطہ نظر کے اچھے نتائج نہ نکل سکے اس لیے عمومی طور پر رائے انہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کو اُحدہ کسی سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن قرآن اس طرز فکر کا جواب دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ پھر بھی ان سے مشورہ کیجئے گا اگرچہ ان کے مشورے کئی مقامات پر مفید ثابت نہیں ہوئے تاہم کلی طور پر مشورہ کے فوائد اس کے نقصانات سے زیادہ ہوتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی تربیت اور شخصیت کی سطح کو بلند کرنے میں اس کے فوائد نقصانات سے کہیں بالاتر ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی مسائل میں لوگوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

اگرچہ آیت ”مشاورہم فی الامر“ میں لفظ امر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر قسم کا کام شامل ہے۔ لیکن مسلم ہے کہ آپؐ احکام الہی میں ان سے مشورہ نہیں کیا کرتے تھے بلکہ انہیں وہ وحی الہی کے نکلنے کے تھے۔ اس بنا پر مشورہ کا دائرہ صرف ان احکام کے اجراء کے طرز و طریقہ اور ان کو عملی جامہ پہنانے تک محدود ہوتا تھا اور دوسرے نکتوں میں آپؐ صرف اجراء کے قانون کے طریقہ کے بارے میں مسلمانوں کا نظریہ معلوم کر لیتے تھے۔ قانون بنانے میں کبھی کسی سے مشورہ نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرتؐ کوئی پروگرام ان کے سامنے پیش کرتے تو مسلمان یہ پوچھتے کہ کیا یہ حکم الہی ہے جس میں اظہار رائے کی گنجائش نہ ہو یا تو ان میں کے اجراء سے مربوط ہے جس کے لیے وہ لوگ اپنا نظریہ پیش کر سکیں اگر امر دوسری قسم کا ہوتا تو وہ اپنی رائے پیش کرتے اور نہ قبول کر لیتے چنانچہ جنگ بدر میں مسلمان آپؐ کے حکم کے مطابق ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہتے تھے تو ایک صحابی ”جباب بن منذر“ نے پوچھا کہ کیا اس مقام کو خدا کے حکم سے منتخب کیا گیا ہے یا آپؐ کی رائے ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں کوئی خاص حکم تو نہیں آیا تو اس نے مختلف وجوہ پیش کیں اور کہا کہ یہ جگہ مناسب نہیں آپؐ حکم دیکھنے کے لیے پڑے اور پانی کے قریب پڑاؤ ڈالے۔ آنحضرتؐ نے اس کی رائے کو پسند کیا اور اس کے مطابق عمل فرمایا۔

۱۰۰ (ظاہر ہے اصولی طور پر یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی۔ مترجم)





## اسلام میں مشورہ کی اہمیت

مشورہ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پیغمبر اکرمؐ وحی آسمانی سے قطع نظر ایسی قوت فکر کے مالک تھے کہ انہیں کسی قسم کے مشورہ کی ضرورت نہ تھی، پھر بھی آپؐ مسلمانوں کو مشورہ کی اہمیت بتلانے کے لیے قانون سازی کو چھوڑ کر دیگر عام معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے تاکہ ان کی قوت فکر و نظر پر وہاں چڑھ سکے اور خصوصیت کے ساتھ صاحب الرائے افراد کی قدر افزائی کیا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض دفعہ ان کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے جیسا کہ ایک واقعہ جنگ اُحد کے تذکرے میں پیش کیا گیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی اسلامی پروگراموں میں کامیابی کا ایک اہم راز ان کا یہی طرز عمل تھا۔ اصولی طور پر جو لوگ اپنے اہم کاموں کو ایک دوسرے کے صلاح و مشورہ سے انجام دیتے ہیں اور تعلقہ امور کے ماہر غور و خوض کے بعد ان کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں اس کے برعکس جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے صلاح و مشورہ سے بے نیاز سمجھتے ہیں وہ کتنے ہی بڑے صاحب فکر و نظر کیوں نہ ہوں زیادہ تر خطرناک اور المناک اشتباہات میں گرفتار ہو جاتے ہیں علاوہ ازیں مشورہ سے بے نیازی کی وجہ سے عامۃ الناس میں شخصیت کا وقار ختم ہو جاتا ہے اور ان کا رد نظریات کی ترویج میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے اور موجود استعدادیں ختم ہو جاتی ہیں اور اس طرح کسی ملت کا بہت بڑا انسانی سرمایہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مزید برآں جو شخص اپنے کام دوسروں کے صلاح و مشورہ سے کرتا ہے اگر وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے تو دوسرے لوگ اس کو حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے کیونکہ دوسرے لوگ اس کی کامیابی کو اپنی طرف سے ہی سمجھتے ہیں اور عموماً انسان اس کام سے حسد نہیں کرتا جسے اس نے خود سرانجام دیا ہو اور اگر کبھی وہ شکست کھا جائے تو وہ دوسروں کے اعتراضات کا نشانہ نہیں بنتا کیونکہ کوئی شخص اپنے کام کے نتیجہ پر اعتراض نہیں کرتا نہ صرف یہ کہ اعتراض نہیں کرتا بلکہ ہمدردی و غم خواری بھی کرتا ہے۔

مشورے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان دوسرے افراد کی شخصیت کی قدر و قیمت اور ان کی دشمنی و دوستی کا اندازہ بھی لگایا جاتا ہے اور یہ چیز کامیابی کے لیے درکار شناسائی و آشنائی کا سبب بھی بنتی ہے۔

اسلامی روایات میں مشورے کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے ایک حدیث میں رسول خداؐ نے فرمایا!

”ما مشق عبد قط بعشورة ولا سعد باستغناء راي“

کوئی شخص ہرگز مشورے سے بدبخت اور استبداد رائے سے خوش بخت نہیں ہو سکتا۔

حضرت علیؑ علیہ السلام نے فرمایا:

”من استبد براية هلك و من شاور الرجال نشار كما في عقولهم“

جو شخص استبداد رائے رکھتا ہو وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور جو بڑے لوگوں سے مشورہ کرتا ہے وہ ان کی عقل میں شریک

ہو جاتا ہے۔



پیغمبر اکرمؐ نے ایک دوسری حدیث میں فرمایا :

”اذا كان امر اثمك خیارك و اغنياك سمحانك و امرك شورى بينك فظلم و الارض خير لك من بطنها و اذا كان امر اثمك شرارك و لغنياك بخلافك و لم يكن امرك شورى بينك فبطن الارض خير لك من ظلمها“

جس وقت تمہارے حاکم نیک لوگ ہوں اور تمہارے امیر سنی ہوں اور تمہارے کام مشورے سے انجام پائیں تو اس وقت زمین کا ظاہری حصہ باطنی کی نسبت تمہارے لیے بہتر ہے (یعنی یہ زمین جینے کے قابل ہے) لیکن اگر تمہارے حکمران بُرے ہوں، دولت مند نہیں ہوں اور کام ایک دوسرے کے مشورے سے نہ ہوتے ہوں تو اس وقت تمہارے لیے زمین کا نچلا (باطنی) حصہ، بالائی (ظاہری) حصہ سے بہتر ہے۔

یہ سہم ہے کہ ہر شخص سے مشورہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بعض اوقات ان میں کمزوری کے پہلو ہوتے ہیں جن کی بنا پر ان کا مشورہ بد نتیجی اور پسماندگی کا سبب بن سکتا ہے جیسا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ تین قسم کے لوگوں سے مشورہ نہ کرو۔

۱۔ بنحیل افراد سے مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے بخشش اور دوسروں کی مدد کرنے سے روکیں گے اور فقر و غربت سے ڈرائیں گے

(لا تدخل في مشورتك بخيلا يعدل بك عن الفضل و يعدك الفقر)

۲۔ بزدلوں سے بھی مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے اہم کاموں کی انجام دہی سے روکیں گے (ولا جباناً يضعفك عن

الامور)

۳۔ حریص افراد سے مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ دولت کی طمع میں تمہیں ظلم و ستم کی طرف رغبت دلائیں گے (ولا حريصاً يذنب

لك الشر بالجوهر)

### جس سے مشورہ کیا جائے اُس کی ذمہ داری

جس طرح اسلام میں مشورہ کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اسی طرح ان افراد کے بارے میں احکام ہیں جن سے مشورہ کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ خیر خواہی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ مشورہ میں خیانت کرنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ حکم فیصلوں کے لیے بھی ہے کہ وہ مشورہ طلب کریں تو ان سے کسی قسم کی خیانت نہ کی جائے اور جو صحیح رائے ہو وہی انہیں دی جائے۔

امام زین العابدین علیہ السلام سے نقل شدہ ”رسالہ حقوق“ میں آپؑ نے فرمایا:

”و حق المستشار ان علمت له رأياً اشرت عليه و ان لم تعلم ارشدته الى من يعلم

و حق المشير عليك ان لا تتهمه فيما لا يوافقك من رأيه“

تجھ سے مشورہ کرنے والے کا حق یہ ہے کہ اگر کوئی نظریہ رکھتے ہو تو اُسے بتا دو اور اگر اس کام کے بارے میں تجھے

ک تفسیر ابو الفتوح رازی۔ صفحہ نمبر ۱۱۲۔ ابلا مغربان بنامک اشتر۔



علم نہیں تو اسے ایسے شخص کی طرف رہنمائی کرو جو جانتا ہے اور مشورے دینے والے کا حق تجھ پر یہ ہے کہ جس نظر سے  
میں وہ تمہارا موافق نہیں ہے اس میں اس پر تہمت تراشی نہ کرو ویلہ

## حضرت عمر کی مجلس شوریٰ

اہل سنت کے معتزین درج بالا آیت کے ذیل میں حضرت عمر کی اس چھ رکنی مشاورتی کمیٹی کا تذکرہ کرتے ہیں جو انہوں نے تیسرے  
خلیفہ کے انتخاب کے لیے تشکیل دی تھی یہ لوگ مندرجہ بالا آیت اور مشورہ کی تمام روایات کو اسی واقعہ پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے  
ہیں۔ اگرچہ اس موضوع کے متعلق عقائد کی کتابوں میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے لیکن یہاں چند ایک نکات کی طرف اشارہ کیا  
جاتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ امام اور جانشین پیغمبر کا انتخاب صرف اللہ کے حکم سے ہونا چاہیے کیونکہ اسے بھی پیغمبر کی طرح عصمت  
اور ایسے دیگر کمالات کا حامل ہونا چاہیے کہ جن کا علم صرف خدا کے پاس ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح پیغمبر کو مشورے سے  
منتخب نہیں کیا جاسکتا ہے اسی طرح امام کا انتخاب بھی مشورے سے ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ افراد کی مجلس شوریٰ ہرگز مشورے کے تقاضوں اور شرائط کو پورا نہیں کرتی کیونکہ اگر مقصود تمام  
مسلمانوں سے مشورہ کرنا تھا تو اسے چھ افراد میں منحصر کرنے کا کیا معنی ہے اور اگر مقصد امت کے صاحبانِ فکر و نظر سے مشورہ کرنا تھا  
تو وہ صرف چھ نہیں تھے۔ امت کے دانا و اہل رائے افراد مثلاً سلمان جو خود حضرت پیغمبر اکرم کے مشیر تھے اسی طرح ابوذر، مقداد،  
ابن عباس اور ان جیسے دیگر افراد مجلس شوریٰ میں شامل نہ تھے۔ مجلس مشاورت کی ہیئت مشاورت کی بجائے ایک سیاسی چال  
زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر مشورے کے لیے صاحبانِ اثر و سرور کو جمع کرنا مقصود تھا تا کہ دوسرے لوگ ان کی رائے قبول کر لیں پھر  
بھی یہ ہیئت درست نہ تھی کیونکہ کئی ایک اہم شخصیتیں ان میں شامل نہ تھیں مثلاً سعد بن عبادہ جو انصار کے سربراہ تھے، ابوذر غفاری  
جو قبیلہ غفار کی ایک عظیم شخصیت تھے اور ان جیسے دیگر افراد اس مجلس مشاورت سے الگ تھلگ تھے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس مجلس شوریٰ کے لیے بڑی سخت اور سنگین شرائط مقرر کی گئی تھیں اور مخالفین کو  
موت کی دھمکی تک دی گئی تھی مالا لیکہ اسلام کے مشاورتی اصولوں اور طریقوں میں ایسی کسی چیز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آخری فیصلے کا مرحلہ فاذا عزمتم فتوکل علی اللہ

مشورہ کرتے وقت نرم مزاجی اور محبت سے کام لینا چاہیے لیکن جب پختہ ارادہ کر لیا جائے تو اتنا ہی مضبوط بھی ہونا چاہیے  
اور اپنے آپ کو ہر قسم کے تردد اور اختلاف آراء سے دور رکھتے ہوئے مصمم ارادہ کر لینا چاہیے۔ اسی کو قرآن مجید نے مندرجہ بالا آیت  
میں عزم سے تعبیر کیا ہے اور یہی تصمیر قاطع ہے۔





یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں جمع (وشاورہم) کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے لیکن آخری فیصلہ پیغمبر اکرم کے ذمہ کر دیا گیا ہے اور یہاں واحد کا صیغہ (عنہم) استعمال ہوا ہے۔ جمع و مفرد کا یہ فرق ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ اجتماعی معاملات کے مختلف پہلوؤں کا حل مل کر اور اجتماعی صورت میں جائزہ لینا چاہیے اور تحقیق کرنا چاہیے لیکن جب ایک چیز کو درست سمجھ لیا جائے تو پھر اس کے اجراء کے لیے ایک ہی ارادے کو کام میں لانا چاہیے ورنہ ہرج مہرج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر ایک پروگرام پر کسی ایک سرپرست کی بجائے کئی رہبروں کے ذریعے عمل درآمد ہو تو یقینی طور پر وہ اختلاف اور شکست سے دوچار ہوگا۔ اسی بناء پر آج کی دنیا میں بھی مشورہ تو اجتماعی صورت میں ہوتا ہے لیکن فیصلے کا نفاذ ایسی حکومتوں کے ذریعے ہوتا ہے جس کے پروگرام ایک شخص کے زیرِ نظر رہ کر انجام پاتے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ زیرِ نظر آیت کہتی ہے کہ پختہ ارادہ کرتے ہوئے خدا پر توکل کرنا چاہیے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ عمومی اسباب و وسائل فراہم ہوجانے کے بعد خدا کی لائقانہی قدرت سے مدد طلب کرنا فراموش نہ ہو جائے۔ البتہ توکل کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مادی دنیا میں خدا کے عطا کردہ اسباب و وسائل کو کام میں نہ لائے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک عرب نے اپنے اونٹ کے پاؤں نہیں باندھے تھے اور اسے محافظ کے بغیر چھوڑ دیا تھا اور اسے وہ خدا پر توکل کرنا سمجھتا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا:

اعقلها و توکل

یعنی — پہلے اس کا پاؤں باندھو اور پھر توکل کرو۔

یہاں آیت میں یہ مقصد ہے کہ انسان عالم مادہ کی چار دیواری اور اپنی محدود قدرت و توانائی پر انحصار نہ کرے اور اپنی نگاہیں پروردگار کی حمایت و لطف پر لگائے رکھے۔ یہ مخصوص توجہ انسان کو امن و سکون، اطمینان اور عظیم روحانی تقویت سے بہکنا کرتی ہے جو مشکلات کے عالم میں انسان کے لیے بہت مؤثر ہوتی ہے۔

اس کی مزید تفصیل مسئلہ توکل اور عالم طبیعت سے استفادہ کرنے کے زیرِ عنوان انشاء اللہ سورہ طلاق کی آیت ۳ — ومن يتق الله يجعل له مخرجاً — کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔

ان الله يحب المتوكلين

بعد والی آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اہل ایمان کو صرف خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ توکل کا مرحلہ مکمل مشورہ کرنے اور تمام امکانی وسائل جو انسانی اختیار میں ہیں سے استفادہ کرنے کے بعد آتا ہے۔

توکل کا نتیجہ

ان ينصرکم اللہ فلا غالب لکم وان یخذ لکم فمن ذالذی ینصرکم من بعدہ



یہ آیت گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے اس میں خدا پر توکل کے سلسلے میں ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے لہذا وہ جس کی حمایت کرے گا دوسرا کوئی بھی اس پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ ذات جو ایسی تمام کامیابوں کا سرچشمہ ہے اس پر بھروسہ کرنا چاہیے اسی سے مدد مانگنی چاہیے۔

یہ آیت اہل ایمان کو ترغیب دلاتی ہے کہ ہر قسم کے ظاہری وسائل میں سر ہونے کے باوجود خدا تعالیٰ کی ناقابل شکست قدرت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

در اصل گذشتہ آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف تھا اور انہیں حکم دیا گیا تھا لیکن اس آیت میں تمام مومنین مخاطب ہیں۔ انہیں فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ کی طرح خدا کی ذات پاک پر بھروسہ کریں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: **وَعَلَى اللَّهِ خَلَيْتُمْ وَكَلَى اللَّهُ مَن مِّنكُمْ**۔ یعنی مومنین کو صرف ذات خدا پر توکل کرنا چاہیے۔

بنا کہے واضح ہے کہ خدا تعالیٰ مومنین کی حمایت یا عدم حمایت بلاوجہ نہیں کرتا بلکہ ان کی اہلیت کے مطابق ہی کرتا ہے۔ جو خدا کے حکم کو پاؤں تلے روندتے ہیں اور مادی اور روحانی توانائیاں فراہم کرنے سے غافل رہتے ہیں خدا کی مدد اور حمایت ان کے لیے نہیں ہوتی مگر جو لوگ صاف بستہ فاعل نیت اور عزم راسخ سے آٹھ کھڑے ہوتے ہیں، تمام ممکنہ دیگر وسائل بھی دشمن کے مقابلے میں فراہم کرتے ہیں انہی کے سر پر خدا کا دست حمایت ہوتا ہے۔

۱۶۱۔ **وَمَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَغْلَظَ طَوْماً مَنْ يَغْلُلُ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝**

ترجمہ

۱۶۱) تم گمان کرتے ہو کہ ہو سکتا ہے پیغمبر تم سے خیانت کرے حالانکہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی پیغمبر خیانت کرے اور جو شخص خیانت کرے گا وہ روز قیامت اسی چیز کے ہمراہ (میدان حشر میں) پیش ہوگا پھر ہر شخص کو وہ کچھ دیا جائے گا جو اس نے کیا ہوگا (اس بنا پر) ان پر ظلم نہیں ہوگا (بلکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہی دیکھیں گے)۔

تفسیر

ہر قسم کی خیانت ممنوع ہے

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغْلُظَ

اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ مندرجہ بالا آیت جنگ احد کے سلسلے کی آیات کے بعد آئی ہے اور ان روایات پر نظر رکھتے ہوئے جو صدر اول کے مفسرین نے نقل کی ہیں، یہ آیت جنگ احد کے سپاہیوں کی بعض بے بنیاد عذر تراشیوں کے جواب میں ہے۔ اس کی



وضاحت کچھ یوں ہے کہ جنگ اُحد کے بعض تیر انداز جب اپنا احساس مورچہ مالِ نینیت جمع کرنے کے لیے چھوڑنا چاہتے تھے تو اُن کے سردار نے انہیں حکم دیا کہ وہ یہ مورچہ نہ چھوڑیں اور ساتھ ہی اُن سے کہا کہ رسولِ خدا تمہیں مالِ نینیت سے محروم نہیں رکھیں گے لیکن ان دنیا پرستوں نے اپنے اصلی چہرے چھپانے کے لیے کہا کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ پیغمبرِ تقسیمِ ننانم میں نظر انداز کر دیں گے لہذا ہمیں اپنے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا مورچہ چھوڑا اور مالِ نینیت سینٹے لگ گئے اور پھر وہ دردناک حوادث پیش آئے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

قرآن اُن کے جواب میں کہتا ہے: کیا تم گمان کرتے ہو کہ پیغمبر تم سے خیانت کریں گے جبکہ تم گمان نہیں کر کوئی پیغمبر خیانت کرے  
وماکان لنبی ان یغدر

اس آیت میں خداوند عالم نے ساحت مقدس انبیاء کو نسیات سے کاٹا منزہ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرماتا ہے: بنیادی طور پر ایسی چیز مقام نبوت کے شایانِ شان ہی نہیں یعنی خیانت کا نبوت سے کوئی جوڑ نہیں اگر پیغمبرِ خائن ہو تو پھر رسالتِ الہی کی ادائیگی اور تبلیغِ احکام میں اس پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔

بغیر کہے واضح ہے کہ اس آیت میں انبیاء سے ہر قسم کی خیانت کی نفی کی گئی ہے اس کا تعلق مالِ نینیت کی تقسیم سے ہو یا لوگوں کی امانتوں کی حفاظت سے یا پھر وحیِ حاصل کرنے اور اسے بندگانِ خدا تک پہنچانے سے۔

تعب ہے کہ جو شخص پیغمبر کو وحیِ الہی کے بارے میں امین سمجھتا ہو کیسے گمان کر سکتا ہے کہ وہ نمودارِ بندگی مالِ نینیت کے بارے میں ناروا حکم دے گا یا اسے اس کے حق سے محروم کر دے گا۔

البتہ واضح ہے کہ خیانت کی کسی شخص کو اجازت نہیں چاہے وہ پیغمبر ہو یا کوئی اور، لیکن جنگِ اُحد کے بہانہ سازوں کی گفتگو چونکہ پیغمبر کے بارے میں تھی لہذا آیت بھی پہلے انبیاء کے متعلق بات کرتی ہے اور پھر مزید کہتی ہے: ومن یغدر یأت بملئیل یومر القیامۃ۔ یعنی جو شخص بھی خیانت کرے گا وہ روزِ قیامت اس چیز کا بار اپنے دوش پر بطور سندا اٹھائے ہوئے حاضر ہوگا جس میں اُس نے خیانت کی ہوگی یا میدانِ مشر میں اُسے اپنے ساتھ لائے گا۔ اس طرح وہ سب کے سامنے ذلیل و رسوا ہوگا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دوش پر اٹھالانے یا اپنے ساتھ لے آنے سے مراد یہ نہیں کہ بعینہ وہی چیز اٹھالائیں گے بلکہ یہاں اس کی جواب دہی کا بوجھ مراد ہے لیکن قیامت میں انسانی اعمال مجسم ہونے کے مسئلے کی طرف نظر کی جائے تو اس تفسیر کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ جیسے مندرجہ بالا آیت کا ظاہری مفہوم شاہد ہے بعینہ وہی چیزیں بطور سندا خیانت کاروں کے دوش پر ہوں گی یا ان کے ہمراہ ہوں گی جن میں خیانت کی گئی ہے۔

شمر قوفی کل نفس ما کسبت و ہم لا یظلمون

پھر ہر شخص کو وہ کچھ دیا جائے گا جو اس نے انجام دیا ہے یا کسب کیا ہے یعنی لوگ اپنے اعمال کو بعینہ وہاں پائیں گے لہذا

۱۔ یہ لفظ "نفل" سے خیانت کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اصل میں "نفل" کا معنی ہے پانی کا تدبیر کی اور منفی طور پر درختوں کی جڑوں میں پہنچنا۔ خیانت چونکہ منفی طور پر اوتدیر کیا ہوتی ہے اس لیے اسے بھی "نفول" کہتے ہیں تشنگی سے پیدا ہونے والی اندرونی حالت کو بھی "نفیل" اسی وجہ سے کہتے ہیں۔





اس بنا پر کسی شخص پر ظلم و ستم نہیں ہو گا کیونکہ ہر شخص کو وہ کچھ مل جائے گا جو اس نے حاصل کیا تھا یا کیا تھا، چاہے اچھا ہو یا بُرا۔ مندرجہ بالا آیت اور وہ احادیث جو پیغمبر اکرم پر خیانت کا الزام لگانے کی مذمت کے ضمن میں صادر ہوئیں انہوں نے مسلمانوں پر عجیب تریقی اثرات مرتب کیے۔ ان کی تاثیر تھی کہ ان سے چھوٹی سے چھوٹی خیانت بھی سرزد نہیں ہوتی تھی خصوصاً مالِ نسیمت اور دیگر مالی معاملات میں نہ ہوتا یہ تھا کہ بہت قیمتی خزانم کم حجم ہونے کے باوجود جن میں خیانت کرنا کچھ مشکل نہ تھا، مکمل پیغمبر اکرم اور آپ کے بعد برسرِ کار حکام کے پاس بغیر دست برد کے لائے جاتے تھے اور یہ ہر دیکھنے والے کے لیے تعجب خیز امر تھا۔ یہ وہی زمانہ جاہلیت کے وحشی اور غارت گر عرب تھے جو تعلیمات اسلامی کے نتیجے میں انسانی تربیت کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے۔ گویا میدانِ مشرک کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جس میں اموال میں خیانت کرنے والوں کو سب کے سامنے اس عالم میں پیش کیا جائے گا کہ وہ اموال ان کے دوش پر ہوں گے جن میں انہوں نے خیانت کی ہوگی۔ یہی وہ ایمان تھا جو انہیں اس قدر بیدار کرتا تھا کہ وہ خیانت کا خیال بھی ترک کر دیں۔

طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے:

جب مسلمان مدائن میں داخل ہوئے اور مالِ نسیمت جمع کرنے لگے ایک مسلمان مالِ نسیمت میں سے ایک نہایت قیمتی چیز مالِ نسیمت جمع کرنے والوں کے پاس لے آیا۔ وہ اس چیز کو دیکھ کر تعجب کرنے لگے اور اس سے کہنے لگے: ہم نے آج تک اس قسم کی قیمتی چیز نہیں دیکھی۔ پھر انہوں نے اس سے پوچھا: تم نے اس میں سے کچھ لیا بھی ہے، وہ کہنے لگا: خدا کی قسم اگر یہ خدا کے لیے نہ ہوتا تو میں ہرگز اسے تمہارے پاس نہ لاتا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ شخص بڑی رومانی شخصیت کا حامل ہے۔ پھر انہوں نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنا تعارف کروائے۔ وہ کہنے لگا: بخدا میں ہرگز تم سے اپنا تعارف نہیں کرواؤں گا، کہیں تم میری تعریف و توصیف کرنے لگو میں نہیں چاہتا کہ دوسرے میری تعریف کریں لیکن میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کی جزا و ثواب پر راضی ہوں۔

۱۶۲۔ اَفَمِنْ اَتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخِطِ مِنَ اللّٰهِ وَمَا وَدَّ جَهَنَّمَ  
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

۱۶۳۔ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِصِيْرِهِمْ بَاعِلْمُونَ ○

ترجمہ

۱۶۲ وہ جو رضائے خدا کی پیروی کرے کیا وہ اس کی مانند ہے جو خشم و غضبِ خدا کی طرف لوٹے اور جس کی جائے قرار جہنم ہے جس کا انجام بہت ہی بُرا ہے۔

۱۶۳ ان میں سے ہر ایک کے لیے درگاہِ خدا میں درجہ و مقام ہے اور جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں خدا سے دیکھتا ہے۔



## تفسیر

## جہاد میں شرکت نہ کرنے والے

افمن اتبع رضوان اللہ

آیات گزشتہ میں جنگ اُحد کے مختلف پہلوؤں اور اس کے نتائج پر بحث ہو چکی ہے۔ اب باری ہے منافقین اور ان کمزور ایمان والے مسلمانوں کی جو منافقین کی اتباع کرتے ہوئے میدان جنگ میں حاضر نہ ہونے۔ روایات میں ہے کہ جب پیغمبر اکرم نے جنگ اُحد کے لیے چلنے کا حکم صادر فرمایا تو منافقین کا ایک گروہ اس بہانے سے شامل نہ ہوا کہ بقول ان کے انہیں جنگ کے وقوع پانے ہونے کا یقین نہیں تھا۔ بعض کمزور ایمان والے مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ زیر نظر آیت ان کی اسی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے: وہ لوگ جو حکم خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی رضا کی پیروی کرتے ہیں کیا وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو غضبِ خدا کی طرف لوٹ گئے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم اور ان کا انجام کارِ بُرا اور تکلیف دہ ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ہد درجات عند اللہ — یعنی ان میں سے ہر کوئی بارگاہِ الہی میں درجہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ نہ فقط یہ کہ تن پرور منافق اور جاہدین آپس میں فرق رکھتے ہیں بلکہ ہر شخص جو ان دو صفوں میں سے کسی میں کھڑا ہے خدا کا رمی و جاننازی یا نفاق و حق دشمنی میں فرق کا ایک خاص درجہ رکھتا ہے جو صغر سے شروع ہو کر حد تصور سے بالاتر تک باری و ماری رہتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں حضرت امام علی بن موسیٰ رضا سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

ہر درجے کے درمیان آسمان و زمین کے درمیانی فاصلے جتنا فاصلہ ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:

اہلِ بہشت درجات بالا میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے آسمان پر ستارہ دکھائی دیتا ہے۔

البتہ توجہ رہے کہ عموماً درجہ بڑھتی جیوں کو کہا جاتا ہے کہ جن کے ذریعے انسان بلند نقطے کی طرف جاتا ہے لیکن جن بڑھتیوں کے ذریعے نیچے کی طرف جایا جاتا ہے انہیں ”درک“ (بروزن مرگ) کہا جاتا ہے۔ اسی لیے سورہ بقرہ آیت ۲۵۳ میں انبیاء کے بارے میں ہے:

ورفع بعضہم فوق بعض درجات

سورہ نساء آیت ۱۴۵ میں منافقین کے بارے میں ہے:

۱۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۶۰۶

۲۔ تفسیر مجمع البیان، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔



ان المنفقين في الدرك الاسفل من النار

لیکن زیر بحث آیت میں کیونکہ دونوں گروہوں کے متعلق گفتگو ہے اس لیے مومنین سے متعلقہ تعبیر اختیار کی گئی اور لفظ "درجہ" استعمال کیا گیا (اس طرز بیان کو ادبی اصطلاح میں تغلیب کہتے ہیں)۔  
آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: واللہ بصیر بما یعملون۔ یعنی خدا سب کے اعمال دیکھتا ہے اور کامل طور پر جانتا ہے کہ ہر شخص اپنی نیت، ایمان اور عمل کے لحاظ سے کس درجے کا اہل ہے۔

### ایک موثر طریقہ تربیت

قرآن مجید میں دینی، اخلاقی اور اجتماعی معارف سے مربوط حقائق کو سوال کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے اور مسئلہ کے دونوں پہلو سننے والے کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی عقل و فکر سے ایک کو انتخاب کر لے۔ یہ طریقہ جسے غیر مستقیم (INDIRECT) کہنا چاہیے تربیتی امور میں بہت موثر ہوتا ہے کیونکہ انسان عموماً مختلف امور میں سے سب سے زیادہ اہمیت اپنے افکار و نظریات کو دیتا ہے۔ جب کوئی مسئلہ ایک قطعی اور حتمی صورت میں پیش کیا جائے تو بعض اوقات انسان اس کے مقابلے کی کوشش کرتا ہے اور اسے ایک اجنبی فکر کی حیثیت سے دیکھتا ہے لیکن جب اسے سوال کی صورت میں پیش کیا جائے اور اس کا جواب وہ اپنے وجدان اور دل کے اندر سے سنے تو اسے اپنی فکر اور اپنی رسائی سمجھتا ہے اور اسے ایک جانی بچپانی فکر کی حیثیت سے قبول کرتا ہے لہذا اس کے مقابلے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ طرز تعلیم بالخصوص ہرٹ و حرم لوگوں اور بچوں کے لیے موثر ہے۔ قرآن مجید میں اس طریقے سے بہت کام لیا گیا ہے، اس کے چند نمونے یہ ہیں۔

۱ ہل یستوی الذین یعملون و الذین لا یعملون

یعنی — کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔ (زمر - ۹)

۲ قل هل یستوی الاعمی و البصیر افلا تتفکرون

یعنی — کہیے: کیا نابینا اور بینا برابر ہیں، کیا تم سوچتے نہیں۔ (انعام - ۵۰)

۳ قل هل یستوی الاعمی و البصیر ام هل تظلمت و النور

یعنی — کہیے کیا نابینا اور بینا برابر ہیں، آیا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں۔ (رعد - ۱۶)

۱۶۴۔ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ  
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ  
كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

۱۶۴ خدا نے مومنین پر احسان کیا (انہیں ایک عظیم نعمت بخشی جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو ان کے



سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ اس سے پہلے وہ وضع گمراہی میں تھے۔

تفسیر

خدا کی بہت بڑی نعمت

لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم

اس آیت میں عظیم ترین نعمت — یعنی ”بعثت پیغمبر اسلام“ کے متعلق گفتگو ہے۔ حقیقت میں یہ ان سوالات کا جواب ہے جو نومسلموں کے دل میں جگ اُٹھاتا ہے۔ وہ سوچتے تھے کہ ہم ان مشکلات و مصائب میں کیوں گرفتار ہوں۔ قرآن انہیں کہتا ہے: اگر تمہیں اس راہ میں نقصان اٹھانا پڑا ہے تو یہ زبجول جاؤ کہ اللہ نے تمہیں ایک بہت بڑی نعمت عطا کی ہے، اس نے پیغمبر مبعوث کیا ہے جو تمہاری تربیت کرتا ہے اور تمہیں کھلی گمراہیوں سے روکتا ہے، اس عظیم نعمت کی حفاظت کے لیے تم جتنی بھی کوشش کرو اور تمہیں جتنی بھی قیمت دینا پڑے حقیر ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس نعمت کا ذکر لقد من الله على المؤمنين (خدا نے مومنین پر احسان کیا) سے شروع ہوتا ہے، جو ابتدائی نظر میں مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن ”منت“ کے اسلی معنی کی طرف توجہ دی جائے تو مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مفردات میں راعب کہتا ہے کہ یہ لفظ دراصل ”من“ سے ہے جس کا معنی ہے ”وہ پتھر جن سے چیزوں کو تولا جاتا ہے“ اسی لیے ہر قیمتی چیز اگر وہ علی پہلو رکھتی ہو تو اسے ”منت“ کہتے ہیں یعنی کسی نے دوسرے کو عملی طور پر عظیم نعمت عطا کی ہو تو اس کا استعمال بالکل زیبا اور مناسب ہے لیکن اگر کوئی اپنے چھوٹے سے کام کو باتوں سے بڑا کر کے دکھائے تو یہ انتہائی بُرا اور قبیح ہے لہذا احسان جتنا جو بُرا اور مذموم ہے وہ باتوں میں اپنے احسانات کو بڑا شمار کرنا ہے لیکن اس احسان کا تذکرہ جو عظیم نعمتوں کی عطا ہو، مناسب اور زیبا ہے۔ منہ رجبہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: پروردگار نے مومنین پر احسان کیا یعنی انہیں عظیم نعمت عطا کی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف مومنین کا ذکر کیوں کیا گیا ہے جبکہ بعثت پیغمبر تو تمام نوع بشر کی ہدایت کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نتیجہ اور تاثیر کے لحاظ سے صرف مومنین ہی اس عظیم نعمت سے استفادہ کرتے ہیں اور عملاً اسے اپنے سے مخصوص کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے: پیغمبر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خود انہی کی جنس اور نوع بشر میں سے ہے (من انفسہم) وہ مشرتل یا دیگر مخلوق کی نوع میں سے نہیں ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ وہ ضروریات بشر کو کس طور پر جان سکے اور انسانوں کے دکھ درد و مشکلات مصائب اور مسائل زندگی کو لمس کر سکے اور یوں ان کی تربیت کے لیے اقدام کرنے کی طرف خود متوجہ ہو سکے۔ علاوہ ازیں انبیاء کے تربیتی پروگرام کا اہم ترین حصہ ان کی اپنی زندگی اور عملی تبلیغات تھیں۔ ان کے اعمال تربیت کے لیے بہترین نمونہ اور ذریعہ تھے۔ کیونکہ ”عمل کی زبان“ سے ہر زبان میں بہتر تبلیغ کی جاسکتی ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب تبلیغ کرنے والا سننے والے کا ہم جنس ہو۔ اس کی جسمانی، طبعی اور روحی بناوٹ ایک سی ہو۔ مثلاً اگر انبیاء ملائکہ کے ہم جنس ہوتے تو لوگوں کی طرف سے یہ سوال باقی رہتا کہ اگر وہ گناہ نہیں کرتے تو کیا اس کی وجہ نہیں کہ وہ شہوت و غضب اور طرح طرح کی انسانی اقیابات اور بشری غرائز و سرشت کے حامل



نہیں ہیں اور یوں انبیاء کا ملی تبلیغات کا پروگرام ختم ہو کر رہ جاتا ہے ایسے انبیاء کا انتخاب انسانوں میں سے انہی حاجات، ضروریات، غرائز اور طبائع کے ساتھ کیا گیا ہے تاکہ وہ سب کے لیے نمونہ عمل بن سکیں۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

پھر فرمایا: پیغمبر نے ان کے سامنے تین اہم پروگرام پیش کیے ہیں:

پہلا ان کے سامنے پروردگار عالم کی آیات پڑھنا، تلاوت کرنا اور ان کے کانوں اور افکار کو ان آیات سے آشنا کرنا۔

دوسرا تعلیم — یعنی ان حقائق کو ان کی روح تک پہنچانا۔

تیسرا تزکیہ نفس یعنی اخلاقی و انسانی ملکات کی تربیت اور نشوونما۔ چونکہ اصلی ہدف تربیت ہے لہذا آیت میں اس کا ذکر تعلیم

سے پہلے آیا ہے حالانکہ فطری تربیت کے لحاظ سے تعلیم تربیت پر مقدم ہے۔

وہ لوگ جو انسانی حقائق سے بالکل دور ہیں وہ تربیت کا اثر آسانی سے قبول نہیں کرتے بلکہ ایک مدت تک ان کے کانوں کو

ارشادات الہی سے آشنا کرنا پڑے گا اور ان میں پہلے سے موجود وحشت و اجنبیت کو دور کرنا پڑے گا پھر تعلیم کا مرحلہ شروع ہوگا اور

اس کے بعد تربیت کی باری آئے گی جو کہ سارے پروگرام کا حاصل ہے۔

مگر آیت میں تزکیہ سے مراد شرک، باطل عقائد اور یہودیہ نصاب اور بربری حیوانی عادات کی آلودگی سے پاک کرنا ہو کر

جب تک انسان کا باطن ان غلاظتوں سے پاک نہ ہو تو ممکن نہیں کہ وہ کتاب الہی اور حقیقی حکمت و دانائی کی تعلیم کے لیے آمادہ ہو سکے۔

جیسے ایک تنگی پر موجود بڑے نقوش جب تک صاف نہ ہو جائیں اس پر خوبصورت اور دلکش نقوش بجا طور پر ثبت نہیں ہو سکتے اس لیے

مندرجہ بالا آیت میں تزکیہ نفس کو تعلیم یعنی بلند اور اعلیٰ اسلامی معارف پر مقدم کیا گیا ہے۔

وَ اِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ لُغْيٍ ضَلَّلُوا مَبِينٍ

ایک عظیم نعمت کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب اس سے فائدہ حاصل کرنے کے زمانے کا اس سے قبل کے زمانے

سے موازنہ کیا جائے اور ان دونوں کا فرق جان لیا جائے۔ زیر نظر جگہ میں قرآن کہتا ہے: اسلام سے قبل کے زمانے پر ایک نگاہ کرو

تمہاری کیا حالت تھی اور تمہارے ایام کیسے گزر رہے تھے اور اب کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہو۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرآن زما نہ جاہلیت کی کیفیت کو "ضلل مبین" یعنی "واضح گمراہی" قرار دیتا ہے کیونکہ گمراہی و

ضلالت کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض گمراہیاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان آسانی سے ان کے باطل ہونے کو نہیں سمجھ سکتا اور کبھی ایسا ہوتا ہے

کہ جو شخص تنہا ہی سچی عقل بھی رکھتا ہو وہنا سمجھ لیتا ہے۔

دنیا کے لوگ اور خصوصاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے پیغمبر اسلام کی بعثت کے زمانے میں واضح ضلالت و گمراہی میں مبتلا

تھے۔ ناجائز کاروبار، بد بختی، جہل و نادانی اور طرح طرح کی معنوی آلودگیوں نے اس زمانے میں تمام دنیا کو گھیر رکھا تھا اور یہ غیر مناسب

کیفیت کسی پر بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔

۱۴۵۔ اَوَّلَمَّا صَابَتْكُمْ مِصْيَبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَهَا قُلْتُمْ اِنَّا هَذَا



قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ

۱۴۵ (جنگ اُحد میں) تم پر مصیبت آئی جبکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو گنا (دشمن) پر بھی تم غالب آچکے ہو، تو تم کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی ہے؟ کہہ دو کہ یہ خود تمہاری طرف سے ہے (کہ تم نے جنگ اُحد کے میدان میں حکم پیغمبر کی مخالفت کی) خدا ہر چیز پر قادر ہے (اور اب بھی اگر تم اپنی اصلاح کرو تو آئندہ وہ تمہیں کامیابی دے گا)۔

تفسیر

جنگ اُحد پر ایک اور نظر

اس آیت میں واقعہ اُحد پر ایک اور نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس کی دفاحت یہ ہے کہ بعض مسلمان جنگ کے المناک نتائج پر غمگین اور پریشان تھے اور بار بار اپنی پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔ خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں ان سے تین نکات کا ذکر کرتا ہے۔  
 ۱۔ تم صرف ایک ہی جنگ کے نتائج سے پریشان نہ ہو جاؤ بلکہ عینی مرتبہ دشمن سے مقابلہ ہوا ہے اس کا موازنہ کرو۔ اگر اس میدان میں تم پر مصیبت آئی ہے تو دوسرے میدان (بدر) میں اس سے دو گنا دشمن پر تم بھی غالب آچکے ہو کیونکہ انہوں نے اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید کیے ہیں جبکہ تم میں سے کوئی قید نہیں ہوا لیکن جنگ بدر میں تم نے ان کے ستر آدمی قتل کیے اور ستر ہی گرفتار کیے تھے۔

اولما اصابتکم مصیبة قد اصابتم مثليها۔

حقیقت میں ”ہذا اصابتم مثليها“ یعنی تم نے دشمن کو دو گنا نقصان پہنچایا تھا۔ ایک جواب ہے جو سوال سے پہلے آیا ہے۔

۲۔ تم کہتے ہو کہ یہ مصیبت ہمیں کہاں سے دامن گیر ہوئی۔ ”قلتم اني هذا“ لیکن اسے پیغمبر! ان سے کہیے: اس مصیبت کا باعث خود تم ہو اور عوامل شکست کو اپنی ہی ذات میں تلاش کرو۔ (قل هو من عند انفسکم)۔  
 تم ہی تھے جنہوں نے حکم پیغمبر کی مخالفت میں کوہ بینین کا ساس مورچہ چھوڑ دیا اور تمہی نے جنگ ختم ہونے سے پہلے اور اس کے حتمی فیصلے سے قبل مال قیمت جمع کرنا شروع کر دیا اور تم ہی دشمن کے نئے حملے کے وقت میدان چھوڑ کر بھاگ کھنکے ہوئے تمہاری ہی کوتاہیاں اور گناہ اس شکست اور اتنے لوگوں کے قتل کا سبب بنیں۔

۳۔ اب آئندہ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے اور اگر تم اپنی کمزوریوں کی تلافی کرو تو اس کی حمایت تمہارے شامل مال ہوگی (ان الله علىٰ كل شيء قدير)۔



۱۴۶۔ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّقِي الْجَمْعِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ۝  
 ۱۴۷۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ  
 ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا اتَّبَعْنَاكُمْ هُمْ لِلْكَفْرِ يَوْمِيذِ اقْرَبُ  
 مِنْهُمْ لِلْإِيْمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۝  
 اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ۝

ترجمہ

۱۴۶ اور اُس روز (اُحد کے دن) جب دو گروہ (مؤمنین و کفار) آپس میں نبرد آزما ہوئے تو تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ حکم خدا (اور قانون مکافات) کے مطابق تھی اور اس بنا پر تھی کہ اہل ایمان پہچانے جائیں۔

۱۴۷ اور (یہ بھی وجہ تھی کہ) جن لوگوں نے منافقت کی ہے وہ پہچانے جائیں وہ جنہیں کہہ دیا گیا تھا کہ آؤ اور راہ خدا میں جنگ کرو یا (کم از کم) اپنے حرم کا دفاع کرو۔ انہوں نے کہا اگر ہمیں یقین ہوتا کہ واقعاً جنگ ہوگی تو ہم تمہاری پیروی کرتے (لیکن ہمیں تو پتہ ہے کہ جنگ نہیں ہوگی)۔ وہ لوگ اُس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ نزدیک تھے۔ وہ اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے تھے جو ان کے دل میں نہیں ہوتا تھا اور خدا اس چیز کو جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔

تفسیر

مختلف گروہوں کو الگ الگ پہچانا جانا چاہیے

مندرجہ بالا آیت یہ بات یاد دلاتی ہے کہ (اُحد کی طرح) جو مصیبت بھی پیش آتی ہے ایک تو یہ کہ وہ بلا سبب نہیں ہوتی اور دوسرا یہ کہ وہ آزمائش کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے اس آیت میں سچے مجاہدین اور منافقین یا کمزور ایمان لوگوں کی صفوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا ذکر ہے۔ اسی لیے آیت کے پہلے حصے میں فرمایا گیا ہے وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّقِي الْجَمْعِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ۔ اُحد کے دن جب مسلمانوں کا بت پرستوں سے آمناسا منا ہوا اُس وقت جو کچھ تم پر گزرا وہ حکم خدا سے تھا اور اسی کی مشیت اور ارادے سے ظہور پذیر ہوا۔

خلقت کے عمومی قانون کے مطابق ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے اور بنیادی طور پر یہ جہانِ عمل و اسباب کی دنیا

ہے اور یہ ایک ثابت و دائمی اصول ہے اور اس کے مطابق بھی کہ جو فوج بھی میدان جنگ میں سستی کرے گی اور مال و دولت اور  
نہایت کی لالچ میں پڑ جائے گی اور اپنے ہمدرد حاکم کا حکم فراموش کر دے گی تو وہ شکست کھا جائے گی۔ اس بناء پر اذن اللہ  
(حکم خدا) سے مراد اُس کا وہی ارادہ و مشیت ہے جو قانونِ علیت کی شکل میں عالم ہستی پر حکم فرماتا ہے۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے: **وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا**۔ اس جنگ کا ایک  
مقصد یہ تھا کہ مومنین اور منافقین کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور صاحبِ ایمان اور کفر و ایمان والوں میں امتیاز  
ہو سکے۔

واقعات میں مسلمانوں میں سے تین گروہ نمایاں ہو گئے:

**پہلا**۔ اس میں چند محدود افراد تھے جو آخری لمحوں تک ثابت قدم رہے اور دشمن کے جم غفیر کے سامنے آخری دم تک  
ڈٹے رہے۔ ان میں سے بعض نے جامِ شہادت نوش کیا اور بعض شدید زخمی ہوئے۔

**دوسرا**۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں اضطراب اور تزلزل پیدا ہو گیا تھا اور وہ آخر تک استقامت نہ دکھاسکے اور  
بالآخر بھاگ کھڑے ہوئے۔

**تیسرا**۔ یہ منافقین کا گروہ تھا۔ یہ لوگ راستے ہی سے واپس لوٹ گئے تھے، طرح طرح کے بہانے کر کے جنگ سے  
مزنہ ہو گئے اور مدینہ کی طرف پلٹ گئے۔ ہم جلد ہی ان کے بہانوں کا تذکرہ کریں گے۔ یہ گروہ عبداللہ بن ابی سلول اور اس کے  
تین سو ساتھیوں پر مشتمل تھا۔

اگر اُحد میں سخت معرکہ پیش نہ آتا تو یہ صفیں کبھی الگ الگ نہ ہوتیں اور ہر گروہ کے لوگ اپنی مخصوص صفات کے باوجود کسی  
صف میں نہ سمجھے جاتے اور ممکن تھا کہ دعویٰ کرتے وقت ہر شخص اپنے آپ کو بہترین مومن قرار دیتا۔  
درحقیقت آیت میں دو چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلی جنگ اُحد کی شکست کی علتِ فاعلی اور دوسری اس کی  
علتِ غائی اور اس کا آخری نتیجہ۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے: **لِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا** (تاکر وہ لوگ  
پہچانے جائیں جنہوں نے نفاق کیا ہے)۔ یہ نہیں فرمایا: **لِيَعْلَمَ الْمُنَافِقِينَ** (تاکر منافق پہچانے جائیں)۔ دوسرے  
لفظوں میں نفاق کا ذکر فعل کی صورت میں ہوا ہے صفت کے طور پر نہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ نفاق ابھی تک ان سب میں  
صفتِ ثابت کے طور پر نہیں تھا۔ اسی لیے تاریخ اسلام میں ہے کہ ان میں سے بعض کو توبر کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ  
مومنین کی صفوں سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد قرآن اس گفتگو کا تذکرہ کرتا ہے جو جنگ سے قبل مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان ہوئی۔ فرمایا:  
**وَقِيلَ لَهُمْ تَقَالُوا تَلَوْا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ ادْفَعُوا**

ایک مسلمان (ابن عباس کے قول کے مطابق عبداللہ بن عمر بن حزام) نے جب دیکھا کہ عبداللہ بن ابی سلول اپنے  
ساتھیوں کے ساتھ لشکرِ اسلام سے کنارہ کش ہو کر مدینہ کی طرف پلٹنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے تو اس سے کہا: **أَوْ دَفَعَا** کے لیے اور



اس کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم جو خطرہ تمہارے وطن اور قوم قبیلے کو درپیش ہے اس کا ہی دفاع کرو۔ مگر ان لوگوں نے ایک بے ہودہ بہانہ کیا اور کہنے لگے: لو نعدو قتلًا لا تبعدنا کفو۔ ہمیں اگر معلوم ہوتا کہ جنگ ہوگی تو ہم بے دریغ تمہاری پیروی کرتے، ہمارا خیال ہے کہ یہ سختی کسی جنگ اور خون ریزی کے بغیر ختم ہو جائے گی۔ ایک اور مفہوم کے مطابق منافقین کہنے لگے، اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو تمہارا ساتھ دیتے لیکن ہماری نگاہ میں تو یہ جنگ نہیں بلکہ ایک طرح کی خودکشی ہے کیونکہ شکر اسلام اور کفار میں جو عدم توازن نظر آ رہا ہے اس کے پیش نظر ان سے جنگ کرنا قلعندی کا کام نہیں خصوصاً جبکہ شکر اسلام کے پڑاؤ کی جگہ بھی نامناسب ہے۔

بہر حال یہ باتیں بہانے سے زیادہ وقعت نہیں کھتی تھیں۔ جنگ کا ہونا بھی یقینی تھا اور مسلمان ابتداء میں کامیاب اور فتح مند بھی ہو گئے تھے۔ اب اگر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے تو یہ ان کے اپنے اشتباہات اور غلاف و درزیوں کا نتیجہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا: وہ جھوٹ بولتے ہیں، هو للكفر یومئذ اقرب منه للایمان اس روز وہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے اس جملے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفر و ایمان کے کئی درجے ہیں جو انسان کے عقیدے اور طرز عمل سے وابستہ ہیں۔

يقولون باضوا هم ما ليس في قلوبهم و زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے اور ان کی نیت ان کی گفتگو سے بالکل میل نہیں کھاتی۔ انہوں نے اپنی اس تجویز میں اصرار کرتے ہوئے کہ جنگ مدینہ کے اندر ہو جانی چاہیے یا دشمن کے حملوں کے خوف سے اور یا پھر اسلام سے لا تعلق ہونے کی وجہ سے جنگ میں شرکت نہیں کی۔ واللہ اعلم بما یکتمون لیکن خدا اس سے مکمل طور پر آگاہ ہے جو کچھ منافق چھپائے ہوئے ہیں اور وہ اس جہان میں بھی ان کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے مقاصد سے آگاہ کرتا ہے اور آخرت میں بھی ان کا حساب چکائے گا۔

۱۶۸۔ الَّذِينَ قَالُوا لَّا خِوَانِيَهُمْ وَقَعَدُوا وَالْوَاطِعُونَ مَا قَتَلُوا ط وَتَلُّ  
فَادْرَعُوا عَنِ انْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ  
۱۶۸ (منافقین) وہ ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں سے ان کی حمایت سے دستکش ہو کر کہا کہ اگر وہ ہماری پیروی کرتے تو قتل نہ ہوتے کہہ دو (کیا تم لوگوں کی موت کی پیش منی کر سکتے ہو تو) پھر موت کو اپنے آپ ہی سے دور کر لو، اگر تم سچے ہو۔

تفسیر

منافقین کی بے بنیاد باتیں

منافقین خود بھی جنگ اُحد سے کنارہ کش رہے اور دوسروں کے حوصلے کم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور پھر مجاہدین واپس آئے





تو انہیں سرزنش کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر تم جہادی بات مانتے تو تمہارے آدمی قتل نہ ہوتے۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن اُن کی اس بے بنیاد بات کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: الَّذِينَ قَالُوا لَّا خِوَانٌ لَّهُمْ وَقَعَدُوا— یعنی۔ جنہوں نے جنگ سے کنارہ کشی کی اور اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر جہادی اطاعت کی ہوگی تو تم قتل نہ ہوتے۔ ان سے کہیے: اگر تم آئندہ کے حوادث کی پیش بینی کر سکتے ہو تو اپنے آپ ہی سے موت دور کرو، اگر سچے ہو۔

یعنی حقیقت میں تمہارا دعویٰ ہے کہ تم عالم غیب ہو اور آنے والے حوادث سے باخبر، تو ایسا دعویٰ کرنے والے شخص کو پاپیے کہ وہ اپنی موت کے علل و عوامل کی پیش بینی کرتے ہوئے انہیں بے کار کر دے، کیا تم میں یہ قدرت و طاقت ہے۔

پھر اگر تم میدان جہاد اور راہِ افتخار میں قتل نہیں ہوتے تو کیا تمہیں عمر جاودا مل جائے گی اور کیا تم موت کو ہمیشہ کے لیے اپنے سے دور کر سکتے ہو۔ جب تم موت کے مسلم قانون کو ختم نہیں کر سکتے تو پھر ذلت کے بستر پر کیوں مرتے ہو اور میدان جہاد میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے عزت سے جام شہادت نوش کیوں نہیں کرتے۔

زیر نظر آیت میں ایک اور قابل غور نکتہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مومنین کو بھائی کہا گیا ہے جبکہ مومن ہرگز منافق کا بھائی نہیں ہے۔ دراصل یہ انہیں ایک قسم کی سرزنش ہے کہ تم تو مومنین کو اپنا بھائی سمجھتے تھے تو پھر ان مسالوں میں ان کی حمایت سے دست کش کیوں ہو گئے ہو۔ اسی لیے اخوانہم کے فوراً بعد بلافاصلہ لفظ قعدوا (جنگ سے ہٹھ گئے) آیا ہے، تو کیا انسان برادری کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور پھر ایک دم اپنے بھائی کی حمایت چھوڑ کر بھی بیٹھ جاتا ہے۔

۱۶۹۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرَوِّقُونَ ۝

۱۷۰۔ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ۗ أَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

۱۷۱۔ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ وَفَضْلٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

ترجمہ: ۱۶۹۔ راہِ خدا میں قتل ہوئی والوں کے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ وہ مرد ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں سے روزِ حیات پاتے ہیں۔ ۱۷۰۔ وہ خدا کی عطا کردہ فراوان نعمتوں پر خوش ہیں اور وہ (مجاہد) کہ جو اُن سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اُن سے ابھی اگر نہیں ملے اُن کے بارے میں بھی خوش ہیں (کیونکہ وہ اُس جہان میں انکے عظیم مراتب کو دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں) کہ نہ اُن کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ ملامت۔



۱۷۱ اور وہ خدا کی نعمت اور اس کے فضل سے (غوشمال و مسرور ہوتے ہیں) اور (وہ دیکھتے ہیں کہ) خدا (شہید ہونے والوں اور نہ شہید ہونے والے مجاہد) مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

## تفسیر

### زندہ جاوید

بعض مغزین کے نزدیک مندرجہ بالا آیات شہدائے اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور بعض دوسرے سمجھتے ہیں کہ یہ شہدائے بدر سے متعلق ہیں لیکن حق یہ ہے کہ گذشتہ آیات سے ان کا ربط ظاہر کرتا ہے کہ یہ جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا عمومی مفہوم بھی ہے جو تمام شہداء جن میں بدر کے چودہ شہداء بھی شامل ہیں پر محیط ہے۔ اسی لیے امام محمد باقر سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہ آیات شہداء بدر و اُحد، ہزد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ابن سعود وغیرہ کرم سے روایت کرتے ہیں: خدا نے شہداء اُحد کی ارواح کو خطاب کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ تمہاری کیا آرزو ہے تو انہوں نے کہا: پروردگار ہم اس سے زیادہ کیا آرزو کر سکتے ہیں کہ ہم ہمیشہ کی نعمتوں میں مستغرق ہیں اور تیسرا عرش کے سامنے میں رہتے ہیں، جہلا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور پھر سے تیری راہ میں شہید ہوں۔ اس پر خدا نے فرمایا: میرا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی شخص دوبارہ دنیا کی طرف نہیں پلٹے گا۔ انہوں نے عرض کیا: جب ایسا ہی ہے تو ہماری تمنا ہے کہ ہمارا اسلام پیغمبر اسلام کو پہنچا دے، ہمارے حالات ہمارے پسماندگان کو بتا دے اور انہیں ہماری حالت کی بشارت دے تاکہ انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

بہر حال یوں لگتا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد کچھ کمزور ایمان لوگ بیٹھ جاتے اور اپنے ان دوستوں اور عزیزوں کا انوس کرتے جو اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے اور کہتے کہ وہ کیوں مارے گئے اور ختم ہو گئے۔ خصوصاً جب انہیں کوئی نعمت ملتی اور ان کی عدم موجودگی کے خیال سے انہیں بہت دکھ ہوتا۔ وہ اپنے آپ سے کہتے کہ ہم تو ایسے ناز و نعمت سے بہرہ ور ہیں لیکن ہمارے بھائی بیٹے قبروں میں سوئے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھ بالکل خالی ہیں۔

ایسے افکار اور ایسی باتیں نہ فقط یہ کہ درست اور واقع کے مطابق نہ تھیں بلکہ باقی رہ جانے والوں کے جذبول کو بھی کمزور کرنے کا باعث تھیں۔ زیر نظر آیات نے ایسے افکار پر خط بطلان کھینچ دیا اور شہیدوں کے بلند مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: (مترجم)

۱۷۱ نور الثقلین جلد ۱، صفحہ ۴۰۹ بحوالہ عیاشی۔

۱۷۱ عمرنا ایسا ہی ہوتا ہے اب بعض مواقع استثنائی حیثیت رکھتے ہیں جیسے امام زمانہ کے دور حکومت میں رجعت (مترجم)



الذین قتلوا فی سبیل اللہ ما و اتا۔ یہاں روئے سخن نقطہ پیغمبر کی طرف ہے تاکہ دوسرے خود اندازہ کر لیں۔

آیت کے اس حصے کا مفہوم ہے کہ اسے پیغمبر! یہ گمان ہرگز نہ کیجئے کہ جو لوگ راہِ خدا میں مارے گئے ہیں وہ مردہ ہیں۔ بل احياء عند ربہم یرزقون۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے نعمتیں حاصل کرتے ہیں۔

یہاں زندگی سے مراد برزخ کی زندگی ہے جو موت کے بعد کے زمانے میں ارواح کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ مادی و جسمانی زندگی نہیں۔ البتہ یہ زندگی شہداء سے مخصوص نہیں اور دیگر بہت سے لوگ بھی اس زندگی کے حامل ہیں۔ لیکن شہیدوں کی زندگی چونکہ بہت انواع و اقسام کی نعمتوں سے مالا مال ہے۔ علاوہ ازیں آیت میں موضوع سخن شہداء ہی ہیں اس لیے صرف انہی کا نام لیا گیا ہے اور وہ اس قدر حیاتِ معنوی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں گویا برزخ میں رہنے والے باقی لوگوں کی زندگی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کے بعد شہداء کی حیاتِ برزخ کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

فریحین بما اتھم اللہ من فضلہ۔ وہ فردا ان نعمتیں جو خدا نے اپنے فضل و کرم سے انہیں دی ہیں ان سے وہ خوشحال ہیں۔

ان کی دوسری مسرت اپنے ان مجاہد بھائیوں کے بارے میں ہے جنہوں نے میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش نہیں کیا اور ان سے مل نہیں پائے۔ وہ ان کے مقامات اور اجر و ثواب کو اس جہان میں اچھی طرح دیکھتے ہیں اس بنا پر وہ مسرور و شادمان ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ویستبشرون بالذین لم یلدحوا بہم من خلفہم۔ بلکہ اس کے بعد فرماتا ہے: الاخوف علیہم ولا ھم یحزنون یعنی شہداء مسوک کرتے ہیں کہ ان کے مجاہد بھائی ان چیزوں کے بارے میں کوئی غم نہیں کرتے جو وہ بعد از موت دنیا میں چھوڑ آئے ہیں اور نہ ہی انہیں قیامت اور اس کے وحشتناک حوادث کا خوف ہے۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ شہداء اپنے ان مجاہد بھائیوں کے مقامات بلند دیکھ کر خوش ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ نہیں مل سکے اور اس کے علاوہ انہیں خود بھی آئندہ کا کوئی خوف اور گذشتہ کا غم نہیں ہے۔

یستبشرون بنعمۃ من اللہ و فضل

یہ آیت درحقیقت ان بشارتوں کی زیادہ تاکید اور توضیح ہے جو شہادت کے بعد شہداء کو حاصل ہوئی ہیں۔ وہ دو وجوہ کی بنا پر خوش اور مسرور ہیں:

پہلی یہ کہ وہ خدا کی نعمتیں پالیتے ہیں، نعمتیں ہی نہیں بلکہ اس کا فضل جس کا معنی ہے ان نعمتوں کی زیادتی اور تکرار۔ دوسری یہ کہ وہ دیکھتے ہیں کہ خدا مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا، شہیدوں اور سچے مجاہدین جو جامِ شہادت نوش نہیں کر سکے، کا اجر ضائع کرتا ہے۔ وان اللہ لا یضییع اجر المؤمنین۔ درحقیقت جو کچھ انہوں نے پہلے سنا ہوا تھا اب وہ اسے واضح طور پر دیکھیں گے۔

۱۔ بعض متقیین دو طرح کے لوگوں کے لیے حیاتِ برزخ کے قائل ہیں ایک بہت زیادہ نیک اور دوسرے بہت زیادہ بُرے۔

۲۔ استبشار کا معنی ہے بشارت پانا یا خود نعمت حاصل کرنے پر خوش ہونا یا دوسروں کے نعمت پانے پر مسرور ہونا اور اس کا معنی بشارت دینا نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں پہلی تفسیر کی رو سے "لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون" کی تفسیر میں دنیا میں رہ جانے والوں کی طرف لوٹی ہیں جبکہ دوسری تفسیر کی رو سے خود شہداء کی طرف لوٹی ہیں۔



## روح کی بقاء کا شاہد

جو آیات مراحت سے بقاءِ روح پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے زیر نظر آیات بھی ہیں جو موت کے بعد حیاتِ شہداء کے بارے میں ہیں۔ بعض نے یہ جو احتمال دیا ہے کہ حیات سے مراد ان کی مجازی زندگی ہے اور مقصد ان کی زحمات کے آثار اور نام و نشان کی بقا ہے یہ مفہوم آیات کے معنی سے بہت بعید ہے۔ یہ مفہوم مندرجہ بالا آیات کے کسی جملے سے پیدا نہیں ہوتا چاہے شہداء کے روزی حاصل کرنے کا معاملہ ہو یا مختلف حوالوں سے ان کے سرور و انبساط کا تذکرہ۔ علاوہ انہیں زیر نظر آیات وجودِ برزخ اور نعماتِ برزخ پر واضح دلیل ہیں۔ اس کی تشریح سورہ مومنون کی آیت ۱۰۰ کے ذیل میں تفصیل سے پیش کی جائے گی۔ مذکورہ آیت یوں ہے:

وَمَنْ قَرَأَ نَسِيحَةَ بَرَزَخٍ إِلَىٰ يَوْمِهِ يُبْعَثُونَ

## شہیدوں کا اجر

مقامِ شہداء کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہر قوم و ملت اپنے شہداء کے لیے ایک مخصوص مرتبے کی قائل ہے لیکن اسلام نے راہِ خدا کے شہداء کو جو احترام دیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ ذیل میں ایک مثال پیش کی جا رہی ہے جو اسلام کی نظر میں احترامِ شہداء کا ایک واضح نمونہ ہے۔ اسلام کی اپنی تعلیمات کی وجہ سے ایک مختصر سی پسماندہ جماعت میں ایسی قوت و طاقت آگئی جس نے دنیا کے عظیم ترین شاہی نظاموں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ مذکورہ روایت یہ ہے:

امام علی بن یحییٰ رضا علیہا السلام امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

ایک مرتبہ آنحضرتؐ خطبہ دے رہے تھے اور لوگوں کو جہاد کا شوق دلا رہے تھے۔ اس دوران میں ایک نوجوان کھڑا ہو گیا۔ اُس نے عرض کیا، اے امیر المومنین! مجھ سے راہِ خدا میں جنگ کئے والوں کی فضیلت بیان فرمائیے۔ امام نے جواب میں فرمایا: ایک دفعہ میں پیغمبرؐ خدا کی سواری پر آپ کے پیچھے سوار تھا۔ ہم جنگ ذاتِ السلاسل سے واپس آ رہے تھے۔ یہی سوال جو تو نے مجھ سے کیا ہے میں نے رسول اللہؐ سے کیا، تو آپ نے فرمایا: جب مجاہد میدانِ جہاد میں شہرت کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں تو خداوند عالم جہنم سے آزادی ان کے لیے متدرک کر دیتا ہے اور جب وہ ہتھیار اٹھا کر میدانِ جنگ کا رخ کرتے ہیں تو ملائکہ ان پر فخر کرتے ہیں اور جب ان کی بیوی بچے، عزیز و اقارب انہیں الوداع کہتے ہیں تو وہ اپنے گناہوں سے آزاد ہو جاتے ہیں..... پھر وہ جو بھی کام کرتے ہیں اس کا اجر دوگنا ہو جاتا ہے اور ہر دن کے بدلے ان کے لیے ہزار عبادت کی عبادت کا اجر لکھا جاتا ہے اور جب وہ دشمن کے آسنے سامنے ہوتے ہیں تو پورے عالم کے لوگ ان کے میزانِ ثواب کا اندازہ نہیں کر سکتے اور جب وہ میدانِ جنگ میں قدم رکھتے ہیں، نیزہ و تیر کا تبادلہ ہونے لگتا ہے اور پھر دستِ بدست لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو فرشتے اپنے پر وبال سے انہیں گھیر لیتے ہیں اور خدا سے میدان میں ان کی ثابت قدمی کی دعا کرتے ہیں۔ اس وقت ایک منادی آواز دیتا ہے: الجنة تحت ظللال السیوف (یعنی۔ جنت تلواروں کے سائے میں ہے)۔ اس وقت شہید کے جسم پر دشمن کے وار زیادہ آسان اور گرمیوں میں ٹھنڈا



پانی پینے سے زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں اور جب شہید اپنی سواری سے لوثتا ہوا کرتا ہے تو زمین تک پہنچنے سے پہلے حوران بہشت اس کے استقبال کو آتی ہیں اور اسے ان تمام عظیم روحانی و مادی نعمتوں کی خبر دیتی ہیں جو خدا تعالیٰ نے اس کے لیے فراہم کر رکھی ہیں اور جب شہید زمین پر گر پڑتا ہے تو زمین کہتی ہے: آفرین ہے پاکیزہ روح کے لیے جو پاکیزہ بدن سے پرواز کر رہی ہے، تیرے لیے خوشخبری ہے، ان لك ما لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر (یعنی۔ تیرے انتظار میں ایسی نعمتیں ہیں جنہیں کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہے نہ کسی کان نے ان کے بارے میں سنا ہے اور نہ کسی دل میں ان کا خیال آیا ہے)۔ نیز خدا فرماتا ہے: میں اس کے پس ماندگان کا سر پرست ہوں، جو کوئی انہیں خوش کرے گا اُس نے مجھے خوش کیا اور جو انہیں ناراض کرے گا اُس نے مجھے ناراض اور غضب ناک کیا۔

۱۴۲۔ الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا اسَابَهُمُ الْقَرْحُ  
لِلَّذِينَ احْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقُوا اَجْرَ عَظِيمٍ ۝

۱۴۳۔ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ  
اِيْمَانًا ۖ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝

۱۴۴۔ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ اِلَى الْبِلَادِ الَّتِي بَدَلُوا فِيهَا دِيَارَهُمْ فَمِنْهُمْ  
مَنْ رَضِيَ اَنْ يَكُونَ لَهَا رِضْوَانُ اللَّهِ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ۝

ترجمہ

۱۴۲ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی خدا اور رسول کی دعوت کو قبول کیا (اور ابھی اُن کے جنگ اُحد کے زخم تازہ تھے کہ وہ حمراء الاسد کے میدان کی طرف چل پڑے) ان میں سے نیک عمل کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔

۱۴۳ وہ ایسے اشخاص تھے جن سے (بعض) لوگوں نے کہا کہ (شکر دشمن کے) افراد نے تم پر (حلا کرنے کے لیے) اکٹھا کر لیا ہے ان سے ڈرو لیکن ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین ماحی ہے

۱۔ یہاں روایت کا خلاصہ ہے جو عظیم اسلامی مفسر مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں درج کی ہے۔



۱۷۴ اسی وجہ سے وہ (اس میدان سے) پروردگار کی نعمت و فضل کے ساتھ اس عالم میں لوٹے کہ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچی اور خدا صاحبِ فضل و بخشش ہے۔

تفسیر

غزوہٴ حمرہ الاسد

ہم کہہ چکے ہیں کہ جنگِ اُحد کے اختتام پر ابوسفیان کا فاتح شکر بڑی تیزی سے مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ روماد کے مقام پر پہنچے تو اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوئے اور انہوں نے مدینہ کی طرف لوٹنے اور باقی ماندہ مسلمانوں کو نابود کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ اطلاع پیغمبر اکرمؐ کو پہنچی تو آپ نے فوراً حکم دیا کہ جنگِ اُحد میں شریک ہونے والا لشکر دوسری جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ نے یہ حکم خصوصیت سے دیا کہ جنگِ اُحد کے زخمی سبھی لشکر کی صفوں میں با شامل ہوں۔ ایک صحابی کہتے ہیں:

میں بھی زخموں میں سے تھا لیکن میرے بھائی کے زخم مجھ سے زیادہ شدید تھے۔ ہم نے ارادہ کر لیا کہ جو بھی حالت ہو ہم پیغمبر اسلام کی خدمت میں پہنچیں گے۔ میری حالت چونکہ میرے بھائی سے کچھ بہتر تھی، جہاں میرا بھائی نزل پاتا میں اُسے کندھے پر اٹھا لیتا۔ بڑی تکلیف سے ہم شکر تک جا پہنچے پیغمبر اکرمؐ اور لشکرِ اسلام "حمرہ الاسد" کے مقام پر پہنچ گئے اور وہاں پڑاؤ ڈالا۔ یہ جگہ مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔

یہ خبر جب لشکرِ قریش تک پہنچی خصوصاً جب انہوں نے مقابلے کے لیے ایسی آمادگی دیکھی کہ زخمی بھی میدانِ جنگ میں پہنچ گئے ہیں تو وہ پریشان ہو گئے اور شاید انہیں یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ مدینہ سے تازہ دم فوج ان سے آئی ہے۔

اس موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے دلوں کو اور کمزور کر دیا اور ان میں مقابلے کی ہمت نہ رہی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مشرک جس کا نام معبد خزاعی تھا مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اصحاب کی کیفیت دیکھی تو اتنا ہی متاثر ہوا۔ اس کے انسانی جذبات میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا، آپ کی یہ حالت و کیفیت ہمارے لیے بہت ہی ناگوار ہے، آپ آرام کرتے تو ہمارے لیے بہتر ہوتا۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑا اور روماد کے مقام پر ابوسفیان کے لشکر سے ملا۔ ابوسفیان نے اس سے پیغمبر اسلام کے بارے میں سوال کیا تو اُس نے جواب میں کہا: میں نے تم کو دیکھا ہے کہ وہ ایسا عظیم لشکر لیے ہوئے تمہارا تعاقب کر رہے ہیں جس جیسا لشکر اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ابوسفیان نے اضطراب اور پریشانی کے عالم میں کہا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم نے انہیں قتل کیا، زخمی کیا اور منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔ معبد خزاعی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا کیا ہے، میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ایک عظیم اور کثیر لشکر اس وقت تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ جائیں اور مکہ کی طرف چل جائیں اور اس مقصد کے لیے





کہ سلمان ان کا تعاقب نہ کریں اور انہیں پیچھے ہٹ جانے کا کافی موقع مل جائے، انہوں نے قبیلہ عبدالمقیس کی ایک جماعت سے خواہش کی کہ وہ پیغمبر اسلام اور مسلمانوں تک یہ خبر پہنچادیں کہ البوسفیان اور قریش کے بت پرست باقی ماندہ اصحاب پیغمبر کو ختم کرنے کے لیے ایک عظیم لشکر کے ساتھ تیزی سے مدینہ کی طرف آ رہے ہیں۔ یہ جماعت گندم خریدنے کے لیے مدینہ جا رہی تھی جب یہ اطلاع پیغمبر اسلام اور مسلمانوں تک پہنچی تو انہوں نے کہا: حسبنا اللہ و نعم الوکیل (خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی اور مدافع ہے)۔ انہوں نے بہت انتظار کیا لیکن دشمن کے لشکر کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ لہذا تین روز توقف کے بعد وہ مدینہ کی طرف لوٹ گئے۔ مندرجہ بالا آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

الذین استجابوا لله و الرسول من بعد ما اصابهم القرع ؓ للذین احسنوا منهم و اتقوا اجر عظیم۔

جنہوں نے خدا اور پیغمبر کی دعوت قبول کی اور جنگ اُمد میں اٹھائے گئے زمنوں کے باوجود دشمن سے دوسری جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے ان میں سے نیک عمل کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں یعنی پاکیزہ نیت اور علومِ کامل سے میدان میں شرکت کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔

زیر نظر آیت میں ایک گروہ کے لیے اجر عظیم مخصوص کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی کچھ ایسے افراد تھے جو صحیح طور پر غصہ نہ تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منہلو (ان میں سے بعض) اس طرف اشارہ ہو کہ اُمد کے جنگجو لوگوں میں سے بعض کسی بہانے سے اس میدان سے کنارہ کش ہو گئے۔

اس کے بعد قرآن نے ان کی پامردی و استقامت کی ایک درخشاں نشانی کا یوں تذکرہ کیا ہے: الذین قال لهم الناس ان الناس قد جمعوا لكم فاخشوهم فزادهم ايماناً قالوا حسبنا الله ونعم الوكيل۔ یعنی۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں کچھ لوگوں نے (قبیلہ عبدالمقیس کے لوگ یا ایک روایت کے مطابق نعیم بن مسعود جو خبر لائے تھے) کہا کہ دشمن کی فرج جمع ہو گئی ہے اور وہ حملہ کرنے کو تیار ہے، ان سے ڈرو لیکن وہ نہ صرف یہ کہ ڈرے نہیں بلکہ اس کے برعکس ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین حامی ہے۔

اس استقامت، ایمان اور زبردست پامردی کے تذکرے کے بعد قرآن ان کے عمل کا تمجید بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: فاقلبوا بنعمة من الله و فضل۔ یعنی وہ اس میدان سے اللہ کے فضل و نعمت کے ساتھ لوٹے۔ نعمت و فضل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ دشمن سے کسی نظر ناک مکاراؤ کے بغیر ہی دشمن ان سے بھاگ گیا اور یہ صحیح سالم بغیر کوئی زحمت اٹھائے مدینہ پٹ آئے۔

فضل و نعمت میں ممکن ہے یہ فرق ہو کہ نعمت استمقاق کے طور پر اجرت کے مفہوم میں ہو اور فضل استمقاق سے بڑھ کر اور اس پر اضافہ ہو۔

۱۷ نور اشعلین، مجمع البیان، المنار اور دیگر کتب۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر ہے: لَمَّا يَعْسُدْ سَعْوًا - یعنی انہیں اس واقعہ میں تھوڑی سی تکلیف بھی نہیں پہنچی۔ جبکہ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ فَوَشَّوهُمُ الْفِدَاءَ اَنَّ كَيْفَ بَاتَتْ اَيُّ اَنْهَوْنَ نَعْمًا اَيُّ اَتْبَاعِ كَيْفَ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ اور خدا کے پاس عظیم فضل و انعام ہے جو حقیقی مومنین اور سچے مجاہدین کے انتظار میں ہے۔

### تربیت الہی کی فوری تاثیر

جنگ اعدا اور واقعہ مراد الاسد جس کی تفصیل گزر چکی ہے، ان دونوں مواقع پر مسلمانوں کے جذبے کا موازنہ کیا جائے تو انسان کو تعجب ہوتا ہے کہ ایک شکست خوردہ جماعت جس کے جذبے بلند نہ تھے، تعداد کافی نہ تھی اور جس میں بہت سے زخمی بھی موجود تھے اتنی تھوڑی سی مدت میں جو شاید چوبیس گھنٹے بھی نہ بنتی تھی اس کی حالت اتنی بدلی کہ وہ عزم راسخ اور بڑے دلورے اور جذبے کے ساتھ دشمن کے تعاقب پر آمادہ ہو گئی یہاں تک کہ قرآن ان لوگوں کے متعلق کہتا ہے جب انہیں اطلاع ملی کہ دشمن نے ان پر حملے کے لیے اکٹھا کر لیا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ ڈرے نہیں بلکہ ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور ان کی استقامت میں اضافہ ہو گیا۔ دراصل یہ ہدف و مقصد پر ایمان رکھنے کی خاصیت ہے کہ انسان پر مشکلات و مصائب جس قدر بڑھیں اور وہ انہیں زیادہ قریب سے دیکھے اس کی پامردی و استقامت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ایسے میں اس کی تمام روحانی و مادی قوتیں خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے متعہ ہو جاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی جماعت میں یہ عجیب و غریب تغیر انسانی تربیت کرنے والی آیات قرآن اور پیغمبر اسلام کے موثر و دل آویز ارشادات کی فوری اور گہری تاثیر کا غماز ہے اور یہ بات بذات خود ایک معجزے سے کم نہیں۔

۱۴۵۔ اِنَّ مَا ذَلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوْنَ اِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۱۴۵۔ یہ صرف شیطان ہی ہے جو اپنے پیروکاروں کو (بے بنیاد باتوں اور افواہوں کے ذریعے) ڈراتا ہے۔ ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر

یہ آیت غزوہ مراد الاسد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا ضمیر ہے۔ لفظ "ذَلِكُمْ" ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کو فرج قریش کی طاقت سے ڈراتے تھے تاکہ ان کے دلوں کو کمزور کریں۔ اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہے کہ انہیں نہ ڈرو یا کہ رو ان عبد القیس کا عمل فقط ایک شیطانی عمل ہے جو شیطان کے دوستوں کو ڈرانے کے لیے ہے یعنی ایسے دوسروں سے صرف شیطان کے دوستوں پر ہی اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اہل ایمان اور ثابت قدم لوگ ایسے دوسروں سے کبھی اثر نہیں لیتے۔ اس بنا پر جب تم شیطان



کے پیرو نہیں ہو تو تمہیں ان دوسروں سے متزلزل نہیں ہونا چاہیے۔

نیم بن مسعود یا کاروان عبد القیس کو اس لیے شیطان قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کا عمل واقعاً شیطانی تھا اور یہ اس کے ابہام اور دوسرے سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ قرآن و امارت میں ہر برسے اور غلط کام کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے چونکہ ایسے ہر کام کا انجام شیطانی مسوول کا سا ہے۔

یا شیطان سے مراد خود ہی اشخاص ہیں اور یہ ان مواقع میں سے ایک ہے جہاں لفظ شیطان اپنے انسانی مصداق کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ شیطان کا ایک وسیع معنی ہے اور اس کے مفہوم میں تمام گمراہ کرنے والے شامل ہیں، وہ انسان ہوں یا غیر انسان۔ جیسکہ سورہ انفصام آیہ ۱۱۲ میں ہے:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ

یعنی۔ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانی اور جناتی شیطانوں میں سے دشمن قرار دیے ہیں۔

و خافون ان کنتہم مؤمنین۔ آیت کے اخیر میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ایمان رکھتے ہو تو مجھ سے اور میرے حکم کی نافرمانی سے ڈرو یعنی ایمان اور غیر خدا کا خوف ان دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:

فَمَنْ يُؤْمِنْ بِرَبِّهِ فَكَانَ عَلَىٰ يَمِينٍ وَلَا كَرْهًا

یعنی۔ جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آتا ہے وہ کسی نقصان اور ظغیان سے نہیں ڈرتا۔ (جن - ۱۳)

اس بنا پر اگر کسی دل میں غیر خدا کا خوف پیدا ہو تو یہ ایمان کے کامل نہ ہونے کی دلیل ہے اور شیطانی دوسروں کے نفوذ کی نشانی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس بے کناں عالم ہستی میں پناہ گاہ صرف خدا ہے اور صرف وہی موثر بالذات ہے اور اس کی قدرت کے مقابلے میں کسی کی کوئی قدرت نہیں۔

اصولی طور پر مؤمنین اپنے ولی یعنی خدا کا مشرکین و منافقین کے ولی یعنی شیطان سے موازنہ کریں تو یہ بات ان پر قطعاً واضح ہو جائے گی کہ خدا کے مقابلے میں اُس کی کچھ قدرت و طاقت نہیں ہے۔ اس لیے اہل ایمان کو معمولی سی پریشانی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں کہیں ایمان نفوذ کرتا ہے لازمی طور پر وہاں جرات و شجاعت بھی نفوذ کرتی ہے۔

۱۶۶۔ وَلَا يَحْزَنكَ الَّذِينَ يَسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حِزْبًا فِي الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ

عَظِيمٌ

۱۶۷۔ إِنَّ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَلَهُمْ

عَذَابٌ أَلِيمٌ





ترجمہ  
۱۷۶ جو لوگ راہِ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں وہ تمہیں غلگین نہ کر دیں کیونکہ وہ ہرگز خدا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے (علاوہ ازیں) خدا چاہتا ہے (کہ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے اور اس کے نتیجے میں) آخرت میں ان کا کوئی حصہ قرار نہ دے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

۱۷۷ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر خرید لیا ہے وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

پیغمبر کے لیے تسلی

ولا يحزنك الذين يسارعون في الكفر

اس آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف ہے۔ اُحد کے دردناک واقعہ کے بعد خدا تعالیٰ نے انہیں تسلی دی کہ اسے پیغمبر پر جو تم دیکھتے ہو کہ راہِ کفر میں ایک گروہ دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے درپے ہے تو اس سے غلگین و محزون نہ ہونا، وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے (انہم لن يصنعوا الله شيئاً) بلکہ وہ خود اس راہ میں نقصان اٹھائیں گے۔ اصولی طور پر نفع و ضرر اور سود و زیاں ایسے موجودات کے لیے ہے جن کا وجود خود ان سے نہیں ہے لیکن خداوند ازل و ابدی جو ہر لحاظ سے بے نیاز ہے اور اس کا وجود غیر محدود ہے، لوگوں کا کفر و ایمان اور سعی و کوشش اس کے لیے کیا اثر رکھتی۔ جبکہ لوگوں کا ایمان ان کے اپنے تکامل و ارتقا کا باعث ہے اور کفر کی وجہ سے وہ خود تنزل و سقوط کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

يريد الله الا يجعل لهم حظا في الآخرة ولهم عذاب عظيم

خدا چاہتا ہے کہ اس راہ میں انہیں آزاد رکھے اور وہ اتنی تیزی سے راہِ کفر طے کریں کہ آخرت میں تھوڑا سا حصہ بھی نہ پائیں بلکہ عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہو۔

درحقیقت آیت کہتی ہے کہ اگر وہ لوگ راہِ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ خدا ان کی گرفت نہیں کر سکتا بلکہ خدا نے تو انہیں آزادی عمل دے رکھی ہے وہ جو کچھ کر سکتے ہیں کریں اور اس کا نتیجہ نعمتِ اخروی سے ان کی محرومی ہے۔ اس بناء پر نہ صرف یہ کہ آیت جبر پر دلالت نہیں کرتی بلکہ آزادی ارادہ کی ایک دلیل ہے۔

بعد الی آیت میں بات کو وسعت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان الذين اشتروا الكفر بالايمن لن يضرنا والله شيناً یعنی راہِ کفر پر تیزی سے جانے والے ہی ایسے نہیں بلکہ وہ تمام لوگ جو ایمان ہاتھ سے دے کر راہِ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں اور ایمان کے بدلے کفر خرید چکے ہیں وہ ہرگز خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ اس کا نقصان خود انہی کو پہنچے گا۔ آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ



فرماتا ہے: وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہاں ”عذاب الیم“ ہے جبکہ گذشتہ آیت میں ”عذاب عظیم“ آیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق اس بنا پر ہے کہ پہلی آیت میں جن کا ذکر ہے وہ کفر کے راستے میں زیادہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

۱۷۸. وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمَلِّئُهُمْ خَيْرًا لَّأَنفُسِهِمْ ط إِنَّمَا نُمَلِّئُهُمْ لِيُزِدُوا إِشْمَاءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ○

ترجمہ

۱۷۸ جو کافر ہو گئے ہیں (اور انہوں نے راہِ سرکشی اختیار کی ہے) وہ یہ خیال نہ کریں کہ اگر ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تو یہ ان کے نفع میں ہے، ہم تو یہ مہلت انہیں اس لیے دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کر لیں اور ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

تفسیر

جن پر بھاری بوجھ ہے

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمَلِّئُهُمْ

گذشتہ آیت میں دشمنانِ حق کی بہت زیادہ سعی و کوشش کے ضمن میں رسول اکرم کو تسلی دی گئی ہے اور ان کی دل جوئی کی گئی ہے اب اس آیت میں روئے سخن دشمنوں کی طرف ہے۔ اس میں انہیں درپیش بدبختی کے بارے میں گفتگو ہے۔ یہ آیت درحقیقت واقعہ اُحد اور اس کے بعد کے واقعات سے مربوط مباحث کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ ایک جگہ روئے سخن نبی کریم کی طرف تھا، دوسرے مقام پر مومنین کی طرف اور اب اس جگہ مشرکین مخاطب ہیں۔

مندرجہ بالا آیت مشرکین کو تنبیہ کرتی ہے اور انہیں ڈراتی ہے کہ وہ خدا کے عطا کردہ وسائل کبھی کبھار مل جانے والی کامیابیوں اور آزادی عمل کو اس بات کی دلیل قرار نہ دیں کہ وہ صالح افراد ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں صحیح یا یہ ان کے لیے خوشنودمی خدا کی نشانی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ گناہوں سے کم آلودہ گناہگاروں کو جس بیداری کے ذریعے متوجہ کرتا ہے، کبھی ان اعمال کے عکس، عمل کے ذریعے بیدار کرتا ہے اور یا کبھی ان سے سرزد ہونے والے اعمال کی بنا سب سزاؤں کے ذریعے بیدار کرتا ہے اور اس طرح انہیں راہِ حق کی طرف واپس لاتا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ابھی ہدایت کی

لے ”نملی“ کا معنی ہے ”ندد کرنا“ لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ مہلت دینے کے معنی میں بھی آتا ہے، جبکہ مہلت خود ایک قسم کی مدد ہے یہاں یہ لفظ مہلت کے معنی میں ہی ہے۔



اہلیت رکھتے ہیں اور لطفِ الہی کے حامل ہیں۔ حقیقت دین، مجازاتِ عمل اور تکالیف و زحمات ایسے لوگوں کے لیے نعمت شمار ہوتی ہیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقہم بعض الذی  
عملوا العلم یرجعون

خفگی پر اور دریاؤں میں تباہی و طغیانی لوگوں کے اعمال کا نتیجہ ہے تاکہ خدا ان کے بعض اعمال کا مزہ انہیں چکھائے  
شاید اس طرح یہ لوگ پلٹ آئیں۔

(روم - ۴۱)

لیکن وہ لوگ جو گناہ و معصیان میں فرق ہو جائیں اور طغیان، سرکشی اور نافرمانی کے آخری مرحلے تک جا پہنچیں، خدا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہا جاتا ہے کہ انہیں موقع دیتا ہے کہ ان کی کمر بارگاہ سے بوجھل ہو جائے اور وہ زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو جائیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پیچھے کے تمام پل تباہ کر دیے ہیں، واپس لوٹنے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں رہا، حیا و شرم کا پردہ چاک کر چکے ہیں اور ہدایتِ خداوندی کی اہلیت بالکل کھو چکے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت اس مفہوم کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے، جو کافر ہو گئے ہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے انہیں جو مہلت دی ہے وہ ان کے فائدے میں ہے بلکہ انہیں مہلت تو اس لیے دی جاتی ہے تاکہ وہ گناہ و سرکشی میں اضافہ کریں اور ان کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب ہے۔

دنیا کے اسلام کی شیراز خاتون حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام نے شام کی جابر و خود سر حکومت کے دربار میں کوشش یزید کے سامنے اپنے خطبے میں اسی آیت سے استدلال پیش فرمایا کیونکہ یزید ناقابلِ برگشت گواہ کا واضح مصداق تھا۔ خطبے میں آپ نے فرمایا:

تو آج خوش ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ چونکہ تو نے وسیع و مرعیٰ دنیا ہم پر تنگ کر رکھی ہے اور آسمان کے کنارے کو ہم پر بند کر دیا ہے اور قیدیوں کی طرح ہمیں دیار بیدار پھرا رہا ہے اس لیے یہ تیری قدرت و طاقت کی نشانی ہے اور یا خدا کے ہاں تیری قدر و منزلت ہے اور ہمارے لیے اُس کے ہاں کوئی راہ نہیں۔ یہ سب تیرا اشتباہ ہے۔ یہ تو نے اور آذادی خدا نے تجھے اس لیے دی ہے تاکہ تیری پشت بارگاہ سے بھاری ہو جائے اور دردناک عذاب تیرے منتظر میں ہے۔ خدا کی قسم اگر حوادثِ زمانہ مجھے ایک قیدی عورت کی شکل میں تیرے پایہ تخت میں لے آئے ہیں تو اس سے یہ خیال مت کر کہ میری نظر میں تمہاری کوئی تھوڑی سی بھی حیثیت یا قدر و وقعت ہے۔ میں تجھے چھوٹا، پست، ہر لحاظ سے حقیر اور ملامت، سرزنش اور پھکار کا مستحق سمجھتی ہوں۔ جو کچھ تجھ سے ہو سکتا ہے کر لے۔ خدا کی قسم تو ہمارے نور کو فنا کر نہیں کر سکتا۔ تو وحیِ جاوداں اور ہمارے آئینِ حق کو محو نہیں کر سکتا۔ تو نابود ہو جائے گا اور یہ تاجناک ستارہ یونہی چمکتا رہے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہ سوال بہت سے ذہنوں میں موجود ہے کہ بہت سے سنگم، گنہگار اور آلودہ دامن لوگ اس طرح نعمات میں کیوں مستغرق ہیں اور





انہیں سزا کیوں نہیں مٹی۔ زیر نظر آیت سے ضمنی طور پر اس کا جواب بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگ ہیں جو قابل اصلاح نہیں اور انہیں سنت آفرینش اور آزادی ارادہ و اختیار کے اصول کے مطابق ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ یہ سقوط کے آخری مرحلے تک پہنچ جائیں اور زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو جائیں۔

علاوہ ازیں قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات خدا ایسے لوگوں کو فراوان نعمتیں دیتا ہے اور جب وہ کامیابی اور مسرت کی لذت میں فرق ہوتے ہیں تو اپنا تک تمام چیزیں ان سے چھین لیتا ہے تاکہ اسی دنیا میں زیادہ سے زیادہ عذاب اور سزا کا مزہ چکھ لیں کیونکہ ایک دم خوشحال زندگی کا چھن جانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

فلما شؤا ما ذکر و ابلہ فتحنا علیہم ابواب کل شئ ۛ طحتی اذا فرحوا بما اوتوا  
اخذناہم بغتۃ فاذا ہم مبلسون

جب انہوں نے وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں فراموش کر دیں، تو ہم نے ہر اچھائی اور خیر کے دروازے ان کے لیے کھول دیے تاکہ وہ خوش ہو جائیں پھر اپنا تک جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا تھا واپس لے لیا لہذا وہ انتہائی تکلیف اور غم میں مبتلا ہو گئے۔

(انعام - ۴۴)

درحقیقت ایسے اشخاص ان لوگوں کی طرح ہیں جو ظلم و تشدد سے کسی درخت پر چڑھ جاتے ہیں، وہ جتنا اوپر جاتے ہیں زیادہ خوش ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ درخت کی چوٹی پر جا پہنچتے ہیں۔ اپنا تک سخت آندھی آتی ہے جو انہیں اوپر سے نیچے گرا دیتی ہے جس سے ان کی سب ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

## ایک ادبی نکتہ

آیت کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ لیزدادوا اشعا میں لام ”لام عاقبت“ ہے نہ کہ لام نایت ۛ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض اوقات حرف لام عربی لغت میں ایسے موقع پر آتا ہے جو انسان کو مبسوط و مطلوب ہو۔ مثلاً

لتخرج الناس من الظلمت الی النور

ہم نے قرآن تمہاری طرف اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف دعوت دو۔ (ابراہیم ۱)

واضح ہے کہ لوگوں کی ہدایت خدا کو مبسوط و مطلوب ہے۔ لیکن کبھی لام صرف ایسی جگہ بھی استعمال ہوتا ہے جو انسان کی ہدف غرض اور پسند نہ ہو بلکہ اس کے عمل کا نتیجہ ہو۔ مثلاً

لیکون لہم عدا و حزناً

فرعون کے ساتھیوں نے موسیٰ کو پانی میں سے اٹھایا تاکہ انجام کار وہ ان کا دشمن ہو جائے۔ (قصص - ۸)

یہ بات مسلم ہے کہ فرعون کے ساتھیوں نے موسیٰ کو پانی سے اس لیے نہیں اٹھایا تھا کہ وہ کل کو ان کا دشمن ہو جائے لیکن یہ سب ان کے کام کا نتیجہ تھا۔ یہ دونوں تعبیریں نہ صرف ادبیات عرب میں بلکہ باقی زبانوں میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

یہاں سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خدا نے کیوں کہا ہے کہ لیزدادوا اشعا ہم چاہتے ہیں کہ ان کے



گناہ زیادہ ہوں یہی اعتراض اس صورت میں ہو سکتا تھا جب لام "لام ملت" ہوتا اور یہ بدت و غرض کے طور پر ہوتا اور لام عاقبت کے طور پر نہ ہوتا اور یہ نتیجے کے لیے نہ ہوتا۔ اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہو گا: ہم انہیں مہلت دیتے ہیں، ان کا انجام یہ ہے کہ ان کی پشت بارگاہ سے بوجھل ہو جائے۔ لہذا یہ آیت نہ صرف یہ کہ جبر کی دلیل نہیں بلکہ اختیار اور ارادے کی آزادی کی دلیل ہے۔

۱۷۹۔ مَا كَانَ لِلَّهِ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ لِلَّهِ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيٰ مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

ترجمہ

۱۷۹

ممکن نہ تھا کہ خدا مؤمنین کو اسی شکل میں چھوڑ دیتا جس میں تم ہو مگر یہ کہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے۔ نیز (یہ بھی) ممکن نہ تھا کہ خدا تمہیں غیبی رازوں سے آگاہ کرے (کہ اس طرح تم علم غیب کے ذریعے مؤمنین اور منافقین میں تمیز کرنے لگے، کیونکہ یہ طریقہ سنت الہی کے خلاف ہے) لیکن خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (تو) تمہیں رازوں پر انہیں مطلع کرتا ہے جو ان کی رہبری کے لیے ضروری ہوتے ہیں (پس) اب جب کہ یہ دنیا پاک اور ناپاک میں تمیز کے لیے کشالی ہے، خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ، اگر تم ایمان لے آئے اور تم نے تقویٰ اختیار کر لیا تو تمہارے لیے اجر عظیم ہو گا۔

تفسیر

مسلمانوں کی تطہیر

واقعہ اُمد سے پہلے منافقین کا موضوع مسلمانوں میں زیر بحث نہیں آیا تھا اسی لیے وہ زیادہ تر کفار ہی کو اپنا دشمن سمجھتے تھے لیکن اُمد کی شکست کے بعد سچے مسلمانوں کی وقتی کمزوری اور منافقین کی کارکردگی کے لیے زمین ہموار ہو جانے پر انہیں سمجھ آیا کہ ان کے اور بھی خطرناک دشمن ہیں جن پر کڑی نگاہ رکھنا پڑے گی۔ یہ خطرناک دشمن منافق تھے۔ جنگ اُمد کے نتائج میں سے یہ ایک اہم نتیجہ تھا۔

زیر نظر آیت جو اس مقام پر واقعہ اُمد کے سلسلے کی آخری آیت ہے اس حقیقت کو ایک عمومی قانون کی صورت میں بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: مَا كَانَ لِلَّهِ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ — ممکن نہیں کہ خدا مؤمنین کو اسی حالت میں رہنے دے جس میں تم ہو اور ان کی تطہیر نہ کرے اور طیب کو خبیث سے ممتاز نہ کرے۔ یہ حکم سب کے لیے



ایک جیسا اور عمومی ہے۔ پروردگار کی ایک دائمی سنت ہے کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرے اور مسلمانوں میں مل جل کر رہنے لگے اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ پورے فطرتی آزمائشوں سے آخر کار اس کے اندرونی راز فاش ہو جائیں گے۔

مگر تنہا یہاں یہ سوال کیا جاتا اور بعض روایات کے مطابق کچھ مسلمانوں نے ایسا سوال کیا بھی، کہ وہ خدا جو رب کے معنی اسرار سے آگاہ ہے اس کے لیے کیا رکاوٹ ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی کیفیت سے آگاہ کرے اور علم غیب کے ذریعے مومن اور منافق میں تمیز کر دی جائے۔ آیت کا دوسرا حصہ اسی سوال کا جواب ہے، جس میں فرمایا گیا ہے: **وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ** - یعنی - خدا تمہیں پوشیدہ راز اور علم غیب نہیں دے گا کیونکہ معنی اسرار پر آگاہی عام لوگوں کے خیالات کے برعکس شکل کو عمل نہیں کرتی بلکہ بہت سے مواقع پر رازوں کے عیاں ہو جانے سے ہرج مرج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اجتماعی گمراہی کھل جاتی ہیں آسید کے چراغ بجھ جاتے ہیں اور عام لوگ سہمی دکاوش چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے لوگوں کی قدر و قیمت کا تعین ان کی کارکردگی کے حوالے سے ہونا چاہیے کسی اور طریقے سے نہیں بلکہ اس کے بعد مذکورہ حکم سے انبیاء الہی کا استثناء یوں بیان کیا گیا ہے: **وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رِيسَالِهِ مَنْ يَشَاءُ**۔ خدا جب چاہتا ہے اپنے پیغمبروں میں بعض کو منتخب کرتا ہے اور لامتناہی علم غیب کے کسی گوشے سے انہیں مطلع کر دیتا ہے اور لوگوں کے لیے اسرار کی انہیں خبر دیتا ہے جن سے آگاہی ان کی رہبری کی تکمیل کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال کئی دعویٰ اور دائمی قانون یہی ہے کہ لوگوں کی پہچان کا آئینہ ان کے اعمال ہی ہیں۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر ذاتی طور پر عالم غیب نہیں ہوتے نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا کے حکماء و علم کے ذریعے بعض نبی امور سے آگاہ ہوتے ہیں۔ لہذا کچھ ایسے افراد ضرور ہیں جو غیب سے آگاہ ہوتے ہیں اور وہ کس قدر آگاہ ہیں یہ بات خدا کی مشیت سے وابستہ ہے۔

کہے بغیر واضح ہے کہ اس آیت میں بھی مشیت سے مراد دیگر آیات کی طرح وہی ارادہ ہے جس میں حکمت و مصلحت کا فرما ہوتی ہے۔ یعنی خدا جسے اہل بھتا ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے اسے اسرار غیب سے آگاہ کر دیتا ہے۔

فَامَنُوا بِاللَّهِ وَرِسَالِهِ وَاِنْ تَوَمَّنُوا وَتَوَخَّوْا فَاِنَّكُمْ اَجْرًا عَظِيمًا

آیت کے آخر میں یہ بات ذہن نشین کروائی گئی ہے کہ یہ زندگی ایک آزمائش ہے، اس میں پاک اور ناپاک کو جدا جدا کر دیا جاتا ہے اور مومن و منافق میں تمیز کی جاتی ہے تو پھر تم اس آزمائش کی کھالی سے اچھی طرح سے نکل آؤ اور خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ لیکن صرف ایمان لانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ فرماتا ہے: اگر ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو عظیم اجر و ثواب تمہارے انتظار میں ہے۔ آیت میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ مومن کو طیب (پاکیزہ) قرار دیا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں پاکیزہ اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی پہلی خلقت پر تزلزلہ نہ ہے اور خارجی چیزیں اسے خمیت اور ناپاک زکریں۔ پاکیزہ پانی، پاکیزہ کپڑا اور دیگر اشیاء تب پاکیزہ ہیں جب انہیں خارجی آلودگی کے عوامل نہ لگیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان انسان کی پہلی فطرت ہے۔

وَلْيَبْلُغْكُمْ بَشِيرًا مِّنَ الْخَوْفِ وَالْبَلَاءِ۔ (بقرہ۔ ۱۵۵) کی تفسیر میں خدا کی آزمائشوں کے تذکرے میں اس بات کا تفصیلی جائزہ دیا جا چکا ہے کہ خدا کی آزمائشیں ایک طرح کی تربیت ہیں زکریٰ خدا ان کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے مذکورہ آیت کی تفسیر دیکھئے۔





۱۸۰۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا  
لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخَلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ  
وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ  
خَبِيرٌ

ترجمہ

۱۸۰۔ جو بخل کرتے ہیں اور خدا نے اپنے فضل و کرم سے جو کچھ دیا ہے خرچ نہیں کرتے وہ یہ گمان زکریا کریران کے لیے کوئی اچھی چیز ہے بلکہ یہ ان کے لیے بڑی چیز ہے۔ بہت جلدی روز قیامت جن کے بارے میں انہوں نے بخل کیا وہی چیزیں طوق کی طرح ان کی گردن میں ڈال دیں گے اور آسمانوں اور زمین کی میراث خدا کے لیے ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

قید و بند کا بھاری طوق

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ

زیر نظر آیت میں قیامت کے دن بخیلوں کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ بخیل جو مال جمع کرنے میں لگتے ہیں اور دولت و ثروت کی حفاظت میں کوشاں رہتے ہیں لیکن اسے بندگانِ خدا پر خرچ کرنے سے ابقتاب کرتے ہیں۔

آیت میں اگرچہ واجب مالی حقوق کا نام نہیں لیا گیا لیکن روایات اہل بیت میں اور اقوالِ مفسرین میں اسے مانعینِ زکوٰۃ سے مخصوص قرار دیا گیا ہے اور آیت میں جس قدر شدت دکھائی دیتی ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد مستحب انفاق اور خرچ کرنا نہیں ہے فرمایا گیا ہے: جو لوگ بخل کرتے ہیں اور خدا نے جو اپنے فضل و کرم سے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ نہیں کرتے وہ یہ گمان زکریا کریران کے نفع میں ہے بلکہ یہ تو ان کے نقصان میں جا پڑتا ہے۔ پھر قیامت میں ان کے انجام کا تذکرہ ہے: سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخَلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ جن اموال میں وہ بخل کرتے ہیں بہت جلد انہیں طوق بنا کر ان کی گردن میں ڈال دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مال سے واجب حقوق ادا نہیں کیے گئے اور معاشرے کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ انفرادی ہوگا کی نذر ہو گیا ہے اور بعض اوقات احمقانہ امور میں خرچ ہو گیا ہے اور یا بلا وجہ سے جمع کر کے رکھ دیا گیا اور اس سے کسی نے فائدہ نہیں



اٹھایا وہ دیگر اعمال انسانی کی طرح تبہیم اعمال کے قانون کے مطابق روز قیامت مجسم ہوگا اور درود ناک صورت عذاب کا ذریعہ بن کر آئے گا۔ ایسا مال طوق کی شکل میں مجسم ہوگا اور گردن میں ڈالا جائے گا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اس کا تمام تر بوجھ اٹھانے کا ذمہ دار ہے اگرچہ اس نے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا ہو۔ وہ زیادہ مال جو جنون کی حد تک کوشش سے جمع کیا جائے اور اس کی حفاظت کی جائے مگر وہ معاشرے کی خدمت کے لیے نہ ہو وہ اپنے مالک کے لیے زنجیر اور زندان کے سوا کچھ نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے مال سے معین متک ہی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن حد سے گزر جائے تو ایک طرح کی قید اور بے کار بوجھ کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں بجز یہ کہ اس کی روحانی برکات سے فائدہ حاصل کیا جائے اور اسے مثبت کاموں پر خرچ کیا جائے۔ ایسا مال نہ فقط روز قیامت اپنے مالک کے لیے ایک بیماری طوق بنے گا بلکہ اس دنیا میں بھی یہ ایسا ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرق ہے کہ قیامت میں آشکار ہوگا اور اس دنیا میں انتہائی مخفی ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر جنون اور حماقت کیا ہوگی کہ انسان مال کے حساب کتاب، حفاظت اور بچاؤ کے لیے درکار زمینیں اور ٹیکسوں اٹھانے کے علاوہ مال حاصل کرنے کی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے لیکن اس سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔ کیا قید و بند کا طوق اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

تفسیر عیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا خدا اس مال کو آگ کے طوقوں میں بدل دے گا۔ اس کے بعد کہا جائے گا

کہ جیسے دنیا میں تو اس مال کو کسی صورت اپنے سے دور نہیں کرتا تھا اب بھی اسے اٹھائے اور اپنی گردن میں ڈال لے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ آیت میں مال کو ما استھمد اللہ من فضله کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اموال اور دولت کے پیداواری ذرائع کا حقیقی مالک خدا ہے۔ جو کچھ کسی کو دیا گیا ہے یہ اس کا فضل و کرم ہے۔ اس لیے یہ گنجائش نہیں کہ کوئی شخص اس مال و دولت کو مالک حقیقی کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرے۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس جملے کا مفہوم عام ہے اور اس میں تمام نعمات الہی یہاں تک کہ علم و دانش بھی شامل ہے لیکن یہ احتمال آیت کے ظاہری مفہوم پر منطبق نہیں ہوتا۔

اس کے بعد آیت ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے: وَفِيهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — یعنی یہ مال براہِ خدا میں اور بندگانِ خدا کے لیے خرچ ہو یا نہ ہو آخر کار اپنے مالکوں سے جدا ہو جائیں گے اور خدا تمام آسمانوں اور زمین کی وراثتوں کا وارث ہے۔ جب ایسا ہی ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ ان اموال کے جدا ہونے سے پہلے ان کی معنوی و روحانی برکات سے فائدہ اٹھایا جائے نہ کہ انکی حسرت اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا جائے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔ بخل کرو گے تو بھی وہ جانتا ہے اور اگر انسانی معاشرے کے منافع میں اسے کامیں لاؤ گے تو بھی اسے معلوم ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے حسب مال اجر دے گا۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ۔

۱۸۱۔ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِيَاءُ

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۗ وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝



۱۸۲۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ اَيْدِيكُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ لِّلْعٰبِدِیْنَ

ترجمہ

۱۸۱۔ خدا نے ان لوگوں کی بات سنی ہے جو کہتے ہیں کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا یہ ہم لکھ لیں گے اور اسی

طرح ان کا پیغمبروں کو ناحق قتل کرنا بھی (ہم نے لکھ رکھا ہے اور ہم انہیں کہیں گے کہ جلانے والا عذاب چکھو)۔

۱۸۲۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی آگے بھیجی ہوئی کمائی ہے اور خدا (اپنے) بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

شان نزول

یہ آیات یہودیوں کی سرزنش کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں:

پیغمبر اکرم نے بنی قینقاع کے یہودیوں کو خط لکھا۔ اس میں انہیں نماز ادا کرنے، زکوٰۃ دینے اور خدا کو قرض دینے کی دعوت دی گئی۔

آنحضرت کا قاصد اس گھر میں گیا جو یہودیوں کی مذہبی تعلیم و تدریس کا مرکز تھا اس کا نام بیت المدارس تھا۔ قاصد نے یہ خط یہودیوں کے سب سے بڑے عالم فحاش کے ہاتھ میں دیا۔ اس نے خط پڑھنے کے بعد طنز پر لہجے میں کہا: اگر تمہاری باتیں سچی ہیں تو پھر یہ کہنا چاہیے کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں کیونکہ اگر وہ فقیر نہ ہوتا تو ہم سے قرض کی خواہش نہ کرتا۔ علاوہ ازیں محمد (ص) کا اعتقاد ہے کہ خدا نے تمہیں سود کھانے سے منع کیا ہے حالانکہ وہ خود تمہارے انفاق اور خرچ کرنے کے بدلے ربا اور سود کا وعدہ کرتا ہے۔

بعد میں فحاش نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اس نے یہ باتیں کہی ہیں۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: خدا نے یہودیوں کی کفر آمیز باتیں سنی ہیں، وہ کہتے تھے کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اب گروہ لوگوں کے سامنے انکار کرتے ہیں مگر خدا کے سامنے تو انکار نہیں کر سکتے کہ وہ سب باتوں کو سنتا ہے، وہ آواز کی ان کمزور ترین اور قوی ترین سب لہروں کو سنتا ہے جن کے ادراک سے انسانوں کے کان عاجز ہیں (لقد مسمع اللہ قول الذین قالوا ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء)۔ اس لیے ان کا انکار کرنا فضول ہے۔

۱۔ خدا کو قرض دینے سے مراد راہ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ یہاں قرض کا لفظ انسانوں کے جذبوں کو متحرک کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ یہ اشارہ ہے آیت "من یقرض اللہ قرصا حسنا۔ کی طرف۔ (مدید - ۱۱)

۳۔ آیت "یربوا الصدقات" کی طرف اشارہ ہے۔ (بقرہ - ۲۷۶)

۴۔ اسباب النزول از واقعی، صفحہ ۹۹ اور تفسیر روح البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں۔



اس سے مزید فرمایا: سنکتب ما قالوا۔ یعنی نہ صرف یہ کہ ہم ان کی باتیں سنتے ہیں ان سب کو لکھتے بھی ہیں۔ واضح ہے کہ لکھنے سے مراد ہماری طرح کا نذر پر لکھنا نہیں ہے بلکہ مراد آثارِ عمل کی حفاظت کرنا ہے۔ قانون بقائے مادہ کی ترمیم کے مطابق مادہ ختم نہیں ہوتا لیکن توانائی (ENERGY) میں بدل سکتا ہے اور یوں باقی رہتا ہے۔ اسی طرح فرشتگانِ خدا کا لکھنا بھی حفاظتِ عمل کی ایک قسم ہے جو ہر قسم کی کتابت سے بالاتر ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ان کی ان کفریہ باتوں ہی کو نہیں لکھا جاتا بلکہ وہ جو انبیاء و مرسلین کو قتل کرتے رہے ہیں اسے بھی ثبت کیا گیا ہے (وَقَاتِلُوا الَّذِينَ كَفَرُوا)۔ یعنی یہودیوں کی طرف سے انبیاء کا مقابلہ کرنا اور ان کے سامنے صفتِ آراء ہونا کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ پہلی مرتبہ کسی پیغمبر کا مذاق نہیں اڑا رہے بلکہ اپنی طویل تاریخ میں ایسے بہت سے جرائم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی جارت اس حد تک پہنچ گئی ہو کہ وہ انبیاء کو قتل کر دیں ان کے لیے کونسی تعجب کی بات ہے کہ وہ ایسی کفر آمیز باتیں اپنی زبان پر لائیں۔

مکن ہے کہا جائے کہ قتل انبیاء کا تعلق پیغمبر اسلام کے زمانے سے تو نہیں تھا لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ یہ نسبت اس بنا پر ہے کہ وہ اپنے بڑوں کے کاموں پر راضی تھے۔ اس لیے اس جوابدہی میں خریک تھے۔

باقی رہا ان کے اعمالِ مثبت کیے جانے اور ان کے اعمال کی نگرانی کا مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اس لیے ہے تاکہ روزِ قیامت پر سب ان کے سامنے رکھ دیا جائے اور ہم ان سے کہیں کہ اس وقت اپنے اعمال کا نتیجہ جلدانے والے عذاب کی شکل میں چکھو اور بقول ذوقوا عذاب الحریق)۔

یہ دردناک عذاب جس کی اس وقت تم تمنی چکھ رہے ہو خود تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ تم ہی تھے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، خدا تو کسی پر ظلم نہیں کرے گا ذلک بما قعدت ایدیکم و ان الله لیس بظلام للعبید۔ اصولی طور پر اگر تم جیسے ظالم اپنے اعمال کا بدلہ نہ پائیں اور وہ بھی نیک لوگوں کی صف میں کھڑے کیے جائیں تو یہ انتہائی ظلم ہے اور اگر خدا ایسا نہ کرے تو وہ ظلام یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا ہوگا۔ ہنچ البلاغہ میں حضرت امیر المؤمنین علی سے منقول ہے:

وایم الله ما كان قوم قط في غنصن نعمة من عيش فزال عنهم الا بذنوب

اجترحوها لان الله لیس بظلام للعبید۔

خدا کی قسم نعمت یافتہ گروہ سے اس وقت تک نعمت نہیں چھینی گئی جب تک وہ گناہوں کا مرتکب نہیں ہوا۔

(اس کے بعد امام علیہ السلام نے قرآن کا یہی جملہ بطور سند پیش کیا کہ) لان الله لیس بظلام للعبید (کیونکہ خدا

اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا اور کسی نعمت کے اہل شخص سے نعمت سلب نہیں کرتا)۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو ایک طرف سے جبروں کے مذہب کی نفی کرتی ہیں اور دوسری طرف انفال کے معاملے میں عدالت کا عمومی اصول بیان کرتی ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیرِ نظر آیت صراحت سے کہتی ہے کہ خدا کی طرف سے ہر سزا اور اجر ان اعمال کی جوڑ سے ہے جو لوگ اپنے قصد اور ارادے سے انجام دیتے ہیں۔ ذلک بما قعدت ایدیکم یعنی یہاں کاموں کے سبب ہے جنہیں تمہارے ہاتھ اگے بھیج چکے ہیں۔

ما شہد بر منہ آئندہ



دوسری طرف زیر بحث آیت صراحت سے کہتی ہے کہ خدا کبھی ظلم نہیں کرتا اور اس کی سزا کا قانون عدالت مطلقہ کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدلیہ اسی چیز کا اقتدار رکھتے ہیں۔ شیعہ اور اہل سنت کا ایک گروہ جسے معتزلہ کہتے ہیں۔ عدل کے قائل ہیں۔ ان کے مقابلے میں اہل سنت کا دوسرا گروہ جسے اشاعرہ کہتے ہیں، اس کا اس سلسلے میں عجیب و غریب عقیدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصولی طور پر خدا کے بارے میں ظلم کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اور وہ جو کام انجام دے میں عدالت ہے یہاں تک کہ اگر تمام نیک لوگوں کو جہنم میں اور تمام ظالموں کو بہشت میں لے جائے تو بھی اس نے کوئی ظلم نہیں کیا اور کوئی شخص اس میں چوں و چرا نہیں کر سکتا۔

زیر نظر آیت میں ایسے عقائد کو قطعی طور پر رد کر دیا گیا ہے۔ آیت کہتی ہے کہ اگر خدا کچھ افراد کو غلط کام کیے بغیر سزا دے تو وہ ظالم بلکہ ظالم ہوگا۔ لفظ ظالم بالذکر کا معنی ہے جس کا معنی ہے بہت ظلم کرنے والا۔

خدا تو کم سے کم ظلم نہیں کرتا پھر یہاں اس لفظ کا استعمال شاید اس بناء پر ہو کہ اگر وہ لوگوں کو کفر دانہ پر مجبور کرے اور برے کاموں پر ابھارنے والے امور ان میں پیدا کرے پھر ان اعمال کے جرم میں جو انہوں نے مجبوراً انجام دیے ہیں انہیں سزا دے تو یہ چھوٹا سا ظلم نہیں ہوگا بلکہ اس طرح تو وہ ظالم (بہت زیادہ ظلم کرنے والا) ہی قرار پائے گا۔

۱۸۳۔ اَلَّذِينَ قَالُوا اِنَّ اللّٰهَ عٰمِدٌ اِلَيْنَا اَلَا نُرْسُوْلٍ حَتّٰى يٰۤاْتِيَنَا

بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهٗ النَّارُ قُلُّ قَدْ جَاۤءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قِبَلِيۡ بِالْبَيِّنٰتِ وَا  
بِالَّذِيۡ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمۡ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيۡنَ ۝

۱۸۴۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ رُسُلًا مِّنْ قِبَلِكَ جَاۤءُوۡ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ  
وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيۡرِ ۝

ترجمہ

۱۸۳ (یہ) وہی (ہیں) جنہوں نے کہا کہ خدا نے ہم سے پیمان لیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ (معجزہ کے طوطے پر) ایسی قربانی نہ کرے جسے (آسمانی) آگ کھا جائے۔ ان سے کہیے کہ پھر تم نے مجھ سے پہلے آنے والے انبیاء کو کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو جبکہ وہ واضح دلائل اور جو کچھ تم کہتے ہو لے کر آئے تھے۔

۱۸۴ پس اگر یہ (بہتان تراش) تیری تمکذیب کرتے ہیں (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) یہ تم سے پہلے پیغمبروں کی (سچی) تمکذیب کر چکے

ماشیراز صفحہ سابقہ لے افعال کی نسبت ہاتھوں کی طرف اس لیے دی گئی ہے کیونکہ بیشتر کام ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں لیکن یہ حکم ہاتھ کے اعمال سے مخصوص نہیں اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ظالم کو کم اس کے ہاتھ سے انجام پایا ہے حالانکہ ہو سکتا ہے کہ کام میں اس کے ہاتھ کا کوئی دخل نہ ہو۔



ہیں جبکہ وہ (پہنمبر) واضح دلائل، متین و محکم تحریریں اور ضیاء بخش کتاب لائے تھے۔

## شانِ نزول

یہودیوں کے چند سرکردہ افراد پیغمبر اکرمؐ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے: تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ خدا نے تمہیں ہماری طرف بھیجا ہے اور تم پر کتاب بھی نازل کی ہے حالانکہ خدا نے تورات میں ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے ہم اس پر ایمان لے آئیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک جانور کی قربانی کرے اور آسمان سے (صافقہ کی صورت میں) آگ آئے جو اسے جلادے، اگر تم ایسا کر دکھاؤ تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

## تفسیر

### یہودیوں کی بہانہ تراشی

الذین قالوا ان الله عهد الينا.....

قبولِ اسلام سے پہلے کے لیے یہودی عجیب و غریب بہانے تراشتے تھے۔ ان میں سے ایک کی طرف زیر نظر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے: خدا نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر کی دعوت اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے آسمان سے آگ آکر اچک لے۔

مفسرین کہتے ہیں یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ انبیاء الہی اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے لازمی طور پر اس مخصوص معجزے کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ جانور ذبح کرتے ہیں اور آسمانی بمبلی کے ذریعے وہ لوگوں کے سامنے مل جاتا ہے۔

یہودی یہ فرمائش اگر واقعا ایک معجزے کے لیے کرتے ذکر ہٹ دھرمی اور بہانہ سازی کے طور پر تو ایک بات تھی لیکن انہی گذشتہ تاریخ اور پیغمبر اسلامؐ سے ان کی کشمکش واضح طور پر حقیقت ثابت کرتی ہیں کہ ان کا مقصد ہرگز تحقیق حق نہ تھا بلکہ وہ معاشرتی دباؤ اور واضح قرآنی استدلال سے فرار کے لیے نئی تجویزیں پیش کرتے رہتے تھے اور اگر ان کی کوئی تجویز زیر عمل آجھی جاتی تب بھی وہ یارن نہیں لاتے تھے۔ وہ تو اپنی کتب میں پیغمبر اسلامؐ کی سب نشانیاں پڑھ چکے تھے پھر بھی قبولِ حق سے گریزاں تھے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: قل قد جاءكم رسل من قبلي بالبينات وبالذي قلتم فلم قتلتموهم ان كنتم صدقین۔ یعنی ان بہانہ تراشیوں کے جواب میں ان سے کہیے کہ مجھ سے پہلے بنی اسرائیل کے کئی انبیاء آئے، وہ اپنے ساتھ واضح نشانیاں بھی لائے یہاں تک کہ انہوں نے اس طرح سے قربانی بھی تمہارے سامنے کی، اگر تم سچے ہو تو پھر ان پر ایمان کیوں نہیں لائے اور انہیں کیوں قتل کیا؟ حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور چند دیگر انبیاء بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے جو ان کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔





بعض متاخرین تفسیر نگار حضرات مثلاً تفسیر المنار کے مؤلف قربانی کے مسئلے کے بارے میں ایک اور احتمال ذکر کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کوئی جانور ذبح ہو اور آگ معجزانہ طور پر آسمان سے آکر اسے جلادے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے مذہبی احکامات میں قربانی کی ایک قسم جلی ہوئی قربانی کی تھی۔ اس کے مطابق وہ ایک جانور ذبح کرتے تھے اور خاص رسوم کے مطابق اسے آگ لگا دیتے تھے (ان مراسم کی تفصیل تورات سفر لاویان کی پہلی فصل میں موجود ہے)۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خدا نے ہم سے عہدے رکھا ہے کہ جلی ہوئی قربانی کا یہ حکم ہر آسمانی دین میں ہوگا اور چونکہ دین اسلام میں یہ نہیں ہے لہذا ہم تم پر ایمان نہیں لاتے۔

لیکن یہ احتمال تفسیر آیت میں بہت بعید ہے کیونکہ ازل تو اس لفظ کا مطف بیانات پر ہے کہ ان کا مقصد ایک معجزانہ کام ہے جو کہ اس تفسیر چرچا میں نہیں ہوتا دوسرا یہ کہ ایک جانور ذبح کر کے جلادینا ایک فضول کام ہے اور ایسا کام انبیاء کے لئے ہوئے آسمانی احکامات میں سے نہیں ہو سکتا۔

فان كذبوك فقد كذب رسل من قبلك

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تسلی دیتا ہے اور ان کی دمجبوتی کرتا ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی باتیں نہیں مانتے تو آپ پریشان نہ ہوں کیونکہ ایسا پہلے بھی بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ آپ سے پہلے کئی پیغمبر آئے ہیں جن کی انہوں نے تکذیب کی ہے۔

جلوا بالبينات والذبر والكتاب المنير

جبکہ ان انبیاء کے پاس واضح نشانیاں بھی تھیں، وہ آشکار معجزے بھی لاتے تھے (البینات)، محکم و بلند مرتبہ کتب بھی ان کے پاس تھیں (الذبر) اور وہ ضیاء بخش کتابوں کے بھی حامل تھے (الكتاب المنير) تو جو رہے کہ زبر، زبور کی جمع ہے جس کا معنی ہے ایسی کتاب جو استحکام اور پختگی سے لکھی گئی ہو کیونکہ یہ مادہ دراصل لکھنے کے معنی میں ہے لیکن اس سے ہر طرح کا لکھنا مراد نہیں بلکہ ایسا لکھنا جس میں استحکام ہو۔ باقی رہی یہ بات کہ "الذبر" اور "المنیر" میں کیا فرق ہے، جبکہ دونوں الفاظ کتاب کے بارے میں ہیں تو لیکن ہے یہ اس وجہ سے جو کہ پہلا لفظ ان انبیاء کی کتب کے بارے میں موجود حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے اور دوسرا لفظ تورات، انجیل کے بارے میں ہو کیونکہ قرآن نے سورہ مائدہ آیت ۴۴ میں ان کے لیے لفظ "نور" استعمال کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

انا انزلنا التورۃ فیہا ہدی و نور

اور دوسری آیت ہے:

واتیناہ الانجیل فیہ ہدی و نور

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ زبور آسمانی کتب کے صرف اس حصے کو کہتے ہیں جو وعظ و نصیحت پر مشتمل ہو لیکن آسمانی کتاب یا کتاب میر کتب کے ان حصوں کو کہتے ہیں جن میں انفرادی و اجتماعی قوانین ہوں (جیسا کہ موجودہ زبور جو حضرت داؤد کی طرف منسوب ہے) وعظ و نصیحت ہی ہے۔

۱۸۵۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۖ وَرِثْمَاتُ فَوْنٍ اَجُورِكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ  
فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ  
الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝



ترجمہ  
۱۸۵ ہر شخص موت کا ذائقہ چکھتا ہے اور تم روز قیامت اپنا اجر مکمل طور پر حاصل کرو گے پس جو لوگ (جہنم کی) آگ کی زد سے دور رہے اور بہشت میں داخل ہو گئے وہ سعادت سے بہکنار ہوئے اور حیات دنیا سرمایہ فریب کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر

### موت کا اٹل قانون

مناہین اور بے ایمان لوگوں کی ہٹ دھرمی کے تذکرے کے بعد اس آیت میں موت کے عمومی قانون کا تذکرہ ہے اور قیامت میں لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس سے پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کی دلجوئی بھی ہو جائے اور گناہ پیشہ مناہین کو تنبیہ بھی پہلے تو آیت میں ایک ایسے قانون کا تذکرہ ہے جو اس عالم کے تمام زندہ موجودات پر ماکم ہے۔ فرمایا: تمام زندہ چیزیں چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ایک دن موت کا مزہ چکھیں گی (کل نفس ذائقۃ الموت)۔

اگرچہ بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ یہ بھول جائیں کہ وہ فنا پذیر ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم اسے فراموش بھی کر دیں تب بھی وہ ہمیں نہیں بھلائے گی۔ اس دنیا کی زندگی آخر کار ختم ہو جائے گی اور ایک دن ایسا آئے گا جب موت ہر شخص کی تلاش میں آئے گی اور پھر بمبوزا اس جہان سے رختِ سفر باندھنا پڑے گا۔

اس آیت میں "نفس" سے مراد جسم و جان کا مجموعہ ہے اگرچہ بعض اوقات قرآن میں "نفس" صرف روح کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چکھنا یہاں احساسِ کامل کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ بعض اوقات انسان کوئی غذا آنکھ سے دیکھتا ہے یا ہاتھ سے چھوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی مکمل احساس پیدا نہیں کرتا لیکن کھینے سے مکمل احساس پیدا ہوتا ہے۔ گویا کارگرِ خلقت میں بالآخر موت ہی ہر موجود زندہ کے لیے ایک طرح کی غذا ہے۔

و انما توفون اجور کوم یوم القیامۃ

پھر فرمایا کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد جزا و سزا کا عمل شروع ہونا ہے۔ یہاں عمل ہے جزا کے بغیر اور وہاں جزا ہے عمل کے بغیر "توفون" کا معنی ہے "مکمل و موصولی" یہ لفظ نشاندہی کرتا ہے کہ روز قیامت انسان کو پورے طور پر جزا دی جائے گی۔ اس بنا پر اس میں کوئی مانع نہیں کہ عالم برزخ میں بھی انسان اپنے اعمال کے کھنڈاچ اور جزا کا سامنا کرے گا کیونکہ برزخ کی جزا و سزا مکمل نہیں ہے۔

فمن زحزح عن النار و ادخل الجنة فقد فاز۔

"زحزح" کا اصل معنی ہے "انسان کا اپنے تئیں کسی چیز کی قوت کشش سے آہستہ آہستہ نکالنا" اور "فاز" کا اصل معنی ہے "ہلاکت سے نجات اور محبوب تک رسائی"۔

زیر نظر جملے میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ آتشِ جہنم کے دائرہ کشش سے دور ہوں گے اور بہشت میں داخل ہوں گے وہ نجات یافتہ



ہوں گے اور اپنے محبوب و مطلوب کو پالیں گے۔

گویا دوزخ اپنی پوری قوت سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو عوامل انسان کو دوزخ کی طرف کھینچتے ہیں ان میں عجیب و غریب قوت جذب موجود ہوتی ہے۔ کیا تیز رو ہوس رائیال، غیر شروع جنسی لذتیں، جاہ و منصب اور ناجائز دولت و ثروت انسان کے لیے قوتِ جاذبہ نہیں رکھتیں؟

اس تعبیر سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر لوگ کوشش نہ کریں اور ان پر فریبِ عوامل کی قوتِ جاذبہ سے دور نہ ہوں تو آہستہ آہستہ ان کی طرف کھینچے جائیں گے۔ لیکن جو لوگ تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنے اوپر تدریجاً کنٹرول پالیتے ہیں اور نفسِ مطمئنہ کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ حقیقی نجات یافتہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور امن و اطمینان کا لطف اٹھاتے ہیں۔

وما الحیوة الدنیا الا متاع العرور

یہ جملہ گذشتہ بحث کی تکمیل کرتا ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ حیاتِ دنیا تو فقط غرور آمیز متاع ہے۔ یہ زندگی اور اس کے سرگرم عوامل دور سے بہت پر فریب ہیں لیکن جب انسان اسے پاتا ہے اور اسے قریب سے چھو لیتا ہے تو عملی طور پر اسے اندر سے خالی چیز نظر آتی ہے اور متاعِ غرور کا بھی بس یہی مفہوم ہے۔

علاوہ ازیں مادی لذتیں دور سے تو خالص دکھائی دیتی ہیں لیکن جب انسان ان کے قریب جاتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ طرح طرح کے رنج و الم سے آلودہ ہیں۔ یہ بھی مادی دنیا کے فریبوں میں سے ایک فریب ہے۔ اسی طرح عموماً انسان ان کے فنا پذیر کی طرف بھی توجہ نہیں کرتا لیکن بہت جلد اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس قدر جلدی زائل اور فنا ہونے والی ہیں۔ یہ تعبیرات قرآن و احادیث میں بار بار آئی ہیں اور ان سب کا ہدف ایک ہی ہے کہ انسان عالمِ مادہ اور اس کی لذات کو اپنا آخری ہدف و مقصد قرار نہ دے کیونکہ اس کے نتیجے میں تو انسان طرح طرح کے جرائم اور گناہوں میں غرق ہو جاتا ہے اور انسانی تکامل و ارتقاء کی حقیقت سے دور ہو جاتا ہے لیکن مادی دنیا اور اس کی نعمات سے اس حوالے سے استفادہ کرنا کہ یہ تکمیلِ بشریت کا ذریعہ ہیں نہ صرف مذموم و قبیح نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے۔

۱۸۶۔ لَتَبْلُوْنَ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فَتَلْتَمِعُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اَوْتَوْا  
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذٰى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا  
وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○

ترجمہ

۱۸۶ یہ طے شدہ ہے کہ تمہارے اموال اور تمہاری جانوں کے ذریعے تمہاری آزمائش کی جائے گی اور جن لوگوں (یعنی یہودیوں) کو تم سے پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہے اور اسی طرح جنہوں نے شرک کی راہ اختیار کر رکھی ہے ان سے



تم بہت سی تکلیف دہ اور آزار رساں باتیں سنو گے اور اگر تم نے صبر و استقامت اور تقویٰ اختیار کیا (کہ جو تمہارے لیے زیادہ مناسب ہے) تو پھر پرامن حکم اور قابل اطمینان امور میں سے ہے۔

## شان نزول

جب مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اپنے گھر اور کاروبار سے دور ہو گئے تو مشرکین نے ان کے اموال کی طرف دستِ تجاوز دراز کیا اور انہیں اپنے زیر تصرف لے آئے اور جو شخص بھی ان کے ہاتھ لگا اسے زبانی اور جسمانی اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

دوسری طرف جب مسلمان مدینہ آئے تو وہاں پر انہیں یہودیوں کی بدگوئی اور آزار رسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر ان میں سے ایک بد زبان اور کینہ پرور شاعر تھا۔ اس کا نام کعب بن اشرف تھا۔ وہ مسلسل پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کی جھوکتا تھا اور مشرکین کو ان کے خلاف ابھارتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں فحش اور شنی بازئی سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کی بے حیائی اور گستاخی آخر اس حد تک پہنچ گئی کہ پیغمبر اکرمؐ نے مجبوراً اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں فی النہدہ و السقر ہو گیا۔

مفسرین کی نقل کردہ روایات کے مطابق مندرجہ بالا آیت انہی موضوعات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور مسلمانوں کو مقابلہ جاری رکھنے کے لیے شوق دلاتی ہے۔

## تفسیر

### مقابلے اور پامردی سے شکر نہ جاؤ

لتبطلون فی اموالکم و انفسکم

جان و مال کے ذریعے تمہارا امتحان لیا جائے گا اور اصولی طور پر یہ دنیا تو میدانِ آزمائش ہی ہے اور اپنے آپ کو سخت اور ناگوار حوادث و مشکلات کے مقابلے میں آمادہ نہ رکھے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ درحقیقت یہ سب مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے اور آمادہ ہونے کے لیے تلقین ہے تاکہ وہ یہ گمان نہ کر لیں کہ سخت حوادث ان کی زندگی سے ختم ہو چکے ہیں اور یا کعب بن اشرف جیسے بدگو، بد زبان اور فتنہ پرور شاعر کے فتنے سے دشمن کی طرف سے کوئی اذیت یا زہان کا زخم نہیں پہنچے گا۔

اسی لیے فرمایا: ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و من الذین اشرکوا اذی کثیرا۔

یعنی یہ بات طے شدہ ہے کہ تم آئندہ بھی اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔

دشمن سے ناروا باتیں سنانا ان آزمائشوں کا حصہ ہے جن کا ذکر آیت کے ابتدائی حصے میں کیا گیا ہے اس کے باوجود یہاں اس کا



ذکر خصوصیت سے ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ زبان کے چرکے حساس اور شریف انسانوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے کہ تلوار کے زخم تو بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم مندمل نہیں ہوتے۔

وان تصبروا و تنتقوا فان ذلك من عزم الامور

یہاں شدید اور المناک حوادث کے موقع پر مسلمانوں کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے؛ اگر استقامت اور پامردی سے کام لو، صابر و بردبار رہو اور تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو تو یہ ایسے کام ہیں جن کا نتیجہ واضح ہے۔ لہذا ہر عقلمند آدمی کو ایسا کرنے کا مصمم ارادہ کر لینا چاہیے۔

لغت میں ”عزم“ کا معنی ہے ”پختہ ارادہ“۔ بعض اوقات بہر حکم و مضبوط چیز کو عزم کہا جاتا ہے اس لیے عزم الامور کا معنی ہے شائستگی اور مناسب کام، جن کی انجام دہی کے لیے انسان کو مصمم ارادہ کر لینا چاہیے یا پھر اس کا مطلب ہے بہر قسم کے محکم اور قابل اطمینان کام۔

صبر اور تقویٰ کا آیت میں ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔ یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ بعض افراد استقامت و پامردی کے باوجود ناشکری کا اظہار کرتے ہیں اور زبان شکایت کھولے رکھتے ہیں لیکن حقیقی مومن وہ ہیں جو صبر و استقامت کے ساتھ تقویٰ و پرہیزگاری کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ناشکری اور شکوہ و شکایت سے دور رہتے ہیں۔

۱۸۷۔ وَاِذَا خَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ اَوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ ۗ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبُئِسَ مَا يَشْتَرُونَ ۝

ترجمہ

۱۸۷ اور وہ وقت (یا دیکرو) جب خدا نے اہل کتاب سے میثاق لیا کہ اسے لوگوں کے سامنے لازمی طور پر آشکار کریں اور چھپائیں نہیں لیکن انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر دیا، انہوں نے کیسی بڑی متاع خریدی۔

تفسیر

وَاِذَا خَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ اَوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ

اہل کتاب کی چند غلط کاریوں کے تذکرے کے بعد اس آیت میں ان کے ایک اور بڑے کام کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ ہے حقائق کو چھپانا۔ فرمایا گیا ہے؛ وہ وقت نہ بھول جاؤ جب خدا نے اہل کتاب سے یہ بیان لیا کہ وہ آیاتِ الہی کو لوگوں کے سامنے آشکار کریں اور انہیں ہرگز نہ چھپائیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "لتبیب ذنہ" میں اگرچہ لامِ قسم اور فونِ تاکیدِ ثقیدہ موجود ہے جس سے انتہائی تاکید ظاہر ہوتی ہے پھر "ولا تلکتمونہ" کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے جس میں نہ چھپانے کا حکم ہے۔ ان تمام تعبیرات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے گذشتہ انبیاء کے ذریعے ان سے اس بات پر نہایت تاکید می عہد لیا کہ وہ حقائق کو بیان کریں گے لیکن ان تمام امور کے باوجود انہوں نے خدا سے باندھے گئے حکمِ پیمان میں خیانت کی اور آسمانی کتب کے حقائق کو چھپایا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے: فنبذوہ وراہ ظہودہم۔ یعنی انہوں نے کتابِ خدا کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ جملہ عمل نہ کرنے اور اسے فراموش کر دینے کے بارے میں عمدہ کنایہ ہے کیونکہ جس پر وگرام پر انسان کے عمل کا طرہ مدار ہوتا ہے اسے وہ اپنے سامنے رکھتا ہے اور اسے دیکھتا رہتا ہے لیکن اگر وہ اس پر عمل نہ کرنا چاہے اور اسے فراموش کر دینا چاہے تو سامنے سے اٹھا کر اسے پس پشت ڈال دیتا ہے۔

واشتر و ابہ ثمننا قلیلا فبئس ما یشترون۔

یہ جملہ ان کی شدید دنیا پرستی اور فکری انحطاط کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: اس کام کے بدلے انہوں نے قیمری قیمت حاصل کی اور یہ پونجی کسی بُری ہے جو انہوں نے حاصل کی ہے۔ اگر انہوں نے انحضرتؐ کے اس جرم کے بدلے بہت بڑی قیمت حاصل کی ہوتی تو یہ کہا جاتا کہ کثرتِ مال و ثروت نے ان کی آنکھ کو اندھا اور کان کو بہرہ کر دیا لیکن تعجب تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ متاعِ قلیل کے بدلے بیچ دیا ہے (البتہ اس مجلس سے سبست ہمت علماء کا کام مراد ہے)۔

### علماء کی عظیم ذمہ داری

مندرجہ بالا آیت اگرچہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے علماء کے بارے میں ہے لیکن حقیقت میں تمام مذہبی علماء کو اس میں تہنید کی گئی ہے کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ فرامینِ الہی اور معارفِ دینی واضح کرنے کی کوشش کریں اور خدا تعالیٰ نے ان سب سے اس سلسلے میں تاکید می عہد و پیمان لیا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں لفظ تبیین آیا ہے۔ اس کے مادے کی طرف توجہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں مقصود صرف آیاتِ خدا کی تلاوت اور کتبِ آسمانی کی نشر و اشاعت نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے حقائق کو واضح و آشکار کر کے لوگوں تک پہنچایا جائے تاکہ سہ طرح کے لوگ پوری وضاحت سے ان سے آگاہ ہو سکیں اور ان کی روح اور حقیقت تک پہنچ جائیں اور جو تبیین، توضیح اور تفسیر نہ کریں گے اور مسلمانوں تک حقائق کی روشنی پہنچانے میں کوتاہی کریں گے وہ اسی انجام کے مستحق ہوں گے، جس کا ذکر زیرِ نظر آیت میں اور دیگر آیات میں یہودی علماء کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

اسلام کے پیغمبرِ گرامی سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

من کتمہ علما عن اہلہ الجہنم یوم القیامتہ بلجامہ من نار

جو شخص علم و دانش کو اس کے اہل (اور ضرورت مند) سے چھپائے گا، قیامت کے دن خدا ان کے مزید (جہنم کی) آگ کی لگام دے گا۔

حسن بن عمار راوی ہے:



ایک دن میں زہری کے پاس گیا جبکہ اُس نے لوگوں کو احادیث پہنچانے کا سلسلہ ترک کر رکھا تھا۔ میں نے اُس سے کہا: جو احادیث تم نے سن رکھی ہیں وہ مجھ سے بیان کرو۔ وہ بولا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ اب میں کسی سے حدیث بیان نہیں کرتا۔ میں نے کہا: بہر حال تم مجھ سے حدیث بیان کرو یا پھر میں تمہیں حدیث سناؤں گا۔ اُس نے کہا: تم حدیث بیان کرو۔ اس پر میں نے حضرت علیؓ کا یہ قول بیان کیا:

مَا اخذ الله على اهل الجهد ان يتعلموا حتى اخذ على اهل العلم ان يعلموا۔  
(یعنی۔ اللہ تعالیٰ نے اہل جہالت سے علم و دانش کے حصول کا عہد لینے سے پہلے علماء سے عہد لیا کہ وہ انہیں علم سکھائیں)۔

جب میں نے یہ بلا دینے والی حدیث اس کے سامنے پڑھی تو اُس نے اپنی مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا: اُسنو اب میں تمہارے سامنے بیان کروں گا۔

پھر اُس نے اسی نشست میں چالیس احادیث مجھ سے بیان کیں۔

علماء اہل کتاب کی خیانت کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کے لیے سورہ بقرہ آیات ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور سورہ آل عمران کی آیات ۱، ۲، ۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۸۸۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا آتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبْتَهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

۱۸۹۔ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○

ترجمہ

۱۸۸۔ یہ گمان نہ کیجئے کہ جو لوگ اپنے (برے) اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور (دوسری طرف یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایسے (نیک) کام کے ضمن میں ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے سرانجام نہیں دیا، وہ عذاب الہی سے امان میں ہیں (ایسا نہیں ہے بلکہ) ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۱۸۹۔ اور آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ کے لیے ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

لے تفسیر ابو الفتوح رازی و تفسیر مجمع البیان، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔ حضرت علیؓ سے مروی حدیث کا متن پہنچ ابلاغ کے کلمات تصاریف میں موجود ہے۔

## شان نزول

مفسرین و مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں کئی ایک شان نزول نقل کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: جب بعض یہودی اپنی آسمانی کتب کی تحریف اور ان میں موجود چیزوں کو پھپھانے میں لگے ہوئے تھے اور اپنے گمان میں اس سے کوئی نتیجہ حاصل کر رہے تھے تو وہ اپنے اس عمل پر بہت ہی شاد و مسرور تھے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ لوگ انہیں عامی دین عالم اور ذمہ دار افراد سمجھیں۔

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب بھی کوئی اسلامی جنگ درپیش ہوتی وہ طرح طرح کے بہانے کر کے جنگ میں شرکت نہ کرتے اور جب مجاہدین اسلام میدان جنگ سے واپس آتے تو یہ قسمیں کھاتے کہ اگر انہیں مجبوری نہ ہوتی تو وہ ہرگز جہاد ترک نہ کرتے اور وہ توقع رکھتے کہ اپنے ”آن کیے کاموں“ پر مجاہدین اور خدا کاروں کی طرح تحسین و آفرین حاصل کریں، اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

خود پسندی

لا تحسبن الذين يفرحون بما اتوا و يحبون ان يعمدوا بعالم يفعلوا

بڑے کام کرنے والے لوگ دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو حقیقتاً اپنے اعمال پر شرمندہ ہیں اور اپنی مرشدت و جبلت کی سرکشی کی وجہ سے بلائوں اور گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نجات بہت ہی آسان ہے کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ گناہ کے بعد پشیمان ہوتے ہیں اور ان کا بیدار وجدان انہیں سزا سنس کرتا ہے۔

دوسرے وہ ہیں جو نہ صرف یہ کہ احساسِ ندامت نہیں کرتے بلکہ وہ مغرور اور خود پسند ہوتے ہیں اور اپنے تمجیح اور سنگین گناہوں پر خوش ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان پر فخر و مباحات کرتے ہیں اور پھر اس سے بھی آگے وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ لوگ ان کی تعریف ایسے نیک کاموں کے ضمن میں کریں جو انہوں نے انجام بھی نہیں دیے۔

مندرجہ بالا آیت کہتی ہے:

یہ گمان نہ کرو کہ ایسے لوگ جو اپنے اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ انہوں نے جو کام نہیں کیے ان (کاموں) کی وجہ سے ان کی عزت کی جائے اور شان و شوکت بیان کی جائے کہ وہ عذابِ خدا سے دور ہیں اور نجات پالیں گے حالانکہ نجات تو ان اشخاص کے لیے ہے جو کم از کم اپنے بڑے کاموں پر شرمندہ ہیں اور یہ سوچ کر کہ وہ نیک کام نہیں کر سکے پشیمان ہیں۔

۱۔ اسباب النزول از واقعی، تفسیر المنار اور تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

صرف اس قسم کے خود پسند اور مغرور افراد نجات کے تقدر نہیں ہیں بلکہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھی جائے کہ ان نیک کاموں پر اظہارِ مسرت کے بارے میں ہے جن کے انجام دینے کی ہمیں توفیق دی گئی ہے۔ اگر یہ خوشی اعتدال کی حالت میں ہو اور فرد کا سبب نہ بنے تو یہ قابلِ مذمت نہیں ہے۔ اسی طرح ان نیک کاموں کے سلسلے میں جو انجام پانچے ہیں اظہارِ مسرت کرنا اگر وہ بھی اعتدال کی حد میں ہو اور اس کا سبب اس کے اپنے اعمال نہ ہوں تو یہ بھی مذموم نہیں ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے دوست یعنی وہ افراد جو ایمان کی بلند سطح پر فائز ہیں اور اس قسم کی مسرت و شادمانی سے دور رہتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے اعمال کو کمتر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو عظمت پروردگار کے سامنے ہیچ مسموم کرتے ہیں۔ ضمنیاً یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیت صرف ان منافقوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جو صدر اسلام میں تھے یا اسی قسم کے اور لوگ بلکہ وہ تمام افراد جو ہمارے زمانے میں مختلف اجتماعی حالات و کیفیات میں رہتے ہیں اور اپنے بڑے اعمال پر خوش ہیں یا جو لوگوں کو ابھارتے ہیں کہ وہ قلم اور زبان سے ان کے اعمال کی تعریف کریں وہ سب کے سب اس آیت کے مفہوم و مطلب میں شامل ہیں۔ ایسے لوگوں کا نہ صرف آخرت کا عذاب منتظر ہے بلکہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی لوگوں کے غیظ و غضب کی وجہ سے مخلوق خدا سے الگ تھلگ سے رہتے ہیں اور طرح طرح کی مشکلات کا نشانہ ہیں۔

وَاللّٰهُ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

خدا آسمان و زمین کا مالک ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ آیت مومنین کے لیے خوشخبری اور کافروں کے لیے دھمکی ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مومن ترقی کے لیے طیرے راستوں پر چلیں اور جو کام انہوں نے نہیں کیا اس کی تعریف چاہیں۔ ہاں وہ بیکر سکتے ہیں کہ آسمان و زمین کے مالک خدا کی قدرت کے سامنے میں رہتے ہوئے جائز اور صحیح طریقوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں نیز بدکار اور منافق لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ طیرے راستوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی حیثیت اور مقام حاصل کر لیں تو وہ یہ تصور نہ کریں۔ کیونکہ وہ اس خدا کے عذاب سے جس کی تمام موجودات پر حکومت ہے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔

۱۹۰۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الْيَلِّ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ

لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

۱۹۱۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّفُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ

فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۙ سُبْحٰنَكَ

فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

۱۹۲۔ رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تَدْخِلُ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهُ ۙ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ





## مِنْ أَنْصَارٍ ○

۱۹۳۔ رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلدِّيمَانِ أَنْ امْنُوا بِرَبِّكُمْ فَأَمَّا نَا رَبَّنَا  
فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ○

۱۹۴۔ رَبَّنَا وَإِنَّا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ  
إِنَّكَ لَا تَخْلِفُ الْمِيعَادَ ○

ترجمہ

۱۹۰۔ بے شک زمین و آسمان کی تخلیق اور رات دن کے آنے جانے میں صاحبان عقل کے لیے (روشن) نشانیاں ہیں۔

۱۹۱۔ وہ لوگ خدا کو ہاتھ بیٹھے اور اس وقت جبکہ وہ پہلو کے بل لیٹے ہوں یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی پیدائش

کے اسرار میں غور و فکر کرتے ہیں اور (کہتے ہیں) اے خدا! تو نے ہمیں فضول پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

۱۹۲۔ پالنے والے جس کو تو نے (اس کے اعمال کی وجہ سے) آگ میں ڈال دیا اُسے تو نے ذلیل و خوار کیا اس قسم کے ظالم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں۔

۱۹۳۔ اے پروردگار! ہم نے توحید کے منادی کی آواز سنی ہے، جو پکار رہا تھا کہ اپنے پالنے والے پر ایمان لاؤ اور ہم ایمان لے آئے (اب جبکہ ایسا ہے) اے خدا! ہمارے گنہوں کو بخش دے اور ہمارے کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر دے اور ہمیں نیکیوں کے ساتھ (اُن کے راستے پر) موت دینا۔

۱۹۴۔ اے خالق! جس چیز کا تو نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہمیں مرحمت فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا کیونکہ تو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

آیات کی اہمیت

یوں تو قرآن مجید کی سب کی سب آیتیں اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ وہ سب خدا کا کلام ہیں اور نوع بشر کی تعلیم و تربیت کے لیے

نازل ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض خاص قسم کی چمک دمک کھتی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ بالا پانچ آیات قرآن کی دل ہلادینے والی عبارتوں میں سے ہیں۔ یہ معارف دینی کا ایک ایسا نادر مجموعہ ہیں جن میں لطیف مناہات اور تفریح و تازاری کی آمیزش ہے اور وہ ایک آسمانی سرود معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو احادیث اور روایات میں انہیں خاص اہمیت دی گئی ہے۔

عطا بن ابی رباح کہتا ہے کہ میں ایک دن حضرت عائشہ کے پاس گیا اور ان سے سوال کیا کہ سب سے زیادہ عجیب چیز جو آپ نے پیغمبر اسلام سے دیکھی ہے وہ کیا ہے؟

وہ کہنے لگیں: پیغمبر کا سب کچھ تعجب خیز تھا لیکن عجیب ترین یہ تھا کہ ایک رات آنحضرت میرے حجرے میں استراحت کرنے گئے، اسی آرام نہیں کیا تھا کہ کھڑے ہو گئے۔ لباس پہنا، وضو کیا اور نماز شروع کر دی۔ حالت نماز میں اور مخصوص جذبہ الہی میں اس قدر آنسو بہائے کہ آپ کے لباس کا اگلا حصہ آپ کے اشکوں سے تر ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے سر سجدے میں رکھا اور اتنا گریہ کیا کہ زمین آپ کے آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ آپ طلوع صبح تک اسی طرح گریاں و منقلب رہے۔ جب بلال نے آپ کو نماز صبح کے لیے پکارا تو آپ کو اشکوں سے تر بتر دیکھا تو پوچھا کہ آپ اس قدر گریہ کیوں فرما رہے ہیں آپ کے تو لطف الہی شامل حال ہے۔ آپ نے فرمایا:

اخلا اکون لله عبدا شکورا

کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں، میں کیوں گریہ نہ کروں خدا تعالیٰ نے کل رات مجھ پر ہلادینے والی اور پریشان کر دینے والی آیات نازل کی ہیں۔

پھر آپ نے یہ پانچ آیات (جو زیر نظر ہیں) کی تلاوت شروع کی اور آخر میں فرمایا:

وید لمن قرأها ولم یتفکر فیہا

وائے جو اس پر جو انہیں پڑھے لیکن ان میں غور و فکر نہ کرے لیے

روایت کا آخری جملہ آیات میں گہرے غور و فکر کا حکم دیتا ہے۔ ایسے جملے بہت سی روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہیں۔

ایک روایت میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ پیغمبر خداؐ جب بھی نماز تہجد کے لیے اٹھتے پہلے سواک کرتے پھر آسمان کی طرف دیکھتے اور یہ آیات پڑھتے۔

روایات اہل بیتؑ میں حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی نماز تہجد کے لیے اٹھے ان آیات کی تلاوت کرے۔  
نوف بکالی حضرت علیؑ کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

ایک شب میں آپؑ کی خدمت میں حاضر تھا۔ ابھی مجھے نیمندہ آئی تھی میں نے دیکھا کہ امام اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور آپؑ نے ان آیات کی تلاوت شروع کر دی ہے۔ پھر مجھے پکارا اور فرمایا: اے نوف! سو رہے ہو یا جاگتے ہو؟

۱۔ تفسیر ابو الفتح رازی۔ زیر نظر آیات کے ذیل میں۔

۲۔ سنن نور الثقلین و مجمع البیان



میں نے عرض کیا، میں بیدار ہوں اور اس وسیع و عریض آسمان کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا کہنا ان لوگوں کا جنہوں نے اس زمین کی آلودگیوں کو قبول نہیں کیا اور اس طرح سے آسمان کی طرف گئے ہیں (یعنی۔ جنہوں نے عالم مادہ کی چار دیواری سے پرواز کی ہے اور ان کی بلند روح ملکوتِ آسمان کی سیر کرتی ہے)۔

تفسیر

خدا شناسی کا روشن ترین راستہ

ان فی خلق السموات والارض

قرآنی آیات صرف پڑھنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے سمجھنے اور ادراک کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ ان کی تلاوت تو انہیں سمجھنے کی تمہید ہے۔ اس لیے تو مندرجہ بالا آیت میں آسمان و زمین کی عظمت کا تذکرہ ہے اور فرمایا گیا ہے: آسمان و زمین کی خلقت اور روزِ شب کی آمد و رفت میں صاحبانِ عقل و خرد اور اہل فکر و نظر کے لیے واضح نشانیاں ہیں۔ یہ کہہ کر لوگوں کو اس عظیم خلقت میں غور و فکر کے لیے ابھارا گیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی استعداد اور پیمانہ فکر کے مطابق اس بے کنار سمندر سے اپنا حصہ لے اور اسرارِ آفرینش کے شفاف چشے سے سیراب ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں آفرینش کے بدیع نقوش، دکش تصویریں اور اس پر حاکم خیرہ کرنے والا نظام ایک بہت بڑی کتاب ہے جس کا حرف و حرف اور لفظ و لفظ اس عالم کے پیدا کرنے والے کے وجود اور اس کی یکتائی کی بہت ہی واضح دلیل ہے۔

الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً

اس جہاں کے گوشہ و کنار کی جو رعنائی اور دکھی وسیع عالم ہستی میں دکھائی دیتی ہے وہ صاحبانِ عقل کے دلوں کو یوں جذب کرتی ہے کہ وہ کھڑے ہوں یا بیٹھے، بستر پر مجبور آرام ہوں یا پہلو کے بل لیٹے وہ اس نظام کے خالق اور اس کے اسرار کی یاد میں مگن ہوتے ہیں۔ لہذا مندرجہ بالا آیت میں ارشادِ الہی ہے، عقل مند وہ ہیں جو قیام میں ہوں یا قعود میں یا پہلو کے بل محوِ استراحت خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کے اسرار میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں یعنی ہمیشہ اور ہر حالت میں اس حیات بخش نکر میں غوطہ زن رہتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے ذکر کا تذکرہ ہے اور پھر فکر کا یعنی صرف خدا کو یاد کرنا کافی نہیں۔ یہ تذکرہ اس وقت بہترین ثمرات کا حامل

۱۔ قرآن میں "اولوا الالباب" زیر نظر آیت کے علاوہ بعض دیگر آیات میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ صاحبانِ عقل کے لیے لطیف اشارہ ہے کہ چونکہ قلب دراصل ہر چیز کے خالص جوہر کہتے ہیں اور انسانی وجود کا جوہر عقل و فکر ہی ہے۔

۲۔ اختلافِ شب و روز اور اس کے اسرار کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۶۴ تفسیر نمونہ جلد اول میں بحث کی جا چکی ہے۔ کائنات کی خلقت میں جو نظم و ضبط موجود ہے وہ خدا شناسی کی روشن ترین دلیل ہے اس کی مزید توضیح کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجئے: آفریدگار جہاں، اسماعی ہستی اور ربوبی خدا۔





ہوگا اگر اس کے ساتھ غور و فکر بھی شامل ہو۔ جیسے آسمان وزمین کی خلقت پر غور کرنے میں یا خدا شامل نہ ہو تو یہ غور و فکر بھی کسی کام کا نہیں۔ ایسے کتنے ہی صاحبانِ علم و دانش ہیں جو فلکیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور آسمانی کائنات کی خلقت کے باہمی ربط میں عجیب و غریب نظم و ضبط کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ یا خدا سے غافل ہوتے ہیں اور توحید کی عینک ان کی آنکھوں پر نہیں ہے اور وہ عالم ہستی کو مبداءِ عالم کی شناسائی کے زاویے سے نہیں دیکھتے لہذا وہ انسانی تربیت کا لازمی نتیجہ اس مشاہدے سے اٹھ نہیں کر پاتے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایسی غذا کھاتا ہے جو صرف اس کے جسم کو تقویت بخشتی ہے اور اس کی فکر و نظر اور روح پر کوئی اثر نہیں کرتی۔

ربنا ما خلقت هذا باطلا

خلقت آسمان وزمین میں غور و فکر کرنے سے انسان کو ایک خاص آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس فکر کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ یہ مخلوق بے کار، فضول اور بھل نہیں ہے کیونکہ جب انسان اس جہان کی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی ایک عظیم مقصد کا مشاہدہ کرتا ہے تو کیا پھر وہ یہ باور رکھتا ہے کہ سارے کائنات کا سارا جہان بغیر کسی ہدف و مقصد کے ہو۔ انسان کو گھاس کے تنے کی مخصوص ساخت میں واضح اغراض و مقاصد دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کا دل، دل کی گہرائیاں اور درتپے ہر کوئی ایک پروگرام کا حامل ہے۔ آنکھ کے طبقوں کی ساخت کسی مقصد کے بغیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پلکوں اور ناخنوں تک ایک معین مقصد کے حامل ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ جس موجود کا ذرہ ذرہ مقصد و ہدف کا حامل ہو وہ خود مجموعی اعتبار سے بالکل بے مقصد ہو۔

اسی لیے تو صاحبانِ عقل اس زمزمہ پر سر دھنتے ہیں کہ۔ اے خداوند عالم تو نے اس عظیم کارخانے کو فضول پیدا نہیں کیا، بارہلنا! یہ اتنا بڑا جہان اور یہ عجیب و غریب نظام سب کا سب یقیناً حکمت و صلحت اور کسی صحیح ہدف و غرض کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔ پروردگار! یہ سب تیری وحدانیت کی نشانیاں ہیں اور تو عبث و فضول کام سے منزہ اور پاک ہے۔

ففتنا عذاب النار

عالم خلقت میں مقصد کے وجود کا اعتراف کرنے کے فوراً بعد صاحبانِ عقل و خرد اپنی خلقت کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان جو اس جہان ہستی کا شرع و نتیجہ ہے عبث نہیں پیدا کیا گیا اور مقصد اس کی تربیت اور تکامل کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اور وہ اس جہان کی جلد گزر جانے والی اور بے قیمت زندگی ہی کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے آگے ایک اور گھر ہے جہاں اس کے اعمال کی جزا و سزا ہوگی۔ جب اہل عقل یہ سوچتے ہیں تو اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور خدا سے ان کی انہام دہی کی توفیق کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ وہ عذابِ الہی سے مامون ہو جائیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں: خداوندا! ہمیں آتشِ مینہ سے بچالے۔

ربنا انك من تدخل النار فقد اخزيتہ و مال للظلمين من انصار

بارہلنا! جسے تو اس کے اعمال کے نتیجے میں، دوزخ میں ڈال دے اُسے تو نے رسوا و ذلیل کر دیا اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبانِ مقل جہنم کی آگ کی نسبت رسوائی سے زیادہ ڈرتے ہیں اور وحشت زدہ ہیں بڑے انسان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ رنج و غم اور دکھ درد تو برداشت کرنے کو آمادہ ہوتے ہیں لیکن اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کی نظر میں روزِ قیامت دردناک ترین عذابِ خدا اور بندوں کے سامنے رسوا اور ذلیل ہونا ہے۔

”ما للظلمین من انصار“ میں جو نکتہ پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ صاحبانِ بصیرت غرضِ آفرینش سے آگاہی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کی کامیابی اور نجات کا ذریعہ صرف اس کے اعمال و کردار ہیں اس لیے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا کیونکہ اصلی مددگار تو نیک عمل ہے جسے وہ گنوا بیٹھے ہیں۔

لفظ ”ظلم“ یہاں پر اس لیے ہے کہ ظلم گناہوں میں زیادہ اہم گناہ ہے اور یا اس لیے ہے کہ تمام گناہوں کا مطلب اپنے اوپر ظلم کرنا ہی ہے۔

البتہ آیت شفاعت (اپنے حقیقی مفہوم میں) کے منافی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم شفاعت کے ضمن میں کی گئی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ شفاعت مخصوص آمادگی کی محتاج ہے اور آمادگی کچھ نیک اعمال کے ذریعے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی ان لا ییمان ان امنوا بربکم فامنا

صاحبانِ مقل و خرد مقصد متعلق جان لینے کے بعد اس نکتے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ نشیب و فراز کے اس راستے کو خدائی رہنماؤں کی رہبری کے بغیر سرگڑھے نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے وہ ہر وقت ایمان اور صداقت کے منادیوں کی ندا سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ جب ان کی پہلی آواز ان کے کانوں میں پڑتی ہے تو وہ ان کی طرف پلکتے ہیں ہر ذریعہ غور و فکر اور جستجو کے بعد وہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے پورے وجود کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں۔ لہذا وہ اپنے پروردگار کے سامنے عرض کرتے ہیں: بارالہ! ہم نے توحید کے منادی کی آواز سنی جو ہمیں ایمان کی طرف دعوت دے رہا تھا اس کے بعد ہم ایمان لے آئے۔

ربنا فاغفر لنا ذنوبنا و کفرنا سیئاتنا و توخنا مع الابرار۔

بارالہ! جب معاملہ اس طرح سے ہے اور ہم مکمل طور پر ایمان لے آئے ہیں لیکن ہم غمناک انسانوں اور خواہشاتِ نفسانی کے شدید طوفانوں اور آندھیوں کی زد میں ہیں اس لیے ہم سے لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں اور ہم مختلف گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ اس لیے ہمیں بخش دے، ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر دے۔ ہمیں نیک اور صالح لوگوں کے راستے پر مرنے کی سعادت عطا فرما۔

اہلِ مقل انسانی معاشرے سے وابستہ ہیں مگر فرد پرستی سے بیزار ہیں۔ وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کی زندگی نیک لوگوں کے ساتھ ہو بلکہ ان کی موت بھی۔ چاہے وہ طبعی موت ہو یا راہِ خدا میں شہادت۔ نیک لوگوں کے ساتھ ہوا اور انہی کے طور طریقے کے مطابق ہو کیوں کہ بڑوں کے ساتھ مزاجی دوجہر ہے۔

یہاں سوال پیش آتا ہے کہ گناہوں سے بخشش کے تقاضے کے ساتھ برائیوں پر پردہ پوشی اور ان کی بخشش کے کیا معنی ہیں۔ قرآن حکیم کی دیگر آیات کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ سورۃ نسا کی آیت ۳۱ یوں ہے:

ان تجتنبوا کبار ما تلتھون عنہ مکفر عنکم سیئاً تکم  
 اگر گناہان کبیرہ سے اجتناب کرو تو ہم تمہاری برائیوں کی پردہ پوشی کریں گے اور انہیں محو کر دیں گے۔  
 اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیئات گناہان صغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ اس لیے اہل عقل پہلے تو اللہ سے بڑے گناہوں کی مغفرت  
 کا تقاضا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی گناہان صغیرہ کے آثار کے خاتمے کی دعا کرتے ہیں۔

دبنا و اتنا ما وعدتنا علیٰ رسولک . . . .

وہ لوگ آخری مرحلے میں راہ توحید طے کرنے، روز قیامت پر ایمان لانے، پیغمبروں کی دعوت قبول کرنے اور اپنی ذمہ داریاں  
 انجام دینے کے بعد خدا سے تقاضا کرتے ہوئے کہتے ہیں: اب جب ہم اپنا عہد و پیمان پورا کر چکے ہیں، بار الہا! تو نے اپنے پیغمبروں  
 کی معرفت ہم سے جو وعدہ فرمایا ہے اور خوشخبری دی ہے اس کو پورا فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا کیونکہ تو جس چیز کا وعدہ  
 کرتا ہے اس میں وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔

رسوا نہ ہونے کی خواہش کا پھر سے اظہار اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ وہ لوگ اپنی شخصیت کی اہمیت کے قائل ہیں  
 اس لیے وہ رسوائی کو دردناک ترین سزاؤں میں سے سمجھتے ہیں لہذا وہ پھر اسی پر انگشت رکھتے ہیں۔

امام صادق سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

جس شخص کو کوئی مہم درپیش ہو اور وہ پانچ مرتبہ "دبنا" کہے تو خدا اسے اس چیز سے رہائی بخشنے کا جس سے وہ

خوفزدہ ہے اور وہ جس چیز کی امید رکھتا ہے اسے پالے گا۔

کسی نے عرض کیا:

وہ پانچ مرتبہ کس طرح "دبنا" کہے۔

آپ نے فرمایا:

ان آیات کو پڑھے جن میں پانچ مرتبہ "دبنا" آتا ہے، تو فوراً ہی پروردگار کی طرف سے دعا قبول کرنی لگتا

ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے: فاستجاب لہم ربہم۔

کچھ کہے بغیر واضح ہے کہ ان آیات کی حقیقی اور گہری تاثیر اسی صورت میں ہے جب انسان کی زبان اس کے دل اور عمل سے  
 ہم آہنگ ہو۔ اہل خود کی طرز فکر، خدا سے ان کا عشق، ذمہ داریوں کی طرف ان کی توجہ اور نیک اعمال کی انجام دہی اس بات  
 پر دلالت کرتے ہیں کہ دعا کرنے والوں کو یہی راہ اپنانا چاہیے اور وہی خشوع و خضوع پیدا کرنا چاہیے جو اہل عقل خدا سے مناجات  
 کرتے وقت پیدا کرتے ہیں۔

۱۹۵۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ

ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ ۖ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا

مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقُتِلُوا أَوْ قُتِلُوا لَا كُفِرْنَا عَنْهُمْ





سَيَاتِهِمْ وَلَا دُخْلَتْهُمْ جَنَّتِ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مَنِ  
عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حَسَنُ الثَّوَابِ ○

ترجمہ

۱۹۵ خدا نے ان (صحابانِ عقل) کی درخواست قبول کر لی ہے اور فرمایا ہے کہ میں تم میں سے عمل کرنے والے کے عمل کو چاہے وہ عورت ہو یا مرد ضائع نہیں کروں گا، تم سب ایک ہی نوع میں سے ہو اور ایک دوسرے کی جنس ہو۔ جنہوں نے راہِ خدا میں ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکال دیے گئے اور انہوں نے میری راہ میں تکلیف اور اذیت کا سامنا کیا ہے اور جنگ کی ہے اور مارے گئے ہیں میں تم کھا کے کہتا ہوں کہ میں ان کے گناہ بخش دوں گا اور انہیں ان باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ خدا کی طرف سے ثواب ہے اور خدا کے مال ہی بہترین ثواب ہے۔

شان نزول

یہ آیت گذشتہ آیات کا ضمیر ہے۔ اس میں صحابانِ عقل و خرد کے اعمال کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ آیت کے شروع میں فاء تفریح اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ گذشتہ آیات سے مربوط ہے۔ اس کے باوجود اس کے بارے میں کئی ایک شان نزول مروی ہیں۔ لیکن یہ بات اس کے گذشتہ آیات سے مربوط ہونے کے منافی نہیں ہے۔ ایک شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ کی ایک زوجہ محترمہ جناب ام سلمہ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ قرآن میں مردوں کے جہاد، ہجرت اور فداکاری کی بہت گفتگو ہے، کیا عورتوں کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے۔ زیر نظر آیت اسی سوال کے جواب میں نازل ہوئی۔

یہ بھی منقول ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے جب فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنت رسول اللہ اور فاطمہ بنت زبیر (جنہیں فواطم کہا گیا ہے) کے ہمراہ ہجرت کی اور تمہاں جو ایک صاحبِ ایمان خاتون تھیں راستے میں آپ سے آئیں تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ شانہائے نزول اس بات کے منافی نہیں کہ زیر نظر آیت گذشتہ آیات سے مربوط ہے جیسے دونوں شانہائے نزول بھی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

## تفسیر

### اہل خرد کے اعمال کا نتیجہ

گذشتہ آیات میں اہل خرد کے ایمان، اعمال، دعاؤں اور تفریح و زاری کا ذکر تھا۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے:

فاستجب لہم ورجبہم — یعنی ان کے پروردگار نے ان درخواستوں کو فوراً قبول کر لیا۔ رجبہم (ان کا پروردگار) — یہ تعبیر ان پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کی حکایت کرتی ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: افی لا ضیاع عمل عامل منکم — اس بنا پر کہ کہیں اشتباہ نہ ہو اور سبغات و کامرانی کو انسان کے اعمال و کردار سے الگ نہ سمجھ لیا جائے فرمایا گیا: تم میں سے عمل کرنے والے کے کسی عمل کو میں ہرگز ضائع نہیں کروں گا۔ اس میں عمل کا ذکر بھی ہے اور عامل کا بھی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قبولیت دعا کا محور عملی وہ اعمال صالح ہیں جو ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ایسی درخواستیں فوراً قبول ہو جاتی ہیں جن کی ڈھال عمل صالح ہو۔

من ذکروا انشی بعضکم من بعض۔

اس بنا پر کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خدا کا یہ وعدہ کسی خاص گروہ سے مخصوص ہے، فرمایا گیا ہے کہ یہ عمل کرنے والا چاہے مرد ہو یا عورت اس میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ تم سب خلقت میں ایک دوسرے سے وابستہ ہو تم میں سے بعض، بعض دوسروں سے پیدا ہوتے ہیں، عورتیں مردوں سے اور مرد عورتوں سے۔

بعضکم من بعض — ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ تم سب کے سب ایک دین کے پیرو اور ایک ہی حقیقت کے طرفدار ہو اور ایک دوسرے سے ہم کاری رکھتے ہو لہذا کوئی وجہ نہیں کہ خدا تمہارے درمیان تعین روارکھے۔

فالدین ہاجروا واخرجوا من دیارہم و اذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنہم سیئانہم — اس سے پھر یہ تعبیر لگتا ہے کہ اس بنا پر وہ تمام لوگ جنہوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی ہے اور اپنے گھر اور وطن سے نکالے گئے ہیں انہوں نے راہ خدا میں تکلیفیں اٹھائی ہیں جہاد کیا ہے اور جانیں دی ہیں۔

پہلا احسان جو خداوند عالم کی طرف سے ان پر ہو گا وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم کھارکھی ہے کہ وہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا اور ان کی تکالیف اور شدائد کو گناہوں کا کفارہ قرار دے گا تاکہ وہ گناہوں سے بالکل پاک ہو جائیں۔

ولا دخلنہم جنات تجری من تحتہا الانہر

اس کے بعد فرماتا ہے کہ میں گناہوں کو بخشنے کے علاوہ یقیناً انہیں ایسی جنت میں جگہ دوں گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں جو گونا گوں نعمتوں سے بھری پڑی ہیں۔

ثوابا من عند اللہ واللہ عندہ حسن الثواب

یہ وہ جزا و ثواب ہے جو ان کی جا شاری کی وجہ سے خداوند عالم ان کو مرحمت فرمائے گا، بے شک بہترین ثواب اور اجر ایسی کے پاس ہے۔ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ دنیا والوں کے لیے خدا کے اجر و ثواب کی تعریف و توصیف مکمل طور پر نہیں کی جاسکتی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اس کی ذات والا صفات ہر ثواب اور جزا سے بالاتر ہے۔

آیت مندرجہ بالا سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو اعمالِ صالح کے سائے میں گناہوں سے پاک ہونا چاہیے اس کے بعد قربِ خدا اور بہشت اور اس کی نعمتوں کی طرف رخ کرنا چاہیے کیونکہ ابتدا میں فرماتا ہے: لا تغن عنہم سیئاتہم وادراس کے بعد و لا دخل لہم جنات یعنی بہشت پاک لوگوں کا مقام ہے اور جب تک انسان پاک نہ ہو وہ بہشت کے قریب نہیں پھینک سکتا۔

## مرد اور عورت کی روحانی قدر و قیمت

آیہ مذکورہ بھی قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح عورت اور مرد کو خدا کی درگاہ کے باطنی اور روحانی مقامات تک پہنچانے کے لیے ایک دوسرے کے برابر قرار دیتی ہے۔ آیت کی نظر میں جنس کا اختلاف، جسمانی ساخت کا فرق اور ان کے لیے بعض اجتماعی ذمہ داریوں کا فرق، مرد اور عورت دونوں کے لیے کمال انسانی کے حصول میں کسی فرق کی دلیل نہیں۔ بلکہ آیت اس حیثیت سے دونوں کو مکمل طور پر ایک ہی سطح پر رکھتی ہے جیسا کہ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک ادارے کے نظام کے لیے ایک شخص کو رئیس ادارہ بنا لیتے ہیں اور دوسرے کو معاون یا رکن۔ رئیس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کام میں زیادہ تجربہ اور اطلاعات وغیرہ رکھتا ہو، لیکن یہ فرق مراتب ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ رئیس ادارہ انسانی شخصیت اور قدر و قیمت میں اپنے ماتحتوں سے زیادہ ہے۔

قرآن مجید وضاحت کے ساتھ فرماتا ہے:

وَمَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ بِرِزْقٍ  
فِيهَا بَغَيْرِ حِسَابٍ۔  
(سورہ المؤمن آیت ۲۰)

مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک عمل کرے اور ایماندار ہو وہ بہشت میں داخل ہوگا اور اسے بے حساب روزی دی جائے گی (اور وہ اس جہان کی روحانی اور جسمانی نعمتوں سے فیض یاب ہوگا)۔

اسی طرح دوسری آیت میں ہے:

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ  
اَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔  
(سورہ نمل آیت ۶۴)

مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک کام کرے اور مؤمن ہو، ہم اسے پاکیزہ زندگی دیں گے اور بہت اچھی جزا دیں گے۔ یہ آیت اور اسی قسم کی دوسری متعدد آیتیں اس زمانے میں نازل ہوئیں جب دنیا کی تمام قومیں عورت کے انسانی نوع اور جنس بشر ہونے کے متعلق ڈانواں ڈول تھیں اور اسے حقیر و ذلیل مخلوق اور گناہ اور موت کا سرچشمہ سمجھتی تھیں۔

بہت سی گذشتہ قومیں یہ اعتقاد بھی رکھتی تھیں کہ عورت کی عبادت درگاہِ الہی میں قبول نہیں ہوتی۔ بہت سے اہل یونان تو عورت کو گندی مخلوق اور شیطانی عمل جانتے تھے۔ رومی اور بعض یونانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اصولی طور پر عورت میں انسانی روح کا فرما نہیں ہے۔ روح انسانی تو صرف مردوں کو دی گئی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ماضی قریب میں ہسپانیہ کے



یسانی عالم اس بارے میں بحث کر رہے تھے کہ کیا عورت مرد کی طرح روح انسانی رکھتی ہے اور کیا اس کی روح موت کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ آخر وہ بہت سی بحث اور تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے چونکہ عورت کی روح انسان اور حیوان کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے سوائے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی روح کے کسی عورت کی روح ہمیشہ نہیں رہے گی۔

مندرجہ بالا آرا سے یہ امر بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ بعض جاہل اور بے خبر لوگ جو کبھی کبھی اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ تو مردوں کا دین ہے نہ کہ عورتوں کا، وہ حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ اگر اسلام کے کچھ قانون عورت اور مرد کے جسمانی اور نفسانی فرق کی وجہ سے معاشرے کی ذمہ داریوں کے حوالے کسی قدر مختلف ہیں، تو وہ کسی عورت میں بھی عورت کی حقیقی اور باطنی قدر و منزلت کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ اس لیے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں کے لیے نیک نیتی اور سعادت کے دروازے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس آیت کی بحث میں پڑھ چکے ہیں بعضکم من بعض آدم سب کے سب ایک ہی جنس اور ایک ہی معاشرے کے فرد ہو۔

۱۹۶۔ لَا يَغْفِرَ لَكَ تَقَلُّبُ الدِّينِ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝

۱۹۷۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ مِّمَّا أَوْلَاهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَيَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

۱۹۸۔ لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ۝

ترجمہ

۱۹۶۔ کافروں کا شہروں میں (کامیابی سے) آنا جانا تمہیں دھوکا نہ دے۔

۱۹۷۔ یہ متاعِ ناچیز ہے پھر ان کے لیے رہنے کی جگہ دوزخ ہے اور (دوزخ) کتنی بُری جگہ ہے۔

۱۹۸۔ لیکن وہ لوگ (جو ایمان لے آئے ہیں اور) اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے لیے باغاتِ بہشت ہیں کہ جن کے درختوں تلے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ان کے لیے خدا کی طرف سے پہلی پذیرائی ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے۔

شان نزول

بہت سے مشرکین مکہ تجارت پیشہ تھے۔ اس تجارت سے انہیں بہت سی دولت میراثی اور وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کتاب دردمرک مارک، فذرتفسیر پر پیشگاہ محمد، حقوق زن در اسلام اور سلسلے کی دیگر کتب ملاحظہ فرمائیے۔

تھے۔ مدینہ کے یہودی بھی تہارت میں مہارت رکھتے تھے۔ تجارتی سفروں سے اکثر وہ بھڑے ہاتھوں واپس لوٹتے تھے۔ مسلمان ان دنوں مخصوص حالات کی وجہ سے مادی طور پر بڑی رحتوں اور مشکوں میں گرفتار تھے۔ ان مشکلات کی وجہ میں مکہ سے مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت اور طاقتور دشمن کی طرف سے اقتصادی محاصرہ اور بائیکاٹ شامل ہیں۔ مسلمان عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بعض لوگ جب یہ دو مختلف حالتوں کی طرف دیکھتے تو سوچتے کہ بے ایمانوں کے لیے یہ ناز و نعمت اور اہل ایمان کے لیے یہ رنج و الم آخر کیوں ہے، مسلمان کیوں فقر و پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات اسی سوال کا جواب ہیں۔

## تفسیر

### ایک تکلیف دہ سوال

شان نزول میں جو سوال سامنے آیا ہے وہ زمانہ پیغمبر کے مسلمانوں کے حسب حال ہے۔ یہ دراصل ایک عمومی سوال ہے جو ہر دور میں اکثر لوگ پوچھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ظالموں، سرکشوں، فرعونوں کی خوشحالی اور ناز و نعمت سے معمور زندگی کا موازنہ ایسے اہل ایمان سے کرتے ہیں جن کی زندگی مشقت و زحمت ہی سے بھری ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑے لوگ اپنی ظلمت اور گناہ آلود زندگی کے باوجود خوشحال کیوں ہیں لیکن اہل ایمان اپنے ایمان و تقویٰ کے باوصف سختی و تنگی کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔ بعض اوقات یہ چیز کمزور ایمان والوں میں شک و شبہ پیدا کرتی ہے۔

اس سوال کا اگر بغور جائزہ لیا جائے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر گہری نظر کی جائے تو واضح اور روشن جوابات سامنے آئیں گے جن میں سے بعض کی طرف آئیہ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مزید توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو دوسرے جوابات بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

آیت کہتی ہے: لا یغرنک تقلب الذین کفروا فی البلاد۔ متلف شہروں میں کافروں کی کامیابی سے آمد و رفت تجھے ہرگز دھوکے میں نہ ڈال دے۔ اگرچہ ظاہراً آیت میں رسول اللہؐ مخاطب ہیں لیکن واضح ہے کہ مقصود تمام مسلمان ہیں اس کے بعد فرماتا ہے: متاع قلیل۔ یہ کامیابیاں اور یہ بلا شرط مادی فائدے جلد گزر جانے والے اور ناپ چیز ہیں۔

ثم ما أولئکم جہنم و بئس المرہاد۔ ان کامیابیوں کے پیچھے ان کے لیے انجام بد اور ایسی ذمہ داریاں ہیں جو ان کا دامن پکڑے رہیں گی اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ کیسا بڑا ٹھکانا ہے۔

مندرجہ بالا آیت درحقیقت دو نکتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے:

پہلا یہ کہ سرکشوں اور ظالموں کی بہت سی کامیابیوں کا دائرہ محدود ہے۔ جیسے بہت سے اہل ایمان کی عمر میاں اور تکلیفیں بھی محدود ہیں۔ اس امر کا گواہ اسلام کا ابتدائی دور ہے۔ اس میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کی حالت ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اس وقت حکومت اسلامی بالکل نوساختہ تھی۔ طاقتور دشمنوں کی طرف سے ان پر طوفان آپڑے تھے۔ انہیں ڈرا یا دھمکایا جاتا تھا۔ اس لیے حکومت اسلامی کے پر وبال سسٹم ہوئے تھے۔ خصوصاً مکہ کے مسلمانوں کی ہجرت کی وجہ سے وہ مسلمان جو انتہائی کم تعداد میں

تھے بالکل ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ کیفیت صرف انہی سے مخصوص نہ تھی بلکہ وہ تمام لوگ جو کسی ایک بنیادی اور روحانی انقلاب کے حامی ہوں اور ایک فاسد معاشرے میں رہتے ہوں انہیں محرومیت کے ایک شدید دور سے گزرنا پڑتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ حکومت اسلامی کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور اس کی شاخیں قوی ہوئیں۔ اسلامی ملک میں دولت کا سیلاب امنڈ آیا اور عیش و عشرت میں رہنے والے بدترین دشمن خاک سیاہ پر جا بیٹھے۔ آیت میں اسی سحرِ حال کو ”متاع قلیل“ کہا گیا ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض بے ایمانوں کی مادی ترقی اس لیے بھی ہے کہ وہ دولت سمیٹنے میں کسی اصول اور قانون کے قائل نہیں ہوتے اور جائز ناجائز ہر طریقے سے، یہاں تک کہ بے کسوں کا خون چوس کر بھی دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں جبکہ اہل ایمان حق و عدالت کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹنے پر پابندیاں ہونا بھی چاہئیں۔ اس لیے دونوں کے حالات کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اہل ایمان کو ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے جبکہ بے ایمانوں کی نظر میں کوئی ذمہ داری نہیں اور چونکہ یہ دنیا ارادہ و اختیار کی آزادی کی دنیا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے دونوں گروہوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہے تاکہ ہر ایک کا انجام اس کے عمل کی روشنی میں مرتب ہو سکے۔ اسی امر کی طرف آیہ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔

شعراً و لہم جہنم و بئس العہاد۔

## قوت اور ضعف کے پہلو

بعض بے ایمان افراد کی ترقی اور بعض ایمان والوں کی پسماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایمان نہ رکھنے کے باوجود پہلے گروہ میں قوت کے بعض پہلو موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ اہم کامیابیاں حاصل کر لیتے ہیں اور دوسرے گروہ میں ایمان کے باوجود کمزوری کے بعض پہلو موجود ہیں جو ان کی پسماندگی کا سبب ہیں۔

مثلاً ہم بعض ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو خدا سے بیگانہ ہیں لیکن امور زندگی میں جدوجہد اور استقامت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور حالاتِ زمانہ سے آگاہی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً مادی زندگی میں کامیابیاں حاصل کریں گے۔ درحقیقت یہ لوگ دین سے وابستہ ہوئے بغیر اس کے کچھ بنیادی اصولوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ان کے مقابلے میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو عقائد مذہبی کے تو پابند ہیں لیکن اس کے بہت سے عملی احکامات کو سمجھنے جوئے ہیں۔ یہ لوگ کم حوصلہ، بے حال، استقامت سے ماری، بالکل منتشر اور ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ لہذا مسلم ہے کہ ایسے لوگوں کو دنیاوی زندگی میں پے درپے شکستوں کا سامنا ہوگا۔ ان کی شکست ایمان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کمزور پہلوؤں کی بناء پر ہے جو ان میں بھڑ ہیں۔ بعض اوقات وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فقط نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے انہیں تمام کاموں میں کامیابی حاصل ہو جانا چاہیے۔ جبکہ دین زندگی کی پیش رفت کے لیے عملی پروگرام لے کر آیا ہے جسے فراموش کر دینے سے شکست اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

غلامیہ کہ دونوں گروہوں کے کچھ قوی اور کچھ ضعیف پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک کے اپنے اثرات ہیں البتہ کبھی کبھار محاسبہ کرتے وقت یہ اثرات ایک دوسرے سے مشتبہ ہو جاتے ہیں۔



مثلاً ایک بے ایمان شخص جو مسلسل منت و مشقت کرتا ہے وہ اطمینانِ قلب و روح، اعلیٰ انسانی مقاصد اور پاکیزہ خیالات و جذبات سے ماری ہوتا ہے لیکن چونکہ شوق اور استقامت سے کام کرتا ہے لہذا مادی زندگی میں آگے نکل جاتا ہے۔ یہاں بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بے ایمان شخص دنیاوی زندگی میں کیوں کامیاب ہو گیا ہے گویا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کامیابی کا کوئی اور عامل تھا۔

اب یہ بات جیسے ایک فرد پر صادق آتی ہے اسی طرح اسے ایک ملک پر بھی منطبق کیا جاسکتا ہے ضمنی طور پر یہ امر بھی واضح رہنا چاہیے کہ بے ایمان اشخاص کی کامیابی کے تینوں مذکورہ عوامل یعنی جدوجہد، ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور حالاتِ زمانہ پر نظر، سب ایک ہی جگہ صادق نہیں آتے بلکہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص موقع و محل کے ساتھ مخصوص ہے۔

لکن الذین اتقوا ربہم لہم جنات تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا۔  
گذشتہ آیت میں بے ایمان افراد کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس آیت میں پرہیزگاروں کے انجام کا تذکرہ ہے۔ ارشادِ الہی ہے: لیکن وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی (اور انہوں نے مادی سرمائے کے حصول کے لیے حق و عدالت کے اصول ملحوظ نظر رکھے یا خدا پر ایمان رکھنے کی بنا پر اپنے وطن سے نکال دیے گئے اور اجتماعی و اقتصادی مشکلات کا شکار ہوئے) انہیں ان مشکلات کے صلے میں خدا تعالیٰ نے باغاتِ بہشت عطا کیے ہیں کہ جن کے درختوں تلے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

نزلا من عند اللہ و ما عند اللہ خیر للابرار

نفلت میں ”نزل“ کا معنی ہے ”ایسی چیز جو مہمان کی ضیافت کے لیے پیش کی جائے“۔ بعض کہتے ہیں اس کا معنی ہے ”دو پہلی چیز جو مہمان کی پذیرائی کے لیے پیش کی جائے“ (مثلاً شربت یا پھل جو ابتدا میں مہمان کو پیش کیے جاتے ہیں) اس لیے مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے: باغِ جنت میں مادی نعمتیں پرہیزگاروں کی ضیافت کا آغاز ہیں۔ باقی رہی اہم ترین اور عالی ترین ضیافت تو وہ روحانی اور مننوی نعمتیں ہیں جن کی طرف و ما عند اللہ خیر للابرار (خدا کے پاس جو نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے) کے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۹۹- وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا  
أُنزِلَ إِلَيْهِمْ خَشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْكُرُونَ بآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا  
أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ

۱۹۹ اہل کتاب میں بعض ایسے افراد ہیں جو خدا پر اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے ایمان رکھتے ہیں۔ وہ خدا کے (حکم کے) سامنے خضوع کرتے ہیں اور آیاتِ الہی کو کم قیمت پر نہیں بیچتے۔ ان کا اجر و ثواب ان کے پروردگار



کے پاس ہے، خدا سریع الحساب ہے (وہ ان کے نیک اعمال کا جلدی سے حساب کرتا ہے اور انہیں اجر دیتا ہے)۔

## شانِ نزول

بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق یہ آیت اہل کتاب کے مومنین کے بارے میں ہے، جنہوں نے ناروا تعصب سے کنارہ کشی اختیار کی ہے اور مسلمانوں کی صفوں میں آشامل ہوئے ہیں۔ یہ لوگ میسائیوں اور یہودیوں کی ایک معقول تعداد پر مشتمل تھے۔

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت حبشہ کے رعیت پر اور بادشاہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے اگرچہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

ماہِ رجبِ سفیرِ جبری میں نجاشی کی وفات کی خبر ایک فدائی الہام کے ذریعے روزِ وفات ہی آنحضرتؐ کو پہنچی۔ رسول اللہؐ نے مسلمانوں سے فرمایا:

تمہارا ایک بھائی سرزمینِ حجاز سے باہر دنیا سے چل بسا ہے۔ تم جمع ہو جاؤ تاکہ مسلمانوں کے حق میں اس نے جو خدمات سر انجام دی ہیں اس کے صلے میں اس کی نماز جنازہ پڑھیں۔

بعض نے سوال کیا: وہ کون ہے؟  
آپؐ نے فرمایا: نجاشی۔

پھر آپؐ مسلمانوں کے ہمراہ قبرستانِ جنت البقیع میں آئے اور اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے لیے دعائے مغفرت کی۔ آپؐ نے اپنے اصحاب کو بھی حکم دیا اور انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

بعض منافقین کہنے لگے: محمد (ص) نے ایک ایسے کافر کی نماز جنازہ پڑھی ہے جسے کبھی نہیں دیکھا، حالانکہ اس نے ان کا دین قبول نہیں کیا۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا: اے

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجاشی نے مکمل طور پر اسلام قبول کر لیا تھا اگرچہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

تفسیر  
سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں

وان من اهل الكتاب لمن يؤمن بالله

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں جو گفتگو ہے اس میں کبھی بھی سب کو ایک جیسا قرار نہیں دیا گیا۔ قرآن کا یہ طریق کار ہے کہ وہ کسی قوم یا جماعت کے بارے میں خدا اور تعصب کا رنگ اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کا فیصلہ ان کے لائحہ عمل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ لہذا وہ اس اقلیت کو فراموش نہیں کرتا جو ایمان اور عمل صالح کی حامل ہو اور گمراہ اکثریت کے درمیان زندگی گزار رہی ہو۔ یہاں بھی اہل کتاب کو بہت زیادہ سزائیں کی گئی ہیں کیونکہ وہ آیاتِ خدا کو چھپاتے تھے اور سرکشی اختیار کرتے اور پھر ان میں سے اُس اقلیت کا تذکرہ ہے جس نے پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کو قبول کر لیا تھا۔ ان لوگوں کی پانچ ممتاز صفات بیان فرمائی گئی ہیں۔

۱ بیؤمن بالله — وہ ایسے لوگ ہیں جو دل و جان سے خدا پر ایمان لے آتے ہیں۔

۲ وما انزل اليك — اور قرآن پڑھو جو کچھ تم مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں۔

۳ وما انزل اليهم — درحقیقت پیغمبر اسلامؐ پر ان کے ایمان لانے کی وجہ اپنی آسمانی کتاب پر ان کا حقیقی ایمان ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بشارتیں موجود ہیں۔

۴ خاشعین لله — فرمانِ خدا کے سامنے وہ تسلیمِ غم کیے ہوتے ہیں اور یہ ان کا خشوع و خضوع ہی ہے جس نے حقیقی ایمان اور جاہلانہ تعصبات میں حد فاصل کھینچی ہے۔

۵ لا يشترون بايت الله شئنا قليلا — وہ آیاتِ الہی کو کبھی کم قیمت پر فروخت نہیں کرتے اور وہ ایسے علماء و یہود کی طرح نہیں جو اپنے منصب کے تحفظ کے لیے لوگوں پر اپنے اقتدار کی بقا کے لیے اور رشوت لے کر آیاتِ خدا میں تحریف کر دیتے ہیں۔ واضح ہے کہ مطلب یہ نہیں کہ کم قیمت پر فروخت نہیں کرتے بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرتے۔ کم قیمت کی طرف اشارے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان علماء کی طرح نہیں ہیں جو دنیا پرست اور کم ہمت ہیں۔ علاوہ ازیں ان آیات کے مقابلے میں جو کچھ بھی وصول کیا جائے بے وقعت ہے۔

اولئك لهم اجرهم عند ربهم

جن لوگوں کا اپنے پروردگار کے ہاں واضح و زندہ لائحہ عمل اور اعلیٰ انسانی صفات کی بنا پر اجر و ثواب ہے ان کے لیے یہاں ”ربہم“ کا لفظ ان پر پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کا مظہر ہے نیز یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ راہِ ہدایت میں اللہ تعالیٰ ان کی تربیت اور مدد کرتا ہے۔

ان الله سريع الحساب

خدا تعالیٰ بڑی تیزی سے بندوں کا حساب بے باق کر دے گا۔ نہ نیکو کاروں کو اپنا اجر و ثواب معلوم کرنے کے لیے مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا اور نہ بدکاروں کی سزائیں تاخیر ہوگی۔ یہ جملہ نیکوں کے لیے بشارت اور بدکاروں کے لیے تنبیہ و تہدید کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۴ اس جملے کی مزید توضیح کے لیے سورہ بقرہ آیت ۲۰۷ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔



۲۰۰۔ یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَاٰرَابِطُوْا قٰتِلُوْا اللّٰهَ  
لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۰۰ اے ایمان والو! (مشکلات اور ہوا و ہوس کے مقابلے میں) استقامت و پامردی دکھاؤ اور دشمنوں کے مقابلے میں (بھی) استقامت کا مظاہرہ کرو اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور خدا سے ڈرو شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔

تفسیر

یہ سورہ آل عمران کی آخری آیت ہے۔ اس میں چار نکات پر محیط ایک جامع لائحہ عمل تمام مسلمانوں کے لیے پیش کیا گیا ہے اسی لیے اس کا آغاز ”یا ایہذا الذین آمنوا“ سے ہوا ہے۔

۱۔ اصبروا۔ یہ اس پرہیزگراں کا پہلا نکتہ ہے جو کہ مسلمانوں کی سر بلندی اور کامیابی کا ضامن ہے۔ اس کا مطلب استقامت و صبر اور جو حادثہ کے مقابلے میں ڈٹ جانا ہے۔ دراصل صبر و استقامت ہی ہر قسم کی مادی و روحانی کامیابی کی یقینی جڑ ہے اجتماعی و انفرادی پیش رفت کے لیے اس کی جس قدر اہمیت بیان کی جائے وہ کم ہے اسی کو حضرت علیؑ نے کلماتِ قصار میں بدن کے ساتھ سر سے تشبیہ دی ہے فرماتے ہیں:

ان الصبر من الایمان کالرأس من الجسد  
یعنی۔ صبر کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا بدن سے ہے۔

۲۔ وصابروا۔ یہ ”مصابرہ“ سے مفاد کے باب سے ہے۔ اس کا معنی ہے دوسروں کے صبر و استقامت کے مقابلے میں صبر و استقامت دکھانا۔

اس طرح خدا تعالیٰ پہلے تو صاحبانِ ایمان کو صبر و استقامت کا حکم دیتا ہے (جس میں ہر طرح کا جہاد نفس اور مشکلات حیات شامل ہیں) اور دوسرے مرحلے میں دشمن کے مقابلے میں استقامت کا حکم دیتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم جہادِ نفس اور اندرونی کمزوری کے پہلوؤں کی اصلاح میں کامیاب نہیں ہوتی دشمن پر اس کی کامیابی ممکن نہیں ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں ہماری زیادہ تر ہزیمتیں اسی وجہ سے ہیں کہ جہادِ بانفس نہیں کیا گیا اور اپنے کمزور پہلوؤں کی اصلاح نہیں کی گئی جو ہمارے لیے ضروری ہے۔

ضمنی طور پر اس حکم (صابروا) سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن جس قدر زیادہ استقامت کا مظاہرہ کرے ہمیں اس سے بڑھ کر استقامت و پامردی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

۳۔ ورابطوا۔ اس لفظ کا مادہ ”رابط“ ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو کسی مکان میں باندھ دینا (مثلاً گھوڑے

کو کسی جگہ باندھنا۔ اسی لیے سرائے یا کاروانوں کے ٹھہرنے کی جگہ کو رباط کہتے ہیں۔ رباط قلب کا مطلب ہے دل کا اطمینان اور سکون۔ خاطر، گویا وہ کسی جگہ بندھا ہوا ہے۔ مرابطہ کا معنی ہے سرحدوں کی نگرانی کرنا کیونکہ وہاں سپاہی، سواریاں اور جنگی وسائل فراہم کیے جاتے ہیں اور انہیں وہاں رکھا جاتا ہے۔

یہ لفظ مسلمانوں کو دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہنے اور اسلامی ملکوں کی سرحدوں کی حفاظت کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ دشمن ان پر بے خبری کے عالم میں اچانک حملہ نہ کر دے۔ نیز انہیں شیطان اور کسکش ہوا دوس کے مقابلے کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہنے اور ان کے ہتھکنڈوں سے چوکنار رہنے کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ غفلت میں نہ پڑ جائیں۔

اسی لیے بعض روایتوں میں ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ نے اس لفظ کی تفسیر ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی پابندی اور انتظار کی ہے کیونکہ جو شخص عبادت کے ذریعے اپنے دل و جان کو ہمیشہ اور لگاتار بیدار رکھے وہ ایسے سپاہی کی مانند ہے جو ہر وقت دشمن سے مقابلے کے لیے تیار (ATTENTION) ہو۔

غرضیکہ رباط ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو اپنی ذات اور اسلامی معاشرے کے دفاع کی تیاری پر محیط ہے۔ چنانچہ فقہ اسلامی کے باب جہاد میں ایک بحث ”مرباط“ (یعنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے دشمن کے احتمالی حملے کے مقابلے کے لیے آمادگی) کے عنوان سے ہے۔ جس میں خاص خاص احکام بیان کیے گئے ہیں۔

بعض روایات میں علمائے کرام کو بھی ”مرباط“ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

علماء شیعتنا مرابطون فی اشغر الذی یلی ابلیس وعفاریتہ وینعونہ عن الخروج علی ضعفاء شیعتنا وحن ان یتسلط علیہم ابلیس

ہمارے شیعہ علماء سرحدوں کی حفاظت اور نگرانی کرنے والوں کی طرح ہیں، جو شیطان کی فوج کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں اور ان لوگوں کا (شیطان اور اس کی فوج کے حملے سے) دفاع کرتے ہیں جو ان کے حملہ کی تاب نہیں لاسکتے۔

اس حدیث کے ذیل میں علمائے کرام کا مرتبہ اور شان سرحدوں کی حفاظت کرنے والے افسروں اور سپاہیوں کے مقابلے میں جو اسلام کے دشمنوں سے جنگ کر رہے ہیں کہیں بڑھ کر بیان کی گئی ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ علماء، عقائد و ثقافت اسلامی کے نگہبان ہیں۔ جبکہ فوج جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے اور یہ طے شدہ امر ہے کہ جس قوم کے عقیدے، فزنگ اور ثقافت دشمنوں کے حملے کی زد میں ہو اور وہ ان کا قرار واقعی دفاع نہ کر سکے تو وہ جلد ہی سیاسی اور فوجی نقطہ نظر سے بھی شکست کھا جائے گی۔

۴ واتقوا اللہ اور آخری حکم جو تمام احکامات پر سایہ نگیں ہے وہ پرہیزگاری کا حکم ہے۔ استقامت، صبر اور رباط

کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے تاکہ ہر قسم کی خود پسندی، ریاکاری اور شخصی اغراض قریب ہونے پائیں۔  
لعلکم تغلحون تم ان چاروں حکموں کی پابندی کے سائے میں علاج و کامیابی حاصل کر سکتے ہو اور ان سے روگردانی کر سکتے  
کامیابی کا راستہ تم پر بند ہو جائے گا۔

### ایک سوال اور اس کا جواب

کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے جملے لفظ "لعل" سے کیوں شروع ہوتے ہیں مثلاً "لعلکم تغلحون" شاید تم کامیاب ہو جاؤ "لعلکم تتقون"۔ شاید تم پرہیزگار بن جاؤ۔ "لعلکم تو رحمون" شاید رحمت خدا تمہارے شامل مال ہو۔

جبکہ لفظ لعل تردید اور شک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ تو ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس لیے اس کی ذات اقدس کے لیے مناسب نہیں۔ یہ جملہ بعض دشمنان اسلام نے بھی کتاویز بنا رکھا ہے۔ وہ اس کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اسلام کسی سے قطعی اور یقینی نجات کا وعدہ نہیں کرتا، اس کے وعدے میں شک و شبہ پایا جاتا ہے کیونکہ اس کے اکثر وعدے "لعل" سے شروع ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر قرآن مجید کی عظمت، حقیقت مینی اور اظہار حق کی ایک واضح دلیل ہے کیونکہ قرآن یہ لفظ ایسی جگہ استعمال کرتا ہے جہاں نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط کی پابندی ضروری ہو اور وہ لفظ "لعل" کے ذریعے ان شرطوں کی طرف اجمالی اشارہ کرتا ہے مثلاً آیات قرآن سننے کے وقت خاموش رہنا اور آیات کے مضمون کو کان لگا کر سننا انسان کے لیے رحمت خداوندی کا مستحق ہونے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے علاوہ آیتوں کا سمجھنا اور ان پر کاربند ہونا لازمی اور ضروری ہے اسی لیے قرآن فرماتا ہے:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون (اعراف: ۲۰۴)

جس وقت قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموشی اختیار کرو، ہو سکتا ہے کہ خدا کی رحمت تمہارے

شامل مال ہو جائے۔

اگر قرآن یہ کہتا کہ یقیناً تم رحمت الہی کے مستحق ہو جاؤ گے تو یہ حقیقت سے دور ہوتا۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے تحریر کر چکے ہیں کہ اس امر کی کچھ اور بھی شرطیں ہیں۔ لیکن جب وہ "لعلکم" فرماتا ہے تو باقی شرطوں کا حصہ محفوظ رہ جاتا ہے اس حقیقت کی طرف تو جبر نہ دینے کی وجہ سے اعتراض کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ بعض ہمارے علماء بھی اس بات کے معتقد ہو گئے کہ لفظ "لعل" ایسے موقعوں پر شاید "کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ قرآن کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

زیر بحث آیت میں بھی باوجودیکہ اسلام کے اعلیٰ ترین احکام میں سے چار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر بھی اس بنا پر کہ کہیں دوسرے اسلامی اصلاحی منصوبوں سے نفلت نہ برتی جائے، لفظ "لعل" استعمال کیا گیا ہے۔

بہر حال اگر آج کے مسلمان مندرجہ بالا آیت کو ایک شعار اسلامی کے حوالے سے اپنی زندگی کے پروگراموں میں شامل کر لیں تو





بہت سی مشکلیں دور ہو جائیں گی جن کا انہیں اس وقت سامنا ہے۔ آج اسلام اور مسلمانوں پر جو حملے کیے جا رہے ہیں وہ سب ان چاروں یا ان میں سے بعض احکام سے غفلت برتنے یا انہیں بھلا دینے کی وجہ سے ہیں اور یہ ایک انتہائی تکلیف دہ صورت حال ہے۔ اگر مسلمانوں میں استقامت و استقلال کی روح زندہ و بیدار ہو جائے، تو وہ دشمنوں کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر کوشش کر سکیں گے۔ حکم خداوندی کے مطابق مرابطہ یعنی جغرافیائی، ثقافتی اور اقتصادی سرحدوں کی بھرپور دیکھ بھال اور حفاظت کریں۔ ہر وقت دشمنوں کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں اور ان سب باتوں کے علاوہ انفرادی و اجتماعی طور پر تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعے گناہِ فساد کو اپنے معاشرے سے ختم کر دیں تو یقیناً ان کی کامیابی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔

اسے خدائے بزرگ و برتر ہم سب کو یہ توفیق عطا فرما کہ ہم تیری آسمانی کتاب کے ان حیات بخش احکام کو اپنی چند روزہ زندگی میں اپنالیں اور اپنی غیر محدود رحمت اور لطافت بے پایاں کو ہمارے شامل مال فرما۔ آمین۔





# سُورَةُ نِسَاءٍ

مدنی سورۃ ہے جس کی ایک سو ستتر آیات ہیں

## سُورَةُ نِسَاءٍ

آیاتِ سورہ کی تفسیر سے پہلے چند نکات پر توجہ ضروری ہے۔

### ۱۔ سورہ نساء کا محل نزول

بعض مفسرین کے مطابق اس سورہ کی تمام آیتیں (سوائے آیت ۷۵ کے) مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں۔ ترتیب و نزول کے لحاظ سے یہ سورہ سورہ ممتحنہ کے بعد ہے۔ قرآن مجید پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی سورتوں کی موجودہ ترتیب ان کے نزول کے مطابق نہیں ہے۔ چنانچہ بہت سی سورتیں جو مکہ منظر میں نازل ہوئی ہیں وہ قرآن کے آخر میں ہیں اور بہت سی ایسی سورتیں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں وہ قرآن مجید کے شروع میں ہیں۔ البتہ جس طرح ہم جلد اول کے شروع میں لکھ چکے ہیں کہ ایسے مدارک اور اسناد ہمارے پاس موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن کی سورتوں کی جمع اور موجودہ ترتیب خود حضرت رسول اکرم کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ اس بنا پر قرآن کو جمع کرتے وقت خود حضرت فتمی مرتبت نے مختلف وجوہات کی وجہ سے جن میں سے ایک مطالب کی اہمیت اور ان کی ترتیب طبعی ہے، موجودہ ترتیب میں جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس ترتیب کے مطابق پہلی سورت "المائدہ" اور آخری سورہ "الناس" ہے۔ اس میں کوئی لفظ بلکہ حرف تک کسی آیت یا سورت میں کم و بیش نہیں ہوا۔ یہ سورہ آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد کے لحاظ سے سورہ بقرہ کے بعد طویل ترین سورت ہے اور ۷۷ آیات پر مشتمل ہے۔ اس امر کے پیش نظر کہ اس میں بہت سے مباحث عورتوں کے احکام اور حقوق کے بارے میں ہیں اس کا نام "سورہ نساء" رکھا گیا ہے۔

### ۲۔ اس سورہ کے اہم موضوعات

ہم یہ تحریر کر چکے ہیں کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ یعنی عین اس وقت جب رسالت مآب حکومت اسلامی کی تاسیس اور ایک صحیح انسانی معاشرے کی تشکیل میں مصروف تھے۔ اسی بنا پر بہت سے قوانین جو معاشرے کو راہِ راست پر لانے کے لیے موثر تھے، اس سورت میں نازل ہوئے ہیں۔ چونکہ وہ افراد جو اس معاشرے کی تار و پود کی تشکیل میں گئے ہوئے تھے کلی ایسے بت پرست تھے جو زمانہ جاہلیت کی تمام آلودگیوں میں غوث رہ چکے تھے، اس لیے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ پہلی رسومات بد کو ان کی روح اور دماغ سے نکالا جائے اور ان کی بجائے ایسے قانون اور منصوبے جو ایک فرسودہ نظام کی بجائے ضروری ہیں، بنائے جائیں۔

اس سورہ کی مباحث کو تین عمومی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- ۱۔ ایمان و عدالت: نیت اور بدترین دشمنوں کا بائیکاٹ۔
- ۲۔ بُرے معاشرے کا نتیجہ اور انجام سمجھانے کے لیے گزرے ہوئے لوگوں کے حالاتِ زندگی سے روشناس کرانا۔
- ۳۔ امداد کے مستحق افراد کی حمایت مثلاً یتیم اور ان کے حقوق کے متعلق ضروری احکامات۔





- ۴ - میراث کا قانون طبعی، فطری اور عادلانہ طریقے کی بنیاد پر اس صورت کے خلاف جو اس زمانے میں رائج تھی، جس کے ذریعے نہایت تکلیف دہ حیلے بہانوں سے کمزور لوگوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔
- ۵ - شادی بیاہ کے متعلق قانون اور عام پاک دامن کی حفاظت کے لیے لائحہ عمل۔
- ۶ - اموال کی حفاظت کے لیے کلی اور عمومی قوانین۔
- ۷ - معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندان کی حفاظت اور بہبودی کا پروگرام۔
- ۸ - لوگوں کے ایک دوسرے کے مقابلے میں متقابل حقوق اور ذمہ داریاں۔
- ۹ - اسلامی معاشرے کے دشمنوں کا تعارف اور ان کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو بیدار رہنے کی تلقین۔
- ۱۰ - حکومت اسلامی اور حکومت اسلامی کے رہبر کی اطاعت اور فرمانبرداری کا لزوم۔
- ۱۱ - مسلمانوں کو واضح دشمنوں سے مقابلے اور ان سے جنگ کے لیے ابھارنا۔
- ۱۲ - ایسے دشمنوں کی پہچان جو ڈھکے چھپے سازشیں کرتے رہتے ہیں۔
- ۱۳ - ہجرت کی اہمیت اور اس کا ضروری ہونا جبکہ فاسد اور بُرے معاشرے کا سامنا کرنا پڑے۔
- ۱۴ - میراث کے متعلق مباحث اور جمع شدہ دولت کی وارثوں میں تقسیم۔

## اس سورت کی تلاوت کی فضیلت

ایک روایت کے مطابق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:  
 جو شخص سورہ نسا کی تلاوت کرے گویا اس نے اس قدر مال و زر راہ خدا میں دیا ہے جتنا کہ سورہ نسا کے لحاظ سے بطور  
 وارث ہر ایک مسلمان کا حصہ ہے اور اسی طرح اُسے اس شخص کے برابر ثواب دیا جائے گا جس نے ایک غلام آزاد کیا ہو۔  
 واضح ہے کہ اس روایت میں اور اس قسم کی دوسری تمام روایتوں میں صرف آیتوں کا پڑھنا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ پڑھنا تو  
 سمجھنے کے لیے مقدمہ اور تہیہ ہے اور وہ بھی اپنے مقام پر۔  
 یہ ایک قدم ہے اُسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنانے کے لیے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس سورہ  
 کی آیات سے اپنی زندگی میں عملی نصیحت حاصل کرے تو وہ یہ تمام اجر و ثواب دنیاوی تا شج کے علاوہ حاصل کرے گا۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط  
 ۱۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ  
 خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَاءً ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ  
 الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهِ ۗ وَالْاَرْحَامَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے جو بننے والا اور مہربان ہے۔

۱۔ اے لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی انسان سے پیدا کیا اور اس کی بیوی کو بھی اسی  
 کی جنس سے خلق فرمایا اور ان دونوں سے ان گنت مرد اور عورتیں (دو نئے زمین پر) پھیلا دیں۔ اس خدا سے ڈرو  
 جس کی عظمت اور بزرگی کا تم سب اعتراف کرتے ہو اور جب کوئی چیز ایک دوسرے سے مانگتے ہو تو اسی کے  
 نام سے لیتے ہو۔ (نیز) اپنے رشتہ داروں کے بارے میں (قطع تعلق کرنے سے) پرہیز کرو۔ کیونکہ خداوند عالم تمہارا  
 نگہبان ہے۔

تفسیر

طبقاتی تقسیم اور گروہ بندی کے خلاف جہاد

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

اس سورہ کی پہلی آیت میں تمام انسانی افراد سے خطاب ہے کیونکہ یہ سورہ ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن کے تمام لوگ اپنی زندگی  
 میں متاج ہیں۔

اس کے بعد تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت ہے جو کسی معاشرے کو صحیح و سالم اور صحت مند بنانے کے پروگراموں کی بنیاد ہے۔  
 ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی، میراث کی عادلانہ تقسیم، یتیموں کی حمایت، گھریلو حقوق کی حفاظت اور اسی طرح کے  
 منصوبے ایسے ہیں جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی مدد کے بغیر کامیابی کی بندی کو نہیں چھو سکتے۔



اسی لیے اس سورت کو جو ایسے تمام مسائل پر محیط ہے تقوینی کی دعوت سے شروع کیا گیا ہے۔  
وہ خدا تعالیٰ جو انسان کے سب اعمال کو دیکھنے والا اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا ہے اس سورہ کو تقوینی کی دعوت کے  
ساتھ شروع کرتا ہے۔

وہ خدا جو انسان کے تمام اعمال کا ناظر ہے تعارف کے طور پر انسان کی ایک ایسی صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسانی  
معاشرے کی وحدت و یگانگی کی جڑ ہے۔

الذی خلقکم من نفس واحدۃ۔

وہ خدا جس نے تمام انسانوں کو ایک انسان سے پیدا کیا۔ اس بنا پر وہ خیالی اور وہی امتیاز و افتخار جو ہر ایک جماعت نے  
اپنے لیے گھڑ رکھے ہیں مثلاً امتیازات نسلی، لسانی، علاقائی، قبائلی اور اس قسم کے دوسرے امتیاز جو آج کل دنیا کی سوسائٹی میں ہزاروں  
خزانیوں کا سبب بنے ہوئے ہیں، ایک اسلامی معاشرے میں نہیں پائے جانے چاہئیں کیونکہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔  
یہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور ایک ہی گوہر سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس امر کو پیش نظر رکھا جائے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ  
علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا معاشرہ چونکہ سب کا سب قبائلی تھا تو اس بات کی اہمیت خوب ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی تعبیرات  
قرآن حکیم کے دوسرے مقامات میں بھی ہیں جن کی طرف اپنے اپنے مقام پر اشارہ کیا جائے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ "نفس واحدہ" سے کون مراد ہے؛ اس سے مراد ایک فرد شخص ہے یا ایک فرد فومی یعنی (مذکر کی جنس)۔  
اس میں شک نہیں کہ اس تعبیر کا ظاہری مفہوم تو واحد فرد کے بارے میں ہے اور یہ اس پہلے انسان کی طرف اشارہ ہے جسے قرآن  
آدم کے نام سے آج کے انسانوں کے باپ کے طور پر متعارف کرتا ہے۔ بنی آدم کی تعبیر جو متعدد آیات قرآنی میں کی گئی ہے  
وہ بھی اسی طرف اشارہ ہے اور یہ احتمال کہ اس سے مراد وحدت فومی ہے بعید معلوم ہوتا ہے۔

وخلق منها زوجہا

یہ جملہ بظاہر یہ بتاتا ہے کہ حضرت آدم کی زوجہ حضرت اہنبی سے پیدا ہوئی ہیں بعض مفسرین اس سے یہ سمجھے ہیں کہ حضرت آدم کی  
بیوی حوا حضرت آدم کے بدن سے پیدا ہوئی ہیں۔ کچھ معتبر روایتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ حضرت حوا آدم کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں  
اور اس پر اس آیت کو گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔ (تورات کے سفر تکوین کی دوسری فصل بھی ان ہی معنوں کی وضاحت کرتی ہے) لیکن  
قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرنے سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں شک و شبہ دور ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ  
اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے حضرت آدم کی بیوی کو انہی کی جنس (جنس بشر) سے پیدا کیا۔

چنانچہ سورہ روم کی آیت ۳۱ میں ہے:

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیہا

قدرت خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری بیویاں تمہاری ہی جنس میں سے پیدا کی ہیں تاکہ تمہیں ان  
ان کی وجہ سے سکون حاصل ہو۔

سورہ نمل کی آیت ۷۱ میں فرماتا ہے:



والله جعل لکم من انفسکم ازواجاً

خدا نے تمہاری بیویاں تمہاری جس میں سے بنائی ہیں۔

واضح ہو کہ ان دونوں آیتوں میں تمہاری بیویوں کو تم میں سے قرار دیا کے یہ معنی ہیں کہ انہیں تمہاری جس سے قرار دیا نہ کہ تمہارے اعضاء بدن میں سے۔

اور اس روایت کے مطابق جو تفسیر عیاشی میں حضرت امام محمد باقر سے منقول ہے حضرت عوا کو حضرت آدم کی بیٹیوں میں سے خلقت کو غلط قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت عوا حضرت آدم کی بیٹی ہوئی مٹی سے پیدا ہوئی ہیں۔

### حضرت آدم کے بچوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں

و بئ منہما رجلاً کثیراً و نساء

یہ جلد بتاتا ہے کہ حضرت آدم اور ان کی بیوی سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا ہوئیں۔ اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کے بیٹوں کی نسل کی بہتات حضرت آدم اور ان کی بیوی کے طریقہ سے ہی ظاہر ہوئی تھی اور اس میں کسی تیسرے وجود کا عمل دخل نہ تھا۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدم کی اولاد (بھائی، بہن) نے ایک دوسرے سے شادی کی۔ کیونکہ اگر انہوں نے کسی اور نسل کی بیوی سے شادی کی ہو تو لفظ منہما ان دونوں پر صادق نہیں آتا۔

یہ موضوع بہت سی حدیثوں میں بھی آیا ہے اور کوئی زیادہ تعجب فیض بھی نہیں ہے۔

کیونکہ اس استدلال کے مطابق جو بعض حدیثوں میں ائمہ اہل بیت سے مروی ہے یہ شادی بیاہ اس وقت مباح تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں بھائی بہن کی شادی کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ واضح ہے کہ کسی کام کی ممانعت کا دار و مدار اسی بات پر ہے کہ خدا کی طرف سے اس کی حرمت کا حکم آئے یہ بھی ممکن ہے کہ مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے ایک کام ایک زمانے میں جائز ہو اور اس کے بعد حرام۔

مگر یہ بھی ہے کہ بعض دوسری حدیثوں میں اس مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت آدم کے بیٹے بیٹیوں کی ایک دوسرے سے شادیاں نہیں ہوئیں۔ اور جو لوگ ایسے شادی بیاہ کا اعتقاد رکھتے ہیں ان پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

اگر یہ بنا ہو کہ حدیثیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اس لئے جو حدیث قرآن کے مطابق ہو اسے درست سمجھا جائے تو پھر پہلی ہی بات کو ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان حدیثوں کا مفہوم مندرجہ بالا آیت کے عین مطابق ہے۔ یہاں ایک احتمال اور بھی ہے کہ یہ سوچا جائے کہ حضرت آدم کے بیٹوں نے اپنے سے پہلے بچے کچھ انسانوں میں شادیاں کی تھیں۔

کیونکہ بعض روایات کے لحاظ سے حضرت آدم روئے زمین کے پہلے انسان نہیں تھے۔ آج کا عملی مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ نوح انسانی تقریباً چند عین سال پہلے کر زمین پر زندگی بسر کرتی تھی جبکہ حضرت آدم کی تاریخ پیدائش سے لے کر اب تک کوئی زیادہ مرصہ نہیں گزرا۔ بنا بریں ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ حضرت آدم سے پہلے بھی دوسرے انسان زمین پر رہتے تھے جو ان کی پیدائش کے وقت ختم ہو رہے تھے تو اس امر میں کیا رکاوٹ ہے کہ حضرت آدم کے بیٹوں نے اپنے سے پہلے باقی رہنے والے لوگوں میں سے کسی ایک فائدان میں



شادیاں کی ہوں ۱۷

لیکن ہم تحریر کر چکے ہیں کہ یہ احتمال بھی آئے مندرجہ بالا کی ظاہری صورت کے ساتھ کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ بہت بحث طلب معاملہ ہے۔ جو تفسیری بحث کی گنجائش سے خارج ہے۔

وانتقوا اللہ الذی تسافلون بہ والارحام

وہ اہمیت جو تقویٰ کو کسی صحیح معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لیے حاصل ہے۔ وہ اس بات کا سبب بنی ہے کہ لوگوں کو دوبارہ پرہیزگاری اور تقویٰ کی طرف بلا یا جائے۔ البتہ یہاں پر ایک جملہ بڑھایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: خدا سے ڈرو، جو تمہاری نگاہ میں عظمت اور بزرگی کا مالک ہے اور تم جب کسی سے کوئی چیز مانگتے ہو تو اس کا نام لیتے ہو ۱۷

پھر کہتا ہے: والارحام

یہ لفظ اللہ پر عطف ہے۔ اسی لیے مشہور قرأت میں مفتوح و منصوب پڑھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے: وانتقوا الارحام یعنی رشتہ داروں کی قطع رحمی سے ڈرو اور یہاں موضوع کا ذکر پہلے تو صلہ رحمی کی انتہائی اہمیت کا پتہ دیتا ہے کہ قرآن اس کا اس قدر قائل ہے کہ اس نے ارحام کا نام خداوند عالم کے نام نامی اور اسم گرامی کے ساتھ ساتھ لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس مطلب کی طرف اشارہ ہے جس کا آیت کے شروع میں ذکر ہوا ہے۔ وہ یہ کہ تم سب کا باپ اور ماں ایک ہی ہیں۔ درحقیقت سب آدم کی اولاد آپس میں ایک دوسرے کی رشتہ دار ہے۔ یہ رشتہ اور ربط ضبط اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ تم سب انسانوں کے ساتھ چاہے وہ کسی نسل اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں اپنے کنبہ کے افراد کی طرح محبت کرو۔

ان اللہ کان عبدکم رقیباً۔

رقیب اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بلند جگہ سے حالات کا جائزہ لے۔ اس کے بعد کسی چیز کے محافظ و نگہبان کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ نگہبانی کے لیے دیکھنا اور دیکھ بھال کرنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رقیب کی جگہ کی بلند می ظاہری نگاہ کے لحاظ سے ہو کہ وہ ایک بلند مقام پر بیٹھا ہوا نگرانی کر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ معنوی لحاظ سے ہو۔ مندرجہ بالا جملے میں فرماتا ہے: خدا تمہارا رقیب ہے اور وہ تمہارے تمام اعمال اور نیتوں کو دیکھتا اور جانتا ہے۔ اور ضمناً یہ مفہوم بھی ہے کہ حوادث میں وہی تمہارا نگہبان بھی ہے۔

”کان“ مندرجہ بالا جملے میں یہ لفظ جو کہ فعل ماضی ہے تاکید کے لیے ہے۔

۱۷ اجمالی طور پر دوسرے یا تیسرے نظریہ کو ترجیح دینا چاہیے خصوصاً جبکہ روایات بھی موجود ہیں۔ مزید برآں بہن بھائی کی شادی کسی معاشرے میں اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ یہاں تک کہ وہ معاشرے جو کسی دین کے پیرو بھی نہیں ہیں۔ آیت بھی نص نہیں ظاہر ہی ہے۔ ادھر موافقت اور مخالفت عامہ کا اصول بھی ہے (مترجم)۔

۱۸ تسافلون تسافل کے مادہ سے ہے۔ جس کے معنی ایک دوسرے سے سوال کرنے کے ہیں۔ تسافل باللہ کے معنی یہ ہیں کہ لوگ جب ایک دوسرے سے کوئی چیز مانگیں تو اس سائل باللہ تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہتے ہیں اور یہاں کی نظروں میں خداوند عالم کی عظمت کی نشانی ہے۔

۲۔ وَاتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا النَّخَبِثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا  
أَمْوَالَهُم إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّكَ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۝

ترجمہ

۲ یتیموں کے مال (جب وہ بالغ ہو جائیں) انہیں دے دو اور (اپنے) بڑے مال (یتیموں کے) اچھے مال سے تبدیل نہ کرو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر یا تبدیل کر کے نہ کھاؤ کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

شانِ نزول

بنی غطفان قبیلے کے ایک شخص کا بھائی بہت دولت مند تھا۔ وہ دنیا سے چل بسا تو اس کے بھائی نے اپنے یتیم بھتیجوں کی سرپرستی کے نام پر اس کے مال میں تصرف کیا۔ جس وقت اس کا بھتیجا بالغ ہو گیا تو اس نے اس یتیم کا حق دینے سے انکار کر دیا۔ جب یہ مقدمہ حضرت رسول اکرم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس غاصب نے آیت سننے کے بعد توبہ کر لی اور مال اس کے مالک کو واپس کرتے ہوئے کہا:

اعوذ باللہ من الحوب الكبير

میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ کہیں بڑے گناہ میں آلودہ نہ ہو جاؤں۔

تفسیر

یتیموں کے مال میں خیانت حرام ہے۔ ہر معاشرے میں نت نئے حوادث کی وجہ سے باپ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے رہ جاتے ہیں۔

البتہ بڑے معاشرے جو داخلی جنگ میں پھنسے رہتے ہیں۔ جیسے زمانہ جاہلیت کا عرب معاشرہ تھا ان میں یتیم بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، جنہیں حکومت اسلامی اور ہر ایک مسلمان کی حمایت اور سرپرستی میں رہنا چاہیے۔

آیت مذکورہ بالا میں یتیموں کے مال کے بارے میں تین اہم حکم دیئے گئے ہیں۔

۱۔ وَاتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ۔ اس جملے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب یتیم بالغ ہو جائیں تو ان کے مال ان کے سپرد کر دیئے جائیں۔ یعنی ان کے اموال میں تمہارا تصرف صرف امین، ناظر اور وکیل کی حیثیت سے ہے نہ کہ مالک کے طور پر۔

۲۔ وَلَا تَتَّبِعُوا النَّخَبِثَ بِالطَّيِّبِ۔ اور کبھی ان کے اعلیٰ اور پاکیزہ مال کو اپنے گھٹیا اور ناپاک مال سے تبدیل نہ کرو۔ یہ حکم تو اصل میں ظلم و ستم سے بچنے کے لیے ہے کیونکہ بعض اوقات یتیموں کے سرپرست اس بہانے سے کہ مال کی تبدیلی یتیم کے فائدے میں ہے یا اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر پڑ رہا ہے تو صحیح ہو جائے گا یہ کہہ کر یتیموں کے اچھے



اور فاضل مال لے لیتے اور اپنے بڑے اور ناپسندیدہ مال ان کی جگہ رکھ دیتے تھے۔

۳۔ وَلَا تَاْكُلُوا اَمْوَالِكُمْ اِلَىٰ اَمْوَالِكُمْ اُوْرًا اَنْ يَّمُوْنَكُمْ سَوَاءً مِمَّا كَسَبْتُمْ مِنْ قَبْلِهَا وَمِمَّا كَسَبْتُمْ بَعْدَهَا ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرَّاغِبُونَ ۗ

اپنے مال کو اپنے مال کے ساتھ غلط غلط نہ کر کہیں اس طریقے سے مقصد سب کو اپنی ملک بنانا ہو یا یہ کہ اپنے بڑے مال کو ان کے اچھے مال میں نہ ملاؤ کہ جس کا نتیجہ یتیموں کے حق کی پامالی ہو۔

جملہ بالا میں "لفظہ" الی دراصل "مع" کے ساتھ، کے معنی میں ہے۔

انہ کان حوہا کبیرا۔

آیت کے آخر میں اس امر کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے تاکید فرماتا ہے کہ یتیموں کے مال میں اس قسم کی ہیرا پھیری بہت بڑا گناہ ہے۔ راغب کتاب مفردات میں کہتا ہے: دراصل المحو بفتح ایسی ضرورت کے معنی میں ہے جو انسان کو گناہ کی طرف کھینچتی ہے۔

چونکہ سرپرستوں کے ظلم و ستم یتیموں کے مال پر زیادہ تر ضرورت و احتیاج کی وجہ سے یا اس بہانے سے ہوتے ہیں، اس لیے آیت مذکورہ میں لفظ "اشمہ" (گناہ) کی بجائے لفظ "حوہ" استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو جائے۔

قرآن مجید کا مختلف آیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام اس امر کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے۔ چنانچہ وہ یتیموں کے مال میں خیانت کرنے والوں کو بڑی شدت کے ساتھ سزا کی دھمکیاں دیتا ہے۔ وہ قطعی، واضح اور محکم عبارتوں کے ساتھ سرپرستوں کو یتیموں کے اموال کی کڑی دیکھ بھال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کی تفصیل چند آیتوں کے بعد اسی سورت میں اور سورہ انعام کی آیت ۱۵۲ اور سورہ اسرہ کی آیت ۳۴ کے ذیل میں آئے گی۔

ان آیتوں کے سخت لب و لہجہ نے مسلمانوں کے دلوں پر اتنا اثر کیا کہ وہ اس سے بھی ڈرنے لگے کہ اپنے اور یتیموں کے لیے مشترک کھانا پکائیں۔ اس وجہ سے ان کا کھانا اپنے اور اپنے بچوں کے کھانے سے الگ پکواتے تھے اور یہ امر دونوں کی تکلیف کا سبب بنتا تھا۔ اس لیے سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں انہیں یہ اجازت دی گئی کہ اگر ان کا مقصد اپنے مال یا کھانے کے ساتھ یتیموں کے مال اور کھانے کو مخلوط کرنے سے خیر خواہی اور اصلاح ہو تو اس صورت میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ مزید توضیح کے لیے سورہ بقرہ کی اسی آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی دوسری جلد ملاحظہ فرمائیے۔

۳۔ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مِمَّنِّي وَتِلْكَ رُبْعٌ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةٌ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۗ

اور اگر تم کو اس بات کا ڈر ہو کہ یتیموں سے شادی کی صورت میں، ان سے انصاف نہ کر سکو گے تو (ان سے شادی

کرنے سے صرف نظر کرو اور) دوسری پاک عورتوں سے نکاح کرو، دو یا تین یا چار بیویاں اور اگر تم کو ڈر ہو (کہ متعدد بیویوں کے بارے میں) عدل ملحوظ نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر قناعت کرو اور یا تین عورتوں کے تم مالک ہو ان سے استفادہ کرو۔ یہ طریقہ بہتر طور پر ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے۔

## شانِ نزول

اس آیت کے بارے میں ایک خاص شانِ نزول منقول ہے اور وہ یہ کہ قبل از اسلام اہلِ مہاجر و انصاریت کے لیے یتیم بچوں کو اپنے گھر لے جاتے تھے اور پھر ان سے شادی کر کے ان کے مال کو اپنی ملکیت بنا لیتے تھے کیونکہ سب کچھ انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا حق مہر بھی معمول سے کم مقرر کرتے تھے۔ اور اگر ان سے معمولی سی تکلیف بھی پیدا ہوتی تو آسانی سے انہیں چھوڑ دیتے اور وہ اس بات پر تیار نہ ہوتے کہ ایک عام بیوی کی حیثیت سے ہی ان سے تعلق باقی رکھیں۔

ان حالات میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں یتیموں کی سرپرستی کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ اگر وہ یتیم لڑکیوں سے شادی کریں تو ان کے بارے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں اور اگر ایسا نہ کر سکیں تو پھر ان سے شادی نہ کریں اور دوسری عورتوں میں سے شادی کے لیے کسی کو منتخب کریں۔

و ان خفتوا الا تقسطوا فالیتمای فانکحوا.....

گذشتہ آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں ان کے ایک اور حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کے وقت تم متعوق زوجیت اور ان کے مال کے بارے میں عدل و انصاف نہ رکھ سکو گے تو ان سے شادی نہ کرو اور دوسری عورتوں میں سے انتخاب کرو۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس پر نظر رکھتے ہوئے آیت کی تفسیر مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس سے اس اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ آیت کے شروع میں یتیموں کا ذکر ہے اور اس کے آخری حصے میں ان وراج کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور یہ دونوں ظاہراً ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے ذیل میں شادی بیاہ کا تذکرہ ہے البتہ آیت کی ابتداء میں کہا گیا ہے کہ اگر تم یتیموں سے شادی کے سلسلے میں عدل و انصاف سے کام نہیں لے سکتے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ اس سے صرف نظر کرو اور شادی کے لیے ان یتیم لڑکیوں کی بجائے دوسری عورتوں میں سے کسی کو منتخب کرو۔

مفسرین نے اگرچہ اس سلسلے میں بہت سی مختلف باتیں کی ہیں لیکن جو کچھ خود آیت سے سمجھ میں آتا ہے وہ وہی ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں یعنی آیت یتیموں کے سرپرستوں سے مخاطب ہے جنہیں گذشتہ آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت کے بارے میں مختلف احکام دیے جا چکے ہیں اور اس آیت میں ان سے یتیموں سے شادی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جیسے انہیں یتیموں کے اموال میں عدل و انصاف سے کام لینا چاہیے اسی طرح یتیم لڑکیوں سے شادی کی صورت میں بھی انتہائی توجہ سے ان کے حقوق کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے ورنہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہیے اور دوسری عورتوں کو منتخب کرنا چاہیے۔

اس آیت کی تفسیر کے بارے میں دیگر شواہد کے علاوہ اس سورہ کی آیت ۱۲۷ بھی ہے جس میں صراحت سے تیمم لو کیوں سے شادی کرنے کے لیے عدل کو ملحوظ خاطر رکھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت اسی آیت کے ضمن میں آئے گی۔ اس سلسلے میں مذکورہ روایات بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔

رہی وہ روایت جو امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے حوالے سے بیان کی گئی ہے کہ اس آیت کے اقل و آخر کے درمیان قرآن کا فی مقدار میں تھا جو حذف ہو گیا ہے۔ تو اس سلسلے میں واضح رہے کہ یہ روایت سند کے لحاظ سے کسی طرح بھی معتبر نہیں ہے۔ ایسی احادیث جو قرآن کی تحریف یا اس کے بعض حصوں کے خرد برد ہو جانے کے بارے میں ہیں دراصل قرآن کا اعتبار گنولنے کے لیے اسلام دشمنوں اور منافقوں کی طرف سے گھڑی گئی ہیں یا بعض افراد جو آیت کے آغاز و انجام کو نہیں سمجھ سکے انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ بیچ میں سے کچھ حذف یا ضائع ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ ان کا یہ مفروضہ روایت کی شکل اختیار کر گیا ہے جبکہ ہم جان چکے ہیں کہ آیت کے جملے ایک دوسرے سے مکمل ربط رکھتے ہیں۔

## ثنیٰ و ثلاث و رباع

لغت میں ثنیٰ کا معنی ہے دو، ثلاث کا تین تین اور رباع کا چار چار۔ آیت میں روئے سخن چونکہ تمام مسلمانوں کی طرف ہے اس لیے اس کا معنی یوں ہو گا: تیمم لو کیوں پر ظلم و ستم سے بچنے کے لیے تم ان سے شادی کرنے سے اجتناب کرو اور ان کی بجائے ایسی عورتوں سے شادی کرو جن کی معاشرتی اور خاندانی حیثیت ایسی ہو جو تمہیں ان پر ظلم کرنے کی اجازت نہ دے اور تم ان میں سے دو، تین یا چار عورتوں سے شادی کر سکتے ہو۔ البتہ مخاطب چونکہ تمام مسلمان ہیں اس لیے دو دو یا تین تین یا چار چار کہا گیا ہے ورنہ اس میں شک نہیں کہ زیادہ سے زیادہ بیویوں کی تعداد (وہ بھی خاص شرائط کی موجودگی میں) چار ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں واؤ دراصل ”او“ کے معنی میں ہے اور اس کا مقصد یہ نہیں کہ دو کے بعد مزید تین اور تین کے بعد مزید چار کیونکہ اس طرح تو نوؤ بن جاتی ہیں اور اگر مقصود یہی ہوتا تو صراحت سے نو کہا جاتا نہ کہ اس طرح سے ایک دوسرے سے الگ اور سچیدہ طریقے پر ہوتا۔ علاوہ ازیں فقہ اسلامی میں یہ مسئلہ ضروریات دین میں سے ہے کہ چار سے زیادہ بیویاں کرنا مطلقاً ممنوع ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت تعددِ ازدواج کے لیے مریخِ دلیل ہے البتہ ان شرائط کے ساتھ جن کی طرف جلد اشارہ کیا جائے گا۔

فان حقتم الا تعدلوا فواحدة

اس کے بعد فوراً کہا گیا ہے کہ یہ اجازت مکمل عدالت کو ملحوظ رکھنے سے مشروط ہے اور اگر عدالت نہیں کر سکتے تو اسی ایک بیوی پر اکتفاء کرنا کہ دو دوسروں پر ظلم و ستم کرنے سے بچ سکو۔

۱۷ نور الثقلین، جلد اول صفحہ ۴۳۳ اور تفسیر اندرزیر نظر آیت کے ذیل میں۔



او ما ملکت ایمانکم۔ یا کسی اور بیوی کے انتخاب کی بجائے جو کیز تہباری ملکیت ہے اس سے استفادہ کرو کیونکہ ان کی شرائط آسان سی ہیں (اگرچہ انہیں بھی ان کے حقوق ادا کیے جانا چاہئیں)۔  
ذٰلک ادنیٰ الا تعولوا۔ یہ (بیوی یا کیز کے چناؤ کا) کام ظلم و ستم اور عدالت سے انحراف سے بہتر بچاؤ کرتا ہے غلامی کے مسئلے کے بارے میں اور اس سلسلے میں اسلام کے نظریے کے متعلق متعلقہ آیات میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

### بیویوں سے عدالت کا مفہوم

اس سے قبل کہ ہم اسلام میں بیویوں کی تعداد کے فلسفہ پر بات کریں ضروری ہے کہ اس امر پر بحث کی جائے کہ بیویوں سے عدالت، کا کیا مفہوم ہے کیونکہ اس سے بیویوں کی تعداد کے سلسلے میں ایک شرط کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔  
کیا یہ عدالت امور زندگی سے مربوط ہے، مثلاً ہم بستری، وسائل زندگی کی فراہمی، سہولت اور آسائش و آرام مہیا کرنا یا اس سے مراد حرمِ دل اور جذباتِ انسانی کی عدالت بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محبت و الفت کے معاملے میں عدالت کرنا قدرتِ انسانی سے خارج معاملہ ہے۔ کون ایسا شخص ہے جو جذبہ محبت پر سبرِ لحاظ سے دسترس رکھے جب کہ اس کے عوامل اس کی اپنی ذات سے باہر ہیں۔ اس بناء پر خدا تعالیٰ نے اس بارے میں عدالت کو واجب قرار نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ اسی سورہ نساء کی آیت ۱۲۹ میں فرماتا ہے:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ

تم جس قدر بھی کوشش کرو اپنی بیویوں کے درمیان (قلبی میلانات کے لحاظ سے) عدالت و مساوات برقرار نہیں رکھ سکتے۔

لہذا اندرونی محبت جب تک عملی پہلوؤں کی بناء پر بعض بیویوں کی ترجیح کا سبب بننے ممنوع نہیں ہے۔ مرد پر جو ذمہ داری ہے وہ عملی اور خارجی پہلوؤں کے بارے میں عدالت سے متعلق ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ زیر بحث آیت۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةٌ اَوْ اٰیٰتٌ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ کو آپس میں ملا کر اور منسلک قرار دے کر یہ نتیجہ نکالیں کہ تعدد ازدواج اسلام میں مطلقاً ممنوع ہے، وہ بہت ہی بڑے اشتباہ کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک آیت میں عدالت کو اس سلسلے میں شرط قرار دیا گیا ہے اور دوسری میں اس سلسلے میں مردوں کے لیے عدالت کرنا محال قرار دیا گیا ہے اس لیے ایک سے زیادہ شادی ممنوع ہے اور یہی ان کا اشتباہ ہے کیونکہ ہمیشہ کا اشارہ ہو چکا ہے کہ وہ عدالت جو انسان کے بس میں نہیں ہے وہ قلبی میلانات سے متعلق ہے اور یہ تعدد ازدواج کی شرائط میں شامل نہیں اور جو عدالت شرائط میں سے ہے وہ عملی پہلوؤں سے متعلق ہے۔ اس کی شاہد سورہ نساء کی آیت ۱۲۹ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُوا كَلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمَعْلَقَةِ

اب جب کہ تم محبت کے سلسلے میں اپنی بیویوں سے مکمل مساوات نہیں کر سکتے تو کم از کم سب میلان ایک

ہی کی طرف نہ رکھو کہ ہمیں دوسری کو متعلق بنا کر ہی رکھ دو۔

خلاصہ یہ کہ ان لوگوں نے آیت کے کچھ حصے کو تو سامنے رکھا ہے اور کچھ کو فراموش کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تعددِ ازدواج کے ضمن میں ایسے اشتباہ کا شکار ہو گئے ہیں جو ہر متقن کے لیے باعثِ تعجب ہے۔

علاوہ ازیں فقہ اسلامی اور اس کے مختلف منابع و مصادر کے لحاظ سے اہل تشیع اور اہل سنت میں تعددِ ازدواج اور اس کی شرائط کے بارے میں کوئی اختلاف و نزاع نہیں ہے بلکہ اس کا شمار فقہ اسلامی کی ضروریات اور بدیہات میں ہوتا ہے۔ اب ہم اس اسلامی حکم کی حکمت و فلسفے کی طرف لوٹتے ہیں۔

### تعددِ ازدواج ایک اجتماعی ضرورت

مندرجہ بالا آیت میں تعددِ ازدواج کو (سخت شرائط اور معین حدود کے ساتھ) جائز قرار دیا ہے۔ اب ہم ان سوالات اور جملوں کا سامنا کریں گے جو مخالفین نے سطحی مطالعہ اور بے شعور احساسات کے باعث کیے ہیں۔ اہل مغرب بالخصوص اس سلسلے میں بہت اتر آئی کرتے ہیں کہ اسلام نے مردوں کو حرم سرا بنانے اور لاتعداد بیویاں رکھنے کی اجازت دے دی ہے علائکہ اسلام نے اس طرح سے حرم سرا کی تشکیل کی اجازت نہیں دی جیسے ان کا خیال ہے اور نہ ہی لاتعداد اور غیر مشروط بیویوں کی اجازت دی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ قبل از اسلام کے مختلف معاشروں کی کیفیت کا مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غیر محدود طور پر تعددِ ازدواج ان میں ایک عام سی چیز تھی۔ یہاں تک کہ بعض بت پرست جب مسلمان ہوئے تو ان کی دس سے بھی زیادہ بیویاں تھیں لہذا تعددِ ازدواج کی بنیاد اسلام نے نہیں رکھی اور نہ یہ کوئی نئی ایجاد ہے۔ بلکہ اسلام نے تو اسے انسانی زندگی کے تقاضوں کی روشنی میں محدود کر دیا ہے اور مزید یہ کہ اس کے لیے سخت قسم کی شرائط اور قیود مقرر کر دی ہیں۔

اسلامی قوانین انسان کی حقیقی ضروریات کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ قوانین پراپیگنڈا اور جذبات کی رو میں بر کر نہیں بنائے گئے۔ تعددِ ازدواج کا معاملہ بھی اسلام نے اپنے اسی مزاج کے مطابق پیش کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زندگی کے گونا گوں حوادث میں مرد عورتوں کی نسبت موت کے خطرات سے زیادہ دوچار ہوتے ہیں۔ جنگوں اور دیگر حوادث میں زیادہ تر مرد ہی موت کا شکار ہوتے ہیں۔ نیز اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عورت کی نسبت مرد کی جنسی زندگی کہیں زیادہ طولانی ہوتی ہے۔ کیونکہ عورتیں ایک معین مرحلے کے بعد اپنی جنسی آمادگی کھو بیٹھتی ہیں جبکہ مردوں کا معاملہ مختلف ہے نیز ایام ماہواری اور وضعِ حمل کے کچھ دنوں میں عملی طور پر عورتوں کے لیے جنسی ملاپ ممنوع ہے جبکہ مردوں کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں۔

ان تمام باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے بعض پہلو اور بھی قابلِ توجہ ہیں۔ بعض عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے شوہروں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں وہ مردوں کے لیے اس پہلو سے قابلِ توجہ نہیں ہوتیں کہ وہ ان کے پہلے شوہر ہوں۔ اب اگر تعددِ ازدواج کی سہولت نہ ہو تو وہ ساری عمر بغیر شوہر کے بیٹھی رہیں۔ اکثر اخبارات و جرائد میں ایسی خبریں چھپتی ہیں کہ بعض ایسی بیوہ عورتیں ہیں جو تعددِ ازدواج کے محدود ہونے کے باعث اپنی زندگی کی بے سروسامانی پر شکوہ کنال ہیں اور مردوں کی طرف سے ایک سے زیادہ شادیاں نہ کونے کو اپنے ساتھ ایک ظالمانہ سلوک تصور کرتی ہیں۔

ان حقائق کو ایسے مواقع پر سامنے رکھیں کہ جہاں مرد اور عورت کے درمیان توازن ختم ہو جاتا ہے تو ہم مجبور ہیں کہ ذیل کی تین صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے۔

۱ - برصورت میں مرد ایک ہی بیوی پر قناعت کریں اور جو عورتیں بیچ جائیں وہ تمام عمر بغیر شوہر کے گزار دیں اور تمام فطری تقاضوں اور اندرونی خواہشات کو دبائے رکھیں۔

۲ - مرد قانونی طور پر تو ایک ہی بیوی رکھیں لیکن آزاد اور غیر شرعی منسی رواد بطبے شوہر عورتوں سے رکھیں اور انہیں داشتہ بنا کر رکھیں۔

۳ - جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں اور جسمانی، مالی اور اخلاقی لحاظ سے انہیں کوئی اور مشکل درپیش نہ ہو نیز وہ اپنی بیویوں اور بچوں کے درمیان کامل عدالت قائم رکھ سکیں انہیں اجازت دی جائے کہ وہ اپنے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کا انتخاب کر لیں۔

یہ مسلم ہے کہ ان تین راستوں کے علاوہ کوئی اور راستہ موجود نہیں۔

پہلے راستے کے انتخاب کا مطلب یہ ہے کہ ہم انسان کی فطرت، سرشت اور روحانی و جسمانی ضروریات کے خلاف جنگ کریں اور ایسی عورتوں کے جذبات و احساسات کی پروا نہ کریں اور یہ وہ جنگ ہے جس میں کامیابی کی کوئی امید نہیں اور اگر فرض کریں کہ ایسا ہو جائے تو اس طرز عمل کے غیر انسانی پہلو کسی سے مخفی نہیں ہیں۔

دوسرے لفظوں میں تعددِ ازدواج کا مسئلہ ضرورت کے مواقع پر صرف پہلی بیوی کی آنکھ کے دریچے سے نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ اس کا مطالعہ دوسری بیوی کی آنکھ کے دریچے سے کیا جانا چاہیے جو لوگ پہلی بیوی کی مشکلات کو دوسری بیوی کے معاملے میں مثال بناتے ہیں وہ دراصل تین زاویوں والے مسئلے کو صرف ایک زاویے سے دیکھتے ہیں کیونکہ تعددِ ازدواج کا مسئلہ مرد کی نگاہ کے زاویے سے، پہلی بیوی کی نگاہ کے زاویے سے اور دوسری بیوی کی نگاہ کے زاویے سے دیکھا جانا چاہیے اور ان تینوں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بارے میں فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

دوسری راہ کے انتخاب کا مطلب ہے کہ فرض اور قبیح کاموں کو قانونی حیثیت دے دی جائے اور عورتوں کو داشتہ کی حیثیت سے جنسی لذتوں کے لیے استعمال کیا جائے، ان کے لیے نہ اطمینان و سکون ہو اور نہ ان کا کوئی مستقبل اور دراصل ان کی شخصیت کو روند ڈالا جائے۔ یہ کوئی ایسا طریقہ نہیں جسے کوئی عقلمند انسان تجویز کرے۔

لہذا صرف تیسرا طریقہ باقی رہ جاتا ہے جو عورتوں کی فطری خواہشات اور طبعی ضروریات کا حل بھی ہے اور قبیح امور کے بُرے نتائج اور تباہ کن زندگی سے عورتوں کی نجات کا راستہ بھی ہے۔ اس طرح سے عورت معاشرے کو بھی گداب گناہ سے نکال لے گی۔

البتہ تو جہ رہے کہ تعددِ ازدواج کا جواز اگرچہ معاشرے کی ایک ضرورت ہے اور اسلام کے مسلم احکام میں سے ہے لیکن موجودہ زمانے میں اس کی شرائط کی تکمیل گزشتہ زمانے سے بہت مختلف ہے کیونکہ گزشتہ زمانے میں زندگی سادہ اور سببسی تھی لہذا عورتوں میں کامل مساوات کا لحاظ رکھنا آسان تھا اور زیادہ تر لوگ اس سے عہدہ براہم لیتے تھے لیکن ہمارے زمانے



میں جو شخص اس قانون سے استفادہ کرنا چاہے اُسے چاہیے کہ ہر لحاظ سے عدالت کو ملحوظ خاطر رکھے۔ اگر وہ ایسا کرے تو یہ اقدام کسے اور بنیادی طور پر یہ قدم ہوا دوسری کی بنا پر نہیں ہونا چاہیے۔

تعب کی بات ہے کہ اہل مغرب کی طرح جو لوگ تعدد ازدواج کے مخالف ہیں اپنی تاریخ میں ایسے حوادث کا شکار رہے ہیں جن سے ان کی یہ ضرورت مکمل طور پر واضح ہو گئی ہے مثلاً دوسری عالمی جنگ کے بعد جنگ زدہ ممالک میں خصوصاً جرمنی میں اس کی سخت ضرورت کا احساس ہوا۔ یہاں تک کہ ان کے بعض مفکرین تعدد ازدواج کے ممنوع ہونے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوئے تاکہ مشکل کا کوئی حل نکل سکے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے "الازہر" سے رجوع کیا اور ان سے تعدد ازدواج کے بارے میں اسلامی حکم کی تفصیلات منگوائیں اور اس پر تحقیق و مطالعہ شروع کیا لیکن کلیسا نے ان پر سخت حملے اور تنقیدیں کیں جن سے مجبور ہو کر انہیں یہ پروگرام چھوڑنا پڑا اور پھر اس کا نتیجہ وحشتناک فحاشی اور وسیع بے راہ رومی کی صورت میں نکلا کہ جس نے تمام جنگ زدہ ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ان تمام باتوں کو چھوڑتے ہوئے، اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض مرد ایک سے زیادہ بیویوں کی طرف میلان و رغبت رکھتے ہیں۔ اگر یہ میلان صرف ہوا دوسری کی بنا پر ہو تو ٹھیک ہے اعتناء نہیں کرنا چاہیے لیکن بعض اوقات بیوی بانجھ ہوتی ہے اور مرد کو اولاد کی شدید خواہش ہوتی ہے اس صورت میں مرد کی خواہش منطقی ہوتی ہے یا بعض اوقات مرد کی خواہشات جنسی شدید ہوتی ہے جبکہ اس کی پہلی بیوی مرد کی اس فطری خواہش کی تکمیل کی طاقت نہیں رکھتی لہذا مرد دوسری شادی کے لیے اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے یہاں تک کہ جائز طریقے سے تکمیل خواہش نہ ہونے کی صورت میں وہ غیر شرعی قدم اٹھاتا ہے ان مواقع پر بھی دوسری شادی کے لیے مرد کی خواہش کے منطقی ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس بنا پر جن ممالک میں قانوناً ایک سے زیادہ شادیاں ممنوع ہیں عملاً مختلف عورتوں سے مختلف صورتوں میں ارتباط بالکل موجود ہے اور ایک ہی مرد ایک ہی وقت میں مختلف عورتوں سے ناجائز تعلقات استوار کیے جاتا ہے۔

مشہور فرانسیسی مورخ گوستاو لوبون تعدد ازدواج کے بارے میں اسلامی قانون، جو کہ محدود و مشروط ہے کو دین اسلام کی خوبیوں میں سے شمار کرتا ہے۔ وہ یورپ کے مردوں کے متعدد عورتوں سے آزادانہ ناجائز روابط کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

مغرب میں بھی جہاں کی آب و ہوا اور وضع طبیعت اگرچہ اس رسم (تعدد ازدواج) کو قبول نہیں کرتی پھر بھی ایک بیوی کا ہونا ایک ایسی چیز ہے جو صرف قانون کی کتاب میں دکھائی دیتی ہے در نہ مجھے یگانہ نہیں کہ اس بات کا انکار کیا جائے کہ ہمارے معاشرے میں اس رسم کے آثار نہیں ہیں۔ واقعا میں حیران ہوں اور میں نہیں جان سکا کہ مشرق کے جائز اور محدود تعدد ازدواج کے نظریے میں مغرب کے مکارانہ اور فریب دہندہ تعدد ازدواج کے حوالے سے کیا کمی ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلا طریقہ دوسرے کی نسبت ہر لحاظ سے بہتر اور زیادہ شائستہ ہے۔

البتہ اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض مسلمان مناوگ اس اسلامی قانون کی روح کے منافی اس سے سوہ استفادہ

کرتے ہیں اور شرمناک طریقے سے اپنے لیے بیویاں مہیا کرتے ہیں اور اپنی بیویوں کے حقوق میں تجاوز کرتے ہیں لیکن یہ قانون کی خرابی نہیں اور ان لوگوں کے کردار کو اسلامی قوانین کے کھاتے میں نہیں ڈالنا چاہیے کون سا ایسا قانون ہے جس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جاتا ہو۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا حالات و کوائف بعض عورتوں کے لیے پیدا ہو جائیں تو کیا اس صورت میں عورت کو بھی دوشوہروں کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

اس سوال کا جواب کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ (عوام میں مشہور بات کے برعکس) مردوں میں عورتوں کی نسبت جنسی میلان کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ — علمی کتابوں میں جنسی مسائل سے مربوط بیماریاں زیادہ تر عورتوں کے بارے میں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک عورتوں کی سرد مزاجی بھی ہے جبکہ مردوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے یہاں تک کہ دوسرے جانداروں میں سے دیکھا گیا ہے کہ صبیحہ اشجی کا اظہار عموماً پہلے نر کی طرف سے ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعددِ ازدواج مرد کے بارے میں کوئی اجتماعی اور حقوق سے متعلق مشکل پیدا نہیں کرتا جبکہ عورتوں کے لیے اگر بالفرض دوشوہروں تو بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ ان میں سے ایک سادہ سا مسئلہ یہ ہے کہ بچے کا نسب مجہول ہو جاتا ہے اور اس کے بارے میں علم نہیں ہوتا کہ وہ کس شوہر کا ہے اور یہ مسلم ہے کہ ایسا بچہ ان میں سے کسی مرد کی شفقت کا مرکز نہیں بن سکے گا یہاں تک کہ بعض علماء کا نظریہ ہے کہ جس بچے کا باپ مجہول ہو اسے ماں کی محبت بھی بہت کم میرائے گی۔ ایسے بچے محبت و شفقت سے تو بالکل محروم رہیں گے ہی، حقوق کے لحاظ سے بھی ان کی کیفیت بالکل مبہم ہو جائے گی۔

شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ انتقاد و نطق سے بچنے کے لیے برتھ کنٹرول کے طریقوں سے استفادہ مثلاً گوریاں وغیرہ استعمال کرنا کبھی سچی اطمینان بخش نہیں ہے اور یہ طریقے بچہ نہ ہونے کی یقینی دلیل نہیں بن سکتے کیونکہ بہت سی ایسی عورتیں ہیں جنہوں نے ان طریقوں کو استعمال کیا ہے یا طریقہ استعمال میں اشتباہ کیا ہے اور اس کے باوجود بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ لہذا کوئی عورت بھی اعتماد سے تعددِ ازدواج کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔

ان وجوہات کی بناء پر عورتوں کے لیے مختلف شوہروں کا ہونا منطقی نہیں ہو سکتا جبکہ مردوں کے لیے ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے منطقی بھی ہے اور عملی بھی۔

۴۔ وَاتُوا النِّسَاءَ صَدَقْتِهِنَّ نِحْلَةً ط فَإِنْ طِبَّنْ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ

كُفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا ○

## ترجمہ

۴ اور عورتوں کا حق مہر (اپنے اوپر بالکل) ایک قرض سمجھتے ہوئے (یا ایک عطیہ کے طور پر) انہیں ادا کر دو اور اگر وہ راضی خوشی اس میں سے کوئی چیز تمہیں بخش دیں تو اسے حلال اور مناسب سمجھتے ہوئے استعمال کر لو۔

## تفسیر

”مخلّۃ“ لغت میں قرض کے معنی میں بھی آیا ہے اور بخشش و عطیہ کے معنی میں بھی۔  
راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتا ہے:

میرے نظریے کے مطابق یہ لفظ نخل (جس کا معنی شہد کی مکھی ہے) کے مادہ سے ہے کیونکہ بخشش و عطیہ شہد کی مکھیوں کے کام یعنی شہد دینے سے شباہت رکھتا ہے۔  
”صدقاہن“ ”صدقا“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے ”مہر“۔

گذشتہ آیت میں بیوی کے انتخاب کے بارے میں گفتگو تھی اب اس آیت میں عورتوں کے ایک مسلہ حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت تاکید کرتی ہے کہ عورتوں کا حق مہر بالکل ایک قرض کی طرح ادا کر دینی جیسے دوسرے قرضوں کی اور ان کی کا خیال رکھتے ہو کہ ان میں سے کوئی چیز کم نہ ہو، حق مہر ادا کرتے وقت بھی تمہاری یہی حالت ہونا چاہیے یہ اس صورت میں ہے اگر مخلّۃ کا معنی قرض یا جائے، اور اگر اس کا معنی عطیہ اور بخشش کیا جائے تو پھر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی: حق مہر جو کہ ایک عطیہ الہی ہے اور خدا نے اس لیے مقرر کیا ہے کہ معاشرے میں عورت کے حقوق زیادہ ہوں اور اس کی جسمانی کمزوری کی اس طرح سے تلافی ہو جائے، اسے مکمل طور پر ادا کر دو۔

فان طبن لکم عن شیء منہ نفسا فکلوہ ہنیثا مویثا

آیت کی ابتدا میں حقوق نسواں کی حفاظت کے لیے صراحت سے حکم دیا گیا ہے کہ تمام حق مہر انہیں ادا کر دینا آیت کے ذیل میں طرفین کے احساسات کا احترام کرتے ہوئے، تلبی رشتوں کے استحکام اور باہمی محبت کے فروغ کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے، اگر عورتیں پوری رضا و رغبت سے اپنے مہر میں سے کچھ مقدار بخش دیں تو وہ تمہارے لیے حلال اور شائستہ ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ باہمی زندگی میں صرف خشک قانون اور کیے ہی نہ چلتے رہیں بلکہ متوازی طور پر محبت و الفت کے جذبے حکم فرما ہوں۔

## حق مہر عورت کے لیے ایک معاشرتی سہارا ہے

زمانہ جاہلیت میں چونکہ لوگ عورت کی قدر و قیمت کے قائل نہیں تھے اس لیے اکثر اوقات حق مہر جو کہ عورت کا مسلم حق ہے وہ اس کے والیوں کو دے دیتے تھے اور اسے ان کا مسلم حق سمجھتے تھے۔ بعض اوقات ایک عورت کا حق مہر دوسری عورت کی شادی کو قرار دیتے تھے مثلاً ایک مہجائی اپنی بہن کی شادی کسی سے کرتا تو اسے بھی مقابلے میں اپنی بہن سے دینا پڑتی اور



ان دونوں عورتوں کا یہی حق مہر ہوتا۔

اسلام نے ان تمام ظالمانہ رسوم پر خطِ بطلان کھینچ دیا اور حق مہر کو مخصوص طور پر عورت کا مسلم حق قرار دیا اور آیاتِ قرآنی میں بار بار مردوں کو اس حق کی مکمل ادائیگی کی نصیحت کی۔

اسلام میں حق مہر کے لیے کوئی مقدار معین نہیں کی گئی اور اس کا انحصار میاں بیوی کی باہمی رضامندی پر ہے اگرچہ بہت سی روایات میں تاکید کی گئی ہے کہ حق مہر زیادہ نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ کوئی لازم و واجب حکم نہیں ہے بلکہ مستحب حکم ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرد اور عورت شادی اور مباشرت سے یکساں طور پر بہرہ مند ہوتے ہیں اور میاں بیوی کا رشتہ طرفین کے باہمی فائدے میں قائم ہوتا ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مرد کم یا زیادہ مال عورت کو حق مہر کے طور پر دے۔ کیا اس طرح اس حکم سے عورت کے مقام پر زد نہیں پڑتی اور شادی بیاہ میں خرید و فروخت کی صورت نہیں بن جاتی؟ اسی وجہ سے بعض لوگ حق مہر کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ مغرب میں چونکہ اس کا معمول نہیں ہے اس لیے مغرب زدہ لوگ خاص طور پر یہ مخالفت کرتے ہیں حالانکہ حق مہر کے نہ ہونے سے عورت کے مقام میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا لیکن اس طرح وہ خطرے سے ضرور دوچار ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ عورت اور مرد یکساں طور پر ازدواجی زندگی سے فائدے اٹھاتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علیحدگی کی صورت میں عورت کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ نفسی و جسمانی استعداد کی بناء پر مرد عموماً معاشرے میں زیادہ نفوذ اور تسلط کا حامل ہوتا ہے اگرچہ بعض لوگ بات کرتے وقت اس واضح حقیقت کا انکار کر دیتے ہیں لیکن انسان کی اجتماعی زندگی کی کیفیت جو آنکھوں کو نظر آتی ہے یہ ہے کہ زیادہ آمدنی والے کام زیادہ تر مردوں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ خود یورپ کی بھی یہی حالت ہے جہاں اصطلاحی طور پر عورتیں مکمل آزادی سے جھکنا رہیں۔

علاوہ ازیں مردوں کے لیے نئی بیوی کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں لیکن بیوہ عورتیں خصوصاً جب ان کی عمر کچھ حصّہ گزر جائے اور وہ جوانی و زیبائی کا سرمایہ ختم کر بیٹھیں تو نئے شوہر کے لیے ان کے امکانات بہت کم ہوجاتے ہیں حقیقت میں حق مہر ایک ایسی چیز ہے جو عورت کے لیے اس کے خسارے کی تلافی کا ذریعہ ہے اور آئندہ زندگی کے محفوظ رکھنے کا وسیلہ ہے۔ علاوہ ازیں حق مہر عموماً مرد کو علیحدگی اختیار کرنے اور اسے طلاق دینے کے میلانات سے روکنے کے لیے ایک بریک (BRAKE) کا کام دیتا ہے۔

یہ درست ہے کہ قوانین اسلام کی رو سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہی حق مہر مرد کے ذمے ہو جاتا ہے اور عورت فوراً ہی اس کے مطالبے کا حق رکھتی ہے لیکن چونکہ عموماً وہ قرض کی صورت میں مرد کے ذمہ رہ جاتا ہے لہذا یہ عورت کے لیے ایک پس انداز بچت کی حیثیت رکھتا ہے اور رشتہ تزویج نہ ٹوٹنے کے لیے ایک سہارے کا کام دیتا ہے۔

اس مسئلے کے کچھ امتثنائی پہلو بھی ہیں لیکن ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر مقامات پر صادق آتا ہے۔

اب اگر بعض لوگوں نے حق مہر کی غلط تفسیر کی ہے اور اسے عورت کی ایک طرح سے قیمت خیال کیا ہے، اس کا

قوانین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اسلام میں کسی طرح بھی حق مہربان تجارت کی قیمت کا پہلو نہیں رکھتا اور اس کی بہترین دلیل نکاح کے صیغے ہیں جن میں قانونی طور پر مرد اور عورت ہی اس بیان کے دو بنیادی رکن شمار ہوتے ہیں اور حق مہربان ایک اضافی چیز ہے اور کتاب کے حاشیے کے مترادف ہے۔ اسی بنا پر اگر صیغہ نکاح میں حق مہربان تذکرہ نہ کیا جائے تو عقد باطل نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں شوہر کی ذمہ داری ہے کہ مباشرت سے قبل اس عورتوں کا ساتھ مہربان کرے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حق مہربان نقصان کی تلافی اور عورت کے حقوق کے احترام کے پیش نظر ہے۔

نہ اس کی قیمت ہے اور شاید نملہ (بمعنی عطیہ) اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

۵. وَلَا تَوْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيمًا وَأَرْزُقُوهُمْ

فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ○

۴. وَابْتَلُوا الَّتِي تَمَّى حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا

فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ

فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۖ وَكَفَىٰ

بِاللَّهِ حَسِيبًا ○

ترجمہ

۵ اور اپنے اموال کو جنہیں خدا نے تمہاری زندگی کا وسیلہ قرار دیا ہے انہیں بے وقوفوں کے ہاتھ میں نہ دے دو اور

انہیں اس میں سے روزی دے دو اور انہیں لباس پہناؤ اور ان سے شائستہ طریقے سے گفتگو کرو۔

۴ اور یتیموں کو آتما کر دیکھو یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئے ہیں تو اگر ان میں (کافی) رشد و شعور

پاؤ تو ان کے اموال ان کے سپرد کرو اور ان کے بڑے ہونے سے پہلے ان کے اموال اسراف اور فضول خرچی کے

طور پر نہ کھاؤ اور (سرپرستوں میں سے) جو شخص بے نیاز ہے وہ (حق زحمت لینے سے) اجتناب کرے اور جو شخص

ضرورت مند ہے وہ شائستہ طریقے سے (اور جو زحمت اُس نے اٹھائی ہے اُس کے مطابق) اس میں سے

کھائے اور جب ان کا مال انہیں دے دو تو اس (ادائیگی) پر گواہ بنا لو (اگرچہ) خدا مہربان کے لیے کافی ہے۔

## تفسیر

مندرجہ بالا آیات تیمیوں سے مربوط مباحث کی تکمیل کرتی ہیں۔ کچھ بحث گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے۔  
ولا تاتوا السفہاء اموالکم

اپنا مال و دولت بے وقوفوں کے سپرد نہ کرو اور انہیں رہنے دو یہاں تک کہ وہ اقتصادی معاملات میں شعور حاصل کر لیں تاکہ تمہاری دولت خطرے اور نقصان کی زد سے بچ جائے۔

## سفیہ کسے کہتے ہیں

راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ سفہ (بروزن تبا) اصل میں ایک طرح کی کم وزنی اور بدن کا ہلکا ہونا ہے جس میں یہ حالت ہو کہ چلتے وقت اعتدال کو برقرار نہ رکھا جاسکے۔ اسی لیے اس افسار کو سفیہ کہتے ہیں جو ناموزوں ہو اور ہمیشہ جلتی جلتی رہے۔ بعد ازاں یہ لفظ اسی مناسبت سے ان افراد کے لیے استعمال ہونے لگا جو سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں چاہے ان کا ہلکا پن امور مادی میں ہو یا امور معنوی میں۔

لیکن واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سفاہت کا تعلق خصوصیت سے مالی امور میں کافی سمجھ بوجھ نہ ہونے سے ہے۔ اور یہاں سفیہ سے مراد وہ شخص ہے جو اموال کی سرپرستی اپنے ذمہ نہ لے سکے اور مال و دولت کے لین دین میں اپنے فائدے کو نہ سمجھ سکے۔ اصطلاح میں کہتے ہیں گاہ سرش برود (یعنی — لوگ اس کا سر منڈ لیں) اس مفہوم کی شاہد اگلی آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

فان النستہ منہم رشدا فادفعوا الیہم اموالہم۔

اگر انہیں سمجھدار پاؤ تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔

اس بناء پر اگرچہ زیر نظر آیت تیمیوں کے بارے میں بحث کر رہی ہے لیکن اس کا ایک عمومی مفہوم تمام لوگوں کے لیے ہے اور وہ یہ کہ انسان کو کسی حالت میں اور کسی صورت میں وہ مال جو اس کی سرپرستی میں ہو یا کسی طرح سے اس سے وابستہ ہونا نہم اور نا سمجھ افراد کے سپرد نہیں کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں اموال عمومی (اموال حکومت اسلامی) میں بھی کوئی امتیاز نہیں۔ اس مفہوم کا شاہد لفظ "سفیہ" کا وسیع مفہوم بھی ہے اور اس کے علاوہ وہ روایات بھی ہیں جو بادیان اسلام سے اس سلسلے میں منقول ہیں۔ مثلاً امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہے۔

ایک شخص ابراہیم بن عبد الحمید کہتا ہے کہ میں نے امام سے آیت ولا تاتوا السفہاء اموالکم کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا:

لہ افسار اسی کو کہتے ہیں جو گھوڑے یا گدھے کے سر اور گردن پر باندھی جائے (مترجم)۔



شراب خور سفیہ ہیں اپنے اموال ان کے سپرد نہ کر دیے

ایک اور روایت میں بھی شرابی کو مالی امور میں امین بنانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

غلام یہ کہ بار بار روایات میں شرابی کو سفیہ قرار دیا گیا ہے اور یہ تعبیر شاید اس بنا پر ہے کہ شرابی اپنا مادی سرمایہ بھی ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے اور معنوی بھی۔ اس سے بڑھ کر بے وقوفی کیا ہوگی کہ انسان پیسے بھی دے اور اس کے ساتھ اپنی عقل و ہوش بھی دے دے اور دیوانگی خرید لے، اپنے بدن کے مختلف توئی بھی اس کام میں لگا دے اور بہت سے اجتماعی نقصانات بھی کرے۔

ایک اور روایت میں ان سب لوگوں کو جو کسی لحاظ سے بھی بھروسہ کے قابل نہ ہوں سفیہ کہا گیا ہے اور (شخصی اور عمومی) اموال ان کے سپرد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

یونس بن یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیۃ **وَلَا تَوْتُوا السُّفَهَاةَ اَمْوَالِكُمْ** کی تفسیر پوچھی۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا:

من لا مشق بہ۔

سفیہ وہ شخص ہے جو قابل اعتماد نہ ہو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر آیت تیموں کے بارے میں ہے تو "اموالکم" (تمہارے اموال) کیوں فرمایا ہے۔ "اموالکم" ان کے مال کیوں نہیں فرمایا۔

مکن ہے اس تعبیر کا مقصد اس اجتماعی اور اقتصادی مسئلہ کو بیان کرنا ہو کہ اسلام انسانی معاشرے کے تمام افراد کو ایک سمجھتا ہے۔ اس بنا پر کہ ایک شخص کی بہتری اور جملائی دوسروں کے نفع سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک شخص کا نقصان پورے معاشرے کا نقصان ہے۔

اسی وجہ سے اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضمیر فاسد کی بجائے "ضمیر فاسد" استعمال کی گئی ہے یعنی حقیقت میں ان اموال کا تعلق صرف تیموں سے نہیں بلکہ تمہارے ساتھ بھی ہے۔ اگر انہیں کوئی نقصان پہنچے گا تو وہ کسی کسی صورت میں تمہاری طرف لوٹے گا۔ اس لیے اس کے مال کی پوری طرح نگرانی کرنا چاہیے۔

اس سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کوتاہ نظر لوگ کمزور اور بزدل افراد کو مذہبی اور تبلیغی عہدوں کے لیے ان کی مدد کے بہانے ازراہ ہمدردی چنتے ہیں، ان کا یہ ایک سراسر غلط اور مجنونانہ فعل ہے۔

الْحَقُّ جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا

اس جملے میں قرآن نے مال و ثروت کے لیے ایک عجیب و غریب تعبیر بیان فرمائی ہے، تمہاری زندگی اور سوسائٹی کا قیام سرمایہ پر ہی منحصر ہے اس کے بغیر تم آزادی سے اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اسے سفیہ اور فضول خرچ لوگوں

۱۰ تفسیر برہان جلد اول زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۱۱ تفسیر برہان، جلد ۱، زیر بحث آیت کے ذیل میں، تفسیر نور الثقلین بھی دیکھ سکتے ہیں۔

کے سپرد نہ کرو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اقتصادی اور مالی اہمیت کا قائل ہے۔  
اس کے برعکس موجودہ انجیل میں ہے کہ مالدار آدمی جنت میں نہیں جاسکے گا۔ اسلام کہتا ہے کہ جو قوم فقیر و نادار ہو وہ کبھی  
اپنی کمرسیدھی نہیں کر سکتی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ عیسائی اپنی غلط تعلیمات کے باوجود دنیا میں اوج کمال پر پہنچے ہوئے ہیں  
اور ہم ان اعلیٰ اسلامی تعلیمات کے باوجود ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

اصل میں انہوں نے خرافات چھوڑ دی ہیں، اس لیے وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں اور کیونکہ ہم نے ان اعلیٰ داروغ  
تعلیمات سے دوری اختیار کر لی ہے اس لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔  
وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا  
آیت کے آخر میں یتیموں کے بارے میں دو اہم حکم دیے گئے ہیں:

۱۔ ان کی خوراک اور پوشاک انہی کے مال سے ہتیا کرو تاکہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ پر دان چڑھیں اور بالغ ہوں  
یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں لفظ ”ہیذا“ (ان کے مال میں) آیا ہے ”ہنہا“ (ان کے مال سے)  
نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یتیموں کی گزراوقات ان کے مال اور سرمایہ کے نفع سے پوری کر دو کیونکہ اگر یہ کہا جاتا  
کہ ان کے اخراجات ان کے سرمائے سے پورے کرو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ اصل سرمایہ سے آہستہ آہستہ اخراجات  
پورے کیے جائیں اور یہ فطری امر ہے کہ جب وہ سن بلوغ کو پہنچیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سرمائے کا زیادہ تر حصہ  
ہاتھ سے کھو بیٹھے ہوں۔ لیکن قرآن الفاظ کی تبدیلی سے سرپرستوں کو یہ نصیحت و وصیت کرتا ہے کہ وہ یتیموں کے  
مال کے نفع اور آمدنی سے ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کا اصل سرمایہ محفوظ رہے۔  
۲۔ دوسرے یہ کہ آیت کہتی ہے کہ یتیموں کے ساتھ شائستگی سے گفتگو کرو۔ یعنی دل کو خوش کرنے والی اچھی باتوں  
سے ان کی نفسیاتی کمی کو دور کرو اور ان کو نصیحت کرتے رہو تاکہ وہ سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے اچھے خاصے سجدار ہو جائیں  
اسی طرح یتیموں کی تشکیل سیرت اور تعمیر کردار بھی سرپرستوں کی ذمہ داری ہے۔

وَابْتَغُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ -

یہاں یتیموں اور ان کے مال کے بارے میں ایک اور حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے: یتیموں کی آزمائش کرو، انہیں  
تجربے میں ڈالو یہاں تک کہ جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں تو اس وقت اگر ان میں معاملہ فہمی اور مال کی حفاظت کی سوجھ  
بوجھ پاؤ تو ان کا مال انہیں واپس کر دو۔

## چند اہم نکات

۱۔ لفظ حتیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ سن رشد تک پہنچنے سے پہلے یتیموں کی لگاتار آزمائش ہونی چاہیے یہاں تک کہ



وہ بلوغت کی منزل میں داخل ہو جائیں اور عقلی طور پر کھل طریقے سے اپنے مال کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ضمنی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزمائش سے مراد یتیموں کی تدریجی تربیت ہے۔ یعنی انہیں آزاد نہ چھوڑ دیں یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اس کے بعد مال ان کے حوالے کر دیں۔ بلکہ بلوغت سے پہلے پہلے انہیں مستقل زندگی گزارنے کے لیے عملی تربیت دیں۔

باقی رہا یہ کہ یتیموں کی آزمائش کس طرح کی جائے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ مال ان کو دے دیا جائے تاکہ وہ اس سے تجارت کریں۔ لیکن ان کے اعمال کی نگرانی اس خوبی سے کی جائے کہ ان کے کام میں کوئی نفل واقع نہ ہو۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہ کام بخیر و خوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور لین دین میں دھوکا نہیں کھاتے تو ان کے اموال انہیں دے دیے جائیں یا ان کا تار تعلیم و تربیت کے ذریعے ان کی اس طرح پرورش کی جائے کہ وہ آئندہ زندگی کی باگ ڈور سنبھال لیں۔

۲۔ ” اذابلغوا التکاح “ میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ زندگی کی اس حد میں قدم رکھیں کہ ازدواج کی قدرت رکھتے ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شادی بیاہ کی اہلیت رکھتا ہے، گھر بٹو ذمہ داریوں کو بہتر طور پر انجام دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور ایسا شخص سرمایہ کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بنا بریں ازدواجی زندگی مستقل اقتصادی زندگی کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یتیموں کی ثروت و دولت انہیں واپس کر دی جائے تاکہ جب وہ جسمانی طور پر بالغ ہو جائیں اور انہیں مال کی بہت زیادہ ضرورت ہو تو اس کے ساتھ ان کی سوچ میں بھی پختگی آجائے جس سے وہ اپنے مال کی بخوبی حفاظت کر سکیں۔

۳۔ ” النستہ منہم رمشدا “ یہ اس طرف اشارہ ہے۔ کہ ان کا رشد (سوجھ بوجھ) پوری طرح واضح ہو۔ کیونکہ ” النستہ “ مادہ ” ایناس “ سے ہے۔ جس کے معنی مشاہدہ کرنے اور دیکھنے کے ہیں اور یہ مادہ مادۃ انسان سے ہے جس کے ایک معنی آنکھ کی پتلی کے بھی ہیں۔ حقیقت میں مشاہدہ اور دیکھنے کے وقت انسان یعنی آنکھ کی پتلی سے مدد لی جاتی ہے۔ اسی لیے مشاہدہ کرنے کو ایناس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ولا تأکلوا اسرافاً و بدارا ان یکبروا۔

اس کے بعد پھر سرپرستوں کو تاکید کر رہا ہے کہ کسی طرح سے بھی یتیموں کے مال میں خیانت اور بے ایمانی نہ کریں اور ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ان کا سرمایہ ضائع نہ کریں۔

ومن کان غنیا فلیستعفف ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف

یعنی اگر یتیموں کے سرپرست صاحب حیثیت اور مالدار ہیں تو پھر کسی طریقے سے بھی ان کے مال سے فائدہ نہ اٹھائیں اور اگر فقیر و نادار ہیں تو صرف ان ذمہ داریوں کے بدلے جو انہوں نے یتیم کے مال کی حفاظت کے لیے اٹھائیں ہیں عدل و انصاف کرتے ہوئے ان کے مال میں سے اپنی کارکردگی کے مطابق لے سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں کئی روایتیں بھی ہیں جنہوں نے اس آیت کے مضمون کی وضاحت کی ہے۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں۔





ان میں سے ایک روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

فَذَلِكَ رَجُلٌ يَجْبَسُ نَفْسَهُ عَنِ الْمَعِيشَةِ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَأْكُلَ بِالْمَعْرُوفِ إِذَا كَانَ يَصْلِحُ لَهُمْ

فَإِنْ كَانَ الْعَمَالُ قَلِيلًا فَلَا يَأْكُلُ مِنْهُ شَيْئًا -

اس سے تو وہ شخص مراد ہے جس کو یتیم کے مال کی حفاظت اپنا مستقبل سنوارنے سے روک دے تو وہ اس صورت میں یتیم کے مال سے مناسب انداز سے کے مطابق لے سکتا ہے اور یہی صورت میں ہے جبکہ یتیم کے لیے اس میں فائدہ ہو اور اگر یتیم کا مال کم ہو (اور اس کی سرپرستی میں زیادہ وقت بھی صرف نہ ہوتا ہو) تو اس حالت میں یتیم کے مال سے ذرہ بھر بھی نہ لے۔

فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهَدُوا عَلَيْهِمْ -

آخری حکم جو یتیموں کے سرپرستوں کے متعلق اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنا چاہو تو گواہ بنا لو تاکہ اتہام، نزع اور کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔  
وَكُنْ بِالنِّسْبَةِ حَسِيْبًا -

البتہ یہ جان لو کہ حقیقی حساب کرنے والا تو خداوند عالم ہی ہے اور ہر چیز سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ تمہارا حساب کتاب اس (خدا) کے ہاں واضح ہو کیونکہ خدا وہ ہے کہ اگر تم سے کوئی ایسی بے ایمانی ہوئی ہوگی جو گواہوں کی نظروں سے بھی اوجھل ہو تو وہ اس کا حساب کر لے گا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ  
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرًا  
نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ○

ترجمہ

مردوں کے لیے اس میں سے جو کچھ ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں حصہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی جو ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں حصہ ہے۔ چاہے وہ مال کم ہو کہ زیادہ یہ حصہ مقرر اور لازمی ہے۔

شان نزول

زمانہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ (مشرک) صرف مردوں کو وارث سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص مسلح ہو کر



لڑنے اور اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کبھی کبھی ڈاکر ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا اسے ترک نہیں مل سکتا۔ اسی وجہ سے وہ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے اور میت کا مال بہت دور کے مردوں میں بانٹ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک انصاری جس کا نام اوس بن ثابت تھا فوت ہو گیا اور اپنے بعد چھوٹی چھوٹی بچیاں اور بچے چھوڑ گیا۔ اس کے چچا زاد بھائی جن کے نام خالد اور ارفطہ تھے وہ آئے۔ انہوں نے اس کا مال آپس میں بانٹ لیا اور اس کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کو کچھ بھی نہ دیا تو اس کی بیوی نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں شکایت کی اس وقت تک اس سلسلے میں اسلام میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا۔ چنانچہ حضرت رسول اکرم نے ان دونوں کو بلایا کہ وہ اس مال میں بالکل چھینا چھٹی نہ کریں اور اسے پہلے طبقے کے پس ماندگان یعنی اولاد اور اس کی بیوی کے سپرد کر دیں۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان اس کی تقسیم کا طریقہ آیات آئندہ میں واضح ہوا۔

تفسیر

## عورت کی حفاظت کے لیے ایک اور قدم

حقیقت میں یہ آیت غلط عادتوں اور رسموں کے خلاف ایک اقدام ہے کیونکہ وہ عورتوں اور بچوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیتے تھے۔ اس لیے یہ آیت ان بحثوں کی تکمیل کرتی ہے جو آیات گذشتہ میں ہوئی ہیں۔ کیونکہ عرب اپنی غلط اور ظالمانہ رسموں کی وجہ سے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو میراث کے حق سے محروم کر دیتے تھے۔ آیت نے اس باطل قانون کو غلط قرار دیا اور فرمایا کہ مرد اس مال سے جو مال باپ اور رشتہ دار چھوڑ جاتے ہیں حصہ رکھتے ہیں اور عورتیں بھی۔ چاہے وہ کم ہو کہ زیادہ۔ اس وجہ سے کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے کا حصہ ہٹ کر جائے۔

للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقرابون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والاقرابون مما قل منداو اكثر

اس کے بعد آیت کے آخر میں اس مقصد کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ تعین شدہ حصہ ہے اور اس کا ادا کرنا واجب ہے تاکہ اس بحث میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے (نصیباً مفروضاً)۔

ضمناً جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ آیت مندرجہ بالا تمام صورتوں کے لیے عام حکم کا ذکر کر رہی ہے۔ لہذا اس وجہ سے جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر انبیاء اور مسلمانین کوئی مال و دولت وغیرہ چھوڑ جائیں تو وہ میراث کے طور پر ان کے وارثوں کو نہیں ملتی، یہ آیت مذکورہ کے خلاف ہے۔ ہاں اس سے پیغمبر کا ذاتی مال مراد ہے ورنہ بیت المال جو تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے وہ بیت المال کے قانون کے مطابق اپنے مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔ اسی طرح اس آیت کے عمومی پہلو اور دوسری آیتوں سے جو بعد میں میراث کے بارے میں آئیں گی واضح ہوتا ہے کہ "نصیب" کا قائل ہونا یعنی بعض حالات میں مال کا پدری رشتہ داروں کے ساتھ مخصوص ہونا جیسا کہ علمائے اہل سنت قائل ہیں، وہ بھی تعلیمات قرآن کے خلاف ہے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض موقعوں پر عورتیں میراث سے



محروم رہ جاتی ہیں۔ جس کی اسلام آیت مندرجہ بالا اور اسی طرح کی دوسری آیات کی روشنی میں نفی کرتا ہے۔ (غور فرمائیے گا)۔

۸۔ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَأَرْزُقُوهُمْ مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝

ترجمہ

۸ اگر میراث کی تقسیم کے وقت رشتہ دار (اور اس طبقہ کے لوگ جن کا میراث سے کوئی تعلق نہیں ہے) اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس مال میں سے کچھ تھوڑا بہت انہیں بھی دے دو اور ان سے اچھے طریقے سے بات کرو۔

تفسیر

ایک اخلاقی حکم

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَأَرْزُقُوهُمْ مِّنْهُ .

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ آیت قانون تقسیم وراثت کے بعد نازل ہوئی ہے کیونکہ یہ بتاتی ہے کہ جب تقسیم میراث کی مجلس میں رشتہ دار، یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس میں سے کچھ نہ کچھ انہیں بھی دے دو۔ بنا بریں اس آیت کا مفہوم ایک مستحب اور اخلاقی حکم ہے ان طبقات کے بارے میں جو زیادہ نزدیک ہی ہوتے ہوئے بھی میراث سے محروم ہیں۔ آیت کہتی ہے: اگر تقسیم میراث کی مجلس میں کچھ دوسرے یا تیسرے درجے کے رشتہ دار اور اسی طرح بعض یتیم اور مسکین ہوں تو کچھ نہ کچھ مال انہیں بھی دے دو۔

اس طریقے سے حسد اور کینہ کا احساس جو میراث سے محرومی کی وجہ سے ممکن ہے ان کے دل میں موجزن ہو دور کر دو۔ اور اس ذریعے سے انسانی رشتے کے پیوند کو مستحکم کر دو۔

اگرچہ لفظ ”يَتَامَىٰ“ اور ”مَسْكِينُ“ مطلق کے طور پر استعمال کیا گیا ہے لیکن ظاہراً اس سے مراد کنبہ اور فاندان کے یتیم و مسکین ہیں کیونکہ قانون میراث کے مطابق قریب ترین طبقات (رشتہ داروں) کے ہوتے ہوئے دور تر طبقات میراث لینے سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ اس طرح کے اجتماع میں موجود ہوں تو مناسب ہے کہ عمدہ ہدیہ (جس کی مقدار کا مقرر کرنا صرف وارثوں کے ارادے سے وابستہ ہے جو بڑے وارثوں کے مال میں سے





ہوگی، انہیں دیا جائے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں یتیموں اور سیکینوں سے مراد ہر قسم کے یتیم اور ضرورت مند ہیں، چاہے وہ میت کے رشتہ دار ہوں یا ان کے علاوہ غیر۔ لیکن یہ احتمال بعید و کھائی دیتا ہے کیونکہ یگانہ اور غیر اس قسم کے خاندانی اجتماع میں نہیں آسکتے۔

بعض مفسرین یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں کہ یہ آیت ایک واجب حکم بیان کر رہی ہے نہ کہ مستحب لیکن یہ بھی بعید ہے کیونکہ اگر واجب حق ہوتا تو ضروری تھا کہ اس کی مقدار اور حدود کا تعین کیا جاتا، حالانکہ یہاں یہ اختیار حقیقی وارثوں کو دیا گیا ہے۔

وَقُولُوا لِهٰمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا

آیت کے آخر میں یہ حکم ہے کہ ان میراث سے محروم رہنے والوں سے میٹھی زبان اور شائستہ طریقے سے گفتگو کرو۔ یعنی مادی امداد کے علاوہ اپنے اخلاقی سرمائے سے بھی ان کی محبت حاصل کرو تاکہ ان کے دل میں کسی قسم کی تکلیف نہ رہنے پائے اور یہ حکم مندرجہ بالا حکم کے مستحب ہونے کی دوسری دلیل ہے۔

جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے یہ مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ آیت مندرجہ بالا سرمایہ اور میراث کو متعین کرنے والی آیات کی وجہ سے ضائع ہو گئی ہے کیونکہ ان آیتوں اور اس آیت کے درمیان کسی قسم کا بالکل تضاد نہیں ہے۔

۹- وَلِيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكَوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ضِعْفًا خَافُوا عَلَيْهِمْ  
فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ○

ترجمہ

۹ جو لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے بعد نابالغ اولاد چھوڑ جائیں گے تو اس کا آنے والے دور میں کیا حشر ہوگا، انہیں چاہیے کہ وہ یتیموں پر ظلم کرنے سے ڈریں اور خدا کی مخالفت سے بچیں اور یتیموں سے محبت اور نرمی سے گفتگو کریں۔

تفسیر

یتیموں پر لطف و کرم کی بارش

وَلِيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكَوْا

قرآن یتیموں کی حالتِ نازک کے بارے میں لوگوں کے جذباتِ کرم ابھارنے کے لیے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے کبھی کبھی لوگ غافل ہو جاتے ہیں اور وہ یہ کہ تم عام یتیموں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم چاہتے ہو کہ کل لوگ تمہارے یتیموں کے ساتھ کریں۔



اپنے بے یار و مددگار اولاد اور لاوارث بچوں کی بری حالت پیش نظر رکھو جبکہ وہ ایک ظالم اور بے ایمان شخص کی سرپرستی میں ہوں، جو زمانہ کے جذبات و احساسات پر نظر کرے اور زمانہ کے مال میں عدالت کا خیال رکھے۔ تو یہ دردناک منظر تمہارے لیے کتنا تکلیف دہ ہوگا اور تم اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے کتنے فکر مند ہو گے۔ اسی طرح دوسرے کی اولاد اور یتیموں کے لیے فکر کرو۔ ان کی تکلیف کا احساس کرو۔ اس بنا پر آیت کا مطلب کچھ یوں ہوگا: وہ لوگ جو اپنی اولاد کی آئندہ زندگی کے متعلق حیران و پریشان ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ یتیموں سے خیانت کرنے اور انہیں ستانے سے پرہیز کریں۔

اجتماعی مسئلے اصولی طور پر ہمیشہ ایک سنت کی شکل میں آج سے کل اور کل سے آئندہ زمانے تک اثر کرتے اور پھیلتے ہیں۔ جو لوگ معاشرے میں کسی ظلم کی بنیاد ڈالتے ہیں، مثلاً یتیموں کو ستانے کی رسم ڈالتے ہیں، دراصل وہ خود اس بات کی دعوت اور عملی نمونہ ہوتے ہیں کہ کل ان کی اولاد کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے۔ اس لیے وہ نہ صرف دوسروں کی اولاد پر مشتمل ستم کرتے ہیں بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی ظلم و ستم کی راہ ہموار کر دیتے ہیں۔

فیتقوا اللہ ولیقولوا قولا سديدا

اب جبکہ یہ حال ہے تو یتیموں کے سرپرستوں کو چاہیے کہ وہ خداوند عالم کے احکام کی مخالفت نہ کریں اور یتیموں کے ساتھ میٹھے بے میں بات کریں اور ان سے شفقت آمیز سلوک کریں تاکہ ان کے باطنی دکھ دور ہو جائیں اور دل کے زخم بھر جائیں۔ اسلام کا یہ بلند پایہ حکم جو مندرجہ بالا جملے میں موجود ہے ایثار کی پرورش کے سلسلے میں ایک نفسیاتی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو نہایت قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ایک ننھے ننھے یتیم کی ضرورت صرف خوراک اور پوشاک تک محدود نہیں بلکہ ہمدردی اور مہربانی سے اس کے احساساتِ قلبی کی تسکین بھی ضروری ہے جو اس کی آئندہ تعمیر و تربیت میں اثر انداز ہوگی کیونکہ یتیم بھی دوسروں کی طرح انسان ہے اور چاہیے کہ اسے اس مہربانی کے برتاؤ سے ایک روحانی غذا ملے اور اس محبت اور پیار سے اسے وہ راحت ملے جو ایک بچے کو ماں باپ کی گود میں ملتی ہے۔ وہ ایک بھیرے بچے کی مانند نہیں ہے کہ صبح کے وقت ریوڑ کے ساتھ چلا جائے اور شام کے وقت واپس آجائے۔ جسمانی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اس کے نفسیاتی میلانات کی بھی خاطر خواہ تعلیم و تربیت کا خیال رکھا جائے ورنہ وہ ایک ظالم، معاشرے کا باطنی، برا اور خطرناک شخص بنے گا۔

## ایک ضروری وضاحت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی سے منقول ہے کہ ایک دن چھٹے امام نے فرمایا: جو شخص کسی پر ظلم کرے خداوند عالم کسی شخص کو اس پر مسلط کر دے گا تاکہ وہ اس پر اور اس کی اولاد پر اسی طرح کا ظلم و ستم کرے۔ صحابی کہتا ہے: میں نے دل ہی دل میں سوچا، یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ ظلم تو باپ کرے اور اس کے بچے کی سزا اولاد بھگتے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی (اس بات کو) بیان کروں، امام عالی مقام نے فرمایا: قرآن فرماتا ہے:

وليعنش الذين لو تركوا من خلفهم ذرية ضعفا خافوا عليهم



جو سوال حدیث کے راوی کے دل میں پیدا ہوا تھا بہت سے لوگ وہی سوال کرتے ہیں کہ خداوند عالم کا ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لینا کس طرح جائز ہے؟ اصولی طور پر ظالم کی اولاد نے کون گناہ کیا ہے کہ وہ اس ظلم و ستم کا شکار ہو؟ اس سوال کا جواب مندرجہ بالا تحریر سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے کے افراد جو کام بھی کرتے ہیں وہ آہستہ آہستہ ایک رسم و رواج کی جڑ اختیار کر لیتے ہیں اور آنے والی نسلیں کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں اس وجہ سے جو لوگ معاشرے میں ظلم و ستم کی بنیاد رکھتے ہیں آخر ایک دن یہ بدعت ان کی اولاد پر بھی اثر انداز ہوگی۔ اصل میں یہ بات ان کے اعمال کے ضمنی اور تکوینی آثار میں سے ہے۔ اگر اُسے خدا کی طرف نسبت دی جائے تو وہ صرف اس بنا پر ہے کہ سب کے سب تکوینی اثرات اور علت و معلول کے خواص اسی سے منسوب ہیں۔ غرض کسی طرح بھی خداوند عالم کی طرف سے کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں ظلم و ستم کی بنیاد رکھی گئی وہ ظالم اور اس کی اولاد کے لیے زنجیر بنا بن گئی۔

۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يٰۤاٰكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظٰلِمًا اِنَّمَا يٰۤاٰكُلُوْنَ فِيْ  
بَطُوْنِهِمْ نٰرًا ۙ وَ سَيَصْلُوْنَ سَعِيْرًا ۝

ترجمہ  
۱۔ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم و ستم سے کھاتے ہیں وہ صرف آگ کھا رہے ہیں اور بہت جلد جلانے والی آگ میں سے  
جلیں گے۔

تفسیر

جہاں سے اعمال کا باطنی چہرہ

ان الذین یا کلون اموال الیتیمی ظلمًا انما یا کلون فی بطونہم ناراً  
ہم اس سورہ کے شروع میں تحریر کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آیتیں ایک صبح و سالم معاشرے کی بنیاد قائم کرنے کے لیے نازل ہوئی  
ہیں۔ اس لیے پہلے پہل جہالت کے زمانے کی رسموں اور مجربانہ غلط کاریوں کو جو بعض نوسلموں کے دلوں میں تھیں دور کر کے ایک صبح و  
سالم معاشرے کے لیے زمین ہموار کرتی ہیں اور یتیم کا مال کھانے سے زیادہ بدتر عمل کونسا ہوگا۔ اسی لیے اس سورت کے شروع میں یتیموں  
کے مال میں بے جا تصرف کرنے کے خلاف سخت قسم کے احکام دکھائی دیتے ہیں، جن میں آیت مذکورہ بالاسب سے زیادہ واضح ہے۔  
یہ آیت بتاتی ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ہیرا پھیری کر کے کھاتے ہیں وہ درحقیقت آگ کھاتے ہیں۔ سارے قرآن میں اس قسم





کی تعبیر صرف ایک مقام پر نظر آتی ہے اور وہ ایسے لوگوں کے متعلق ہے جو حقائق چھپا کر آیاتِ الہی میں رد و بدل کر کے نفع کماتے ہیں۔ ان کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

ان الذین یکتسبون ما انزل اللہ من الكتاب و یشترون بہ ثمنا قلیلا اولئک ما یأکلون فی بطونہم الا النار۔

جو لوگ خداوند عالم کی آیتوں کو چھپاتے ہیں اور ان کے ذریعے معمولی سا فائدہ اٹھاتے ہیں وہ آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے۔ (سورۃ بقرہ آیت ۱۷۴)۔

و سیصلون سعیرا

”سیصلی“ اصل میں صلی (بروزن درو) کے مادے سے آگ میں داخل ہونے اور بھٹنے کے معنی میں ہے اور سعیر کے معنی میں بھرتی ہوئی آگ۔

قرآن اس آیت میں بتاتا ہے کہ اس دنیا میں آگ کھانے کے علاوہ وہ بہت جلد آخرت میں بھی بھرتی ہوئی آگ میں جائیں گے جو انہیں بڑی طرح جلانے لگی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اعمال کا ظاہری چہرے کے علاوہ ایک حقیقی چہرہ بھی ہے، جو اس دنیا میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن یہ باطنی چہرے آخرت میں ظاہر ہو جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل مجسم حالت میں پیش ہوں گے۔

قرآن فرماتا ہے: جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں اگرچہ ان کے عمل کا ظاہری چہرہ رنگین و لذیذ غذاؤں سے فائدہ اٹھاتے دکھائی دیتا ہے لیکن ان غذاؤں کا اصلی چہرہ جلانے والی آگ ہے اور یہی وہ چہرہ ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ حقیقی چہرہ ہمیشہ اس عمل کی ظاہری حالت کے ساتھ خاص مناسبت رکھتا ہے۔ جس طرح یتیم کا مال کھانا اور اس کے حقوق چھیننا، اس کے دل کو جلانا اور اس کی روح کو تڑپانا ہے (اسی طرح) اس عمل کا حقیقی چہرہ جلانے والی آگ ہے۔ اس امر کی طرف (اعمال کے حقیقی چہرے) ان لوگوں کے لیے جو ان حقائق پر ایمان رکھتے ہیں، توجہ دینا غلط کام کرنے سے روکنے کے لیے بہت ہی کارگر ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اپنے ہاتھ سے آگ کے انکار سے اٹھا کر اپنے منہ میں رکھے اور نگل جائے؟ اسی طرح ایماندار لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ یتیم کا مال کھائیں۔ اگر ہم یہ دیکھتے کہ خدا والے گنہگار تصور تک نہیں کرتے تھے تو اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ وہ علم و ایمان کی طاقت اور اخلاقی تعلیم و تربیت کے اثر سے اعمال کے اصلی چہروں کو دیکھتے تھے، اس لیے کبھی بڑا کام کرنے کا خیال تک نہ کرتے تھے۔ جو سکتا ہے کہ ایک نادان اور بے خبر بھولا بھالا بچہ جلانے والی آگ کے انکار سے کی دل خوش کرنے والی روشنی دیکھ کر اس پر ایسا لٹو ہو جائے کہ اسے اپنا تک ہاتھ میں لے لے لیکن ایک سمجھ دار انسان جو آگ کے جلانے کی صفت کو بار بار آزمایا چکا ہے وہ یہ حماقت نہیں کرتا۔ وہ کبھی اس کا تصور بھی نہ کرے گا۔ یتیموں کے مال میں دست درازمی کرنے کے بارے میں بہت زیادہ دل ہلانے والی احادیث و روایات ہیں۔ یہاں تک کہ یتیموں کے مال میں تھوڑی سے تھوڑی زیادتی بھی ان احکام کی روشنی میں قابل گرفت ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقرؑ حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ یہ آگ کی سنز یتیم کا کتنا مال غصب کرنے پر ہے تو آپ نے فرمایا:

دو درہم کے برابر ہے

۱۱۔ یُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلَّذِيْ كَانَ مِنْكُمْ وَلَدًا لِلَّذِيْ لَمْ يَكُنْ لَهٗ وَلَدٌ وَلِلَّذِيْ كَانَتْ اِمْرَاَتُهُ حَيًّا مِّمَّا تَرَكَتْ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِابْنِ بِنْتٍ لِّكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَهٗ وَلَدٌ وَوَرِثَتْهُ اَبَوُهٗ فَلِلْاُمِّهِ النِّصْفُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُ اِخْوَةٌ فَلِلْاُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتهٖ يُوْصِيْ بِهَا اَوْ دِيْنٍ ۚ اَبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

۱۲۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مِمَّا تَرَكَتْ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمْ الرُّبْعُ مِمَّا تَرَكَتْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتهٖ يُوْصِيْنَ بِهَا اَوْ دِيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبْعُ مِمَّا تَرَكَتُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكَتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتهٖ تُوْصَوْنَ بِهَا اَوْ دِيْنٍ ۚ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورِثُ كَلَلَةً اَوْ امْرَاةٌ وَاَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِيْ الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتهٖ يُوْصِيْ بِهَا اَوْ دِيْنٍ ۚ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّتهٖ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝

ما شیخ الحدیث سنن

ترجمہ

۱۱ خدا تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ (میراث میں سے) ایک بیٹے کا دو بیٹیوں کے برابر حصہ ہے اگر تمہاری (دو یا) دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو میراث کی دو تہائی ان کے لیے ہے اور اگر ایک ہو تو اس کے لیے آدھی میراث ہے۔ اور (مرنے والے کے) باپ اور ماں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اگر اس کی اولاد ہو۔ (بصورت دیگر) اگر اس کے اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ اس کی میراث میں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے اور اگر اس کے بھائی موجود ہوں تو اس کی ماں چھٹا حصہ لے گی (اور باقی چھ میں سے پانچ حصے اس کے باپ کے لیے ہیں) یہ سب کچھ اس وصیت پر عمل کر چکنے کے بعد ہے جو مرنے والا کر گیا ہے، قرض ادا کرنے کے بعد۔ تم نہیں جانتے کہ باپ اور ماؤں اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔ یہ خدائی حکم ہے اور وہ دانا اور حکیم ہے۔

۱۲ اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں کی میراث میں سے اولاً آدھا ہے اگر ان کے ہاں اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کی وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد چوتھا حصہ ہے اور تمہاری بیویوں کے لیے تمہاری میراث کا چوتھا حصہ ہے، اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو ان کا تمہاری وصیت کی تکمیل اور قرض کی ادائیگی کے بعد آٹھواں حصہ ہے اور اگر کوئی ایسا شخص ہو کہ کفار (ایک بہن یا ایک بھائی) اس کی میراث لے یا کوئی عورت ہے کہ جس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے (اگر بھائی اور بہنیں مادری ہوں) اور ایک سے زیادہ ہوں تو پھر وہ وصیت کو پورا کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد تیسرے حصے میں برابر برابر شریک ہیں۔ بشرطیکہ (وصیت کے طریقے اور قرض کا اقرار) انہیں نقصان نہ پہنچائے۔ یہ خدا کی سفارش ہے اور وہ جاننے والا اور حکیم ہے۔

شان نزول

صدر اسلام کے مشہور شاعر حسان بن ثابت کا بھائی عبدالرحمن بن ثابت انصاری فوت ہو گیا۔ اس کی ایک بیوی اور پانچ بھائی تھے عبدالرحمن کے بھائیوں نے میراث اپنے درمیان تقسیم کر لی اور اس کی بیوی کو کچھ نہ دیا۔

گذشتہ سورت کا ماضی  
لے تفسیر بہان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔





یہ واقعہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا اور میراث لینے والوں کی شکایت کی گئی۔ اس پر آیات مندرجہ بالا نازل ہوئیں۔ ان میں شوہر اور بیوی کی میراث کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ نیز حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

میں بیمار ہو گیا تھا۔ جب حضور میری عیادت کے لیے تشریف لائے تو میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ نے پانی منگوایا کچھ پانی سے وضو فرمایا، باقی مجھ پر چھڑک دیا تو میں ہوش میں آ گیا۔ میں نے عرض کیا: اے خدا کے رسول! میرے بعد میرے مال کا کیا ہوگا۔ آپ خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں وارثوں کے حصے سمیعین ہو گئے۔

## میراث ایک فطری حق ہے

اس سے پہلے کہ ہم ان آیات کی تفسیر قلم بند کریں چند ایک نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہر ملک میں قانون کا بہت سے لوگ یہ خیال کریں کہ بہتر ہے کہ کسی کی وفات کے بعد اس کے مال کو عام مال کا حصہ قرار دے کر اسے بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ لیکن غور و فکر کرنے کے بعد یہ امر کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ یہ کام بالکل عدالت کے خلاف ہے۔ کیونکہ میراث کا مسئلہ سو فی صد ایک فطری اور منطقی مسئلہ ہے۔ جب مال باپ اپنی بعض جسمانی اور روحانی صفات قانون وراثت کے مطابق اپنی اولاد میں منتقل کرتے ہیں تو پھر ان کے مال کو اس قانون سے کس طرح سستی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جائز مال ہر شخص کی محنت و مشقت اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر وہ جو کوشش کرتا ہے اور طاقت صرف کرتا ہے وہ مال سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

اسی بنا پر ہم ہر شخص کو اس کے ہاتھ کی محنت کا فطری طور پر مالک سمجھتے ہیں اس لیے جب موت کے وقت انسان کا ہاتھ اپنے مال تک نہیں پہنچ سکتا تو عدل کا یہی تقاضا ہے کہ یہ مال ان افراد کے پاس چلا جائے جو مرنے والے کے نزدیک ترین رشتہ دار ہوں حقیقت میں ان اشخاص کا وجود اس کے اپنے وجود کی بقا شمار ہوگا۔

اسی لیے بہت سے لوگ اتنا سرمایہ رکھنے کے باوجود جو ان کی زندگی کے لیے بخوبی کافی ہو سکتا ہے پھر بھی اپنے کاروبار کو بڑھانے کی لگاتار کوشش کرتے رہتے ہیں، ان کا مقصد اپنی اولاد کے مستقبل کی حفاظت کرنا اور اسے روشن کرنا ہے۔ یعنی قانون وراثت ملک کی اقتصادی گاڑی کو زیادہ متحرک اور فعال بنا سکتا ہے۔ اگر ہر شخص کا مال اس کی موت کے بعد اس سے بالکل الگ کر دیا جائے اور اسے عام مال قرار دے دیا جائے تو ممکن ہے کہ اقتصادی سرگرمیاں اور چہل پہل ختم ہو کر رہ جائے۔ اس گفتگو کا شاہد وہ واقعہ ہے جو فرانس میں پیش آیا ہے۔ کہتے ہیں: اب سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ فرانس کی پارلیمنٹ کے نمائندوں نے میراث کے قانون کو لغو قرار دیا۔ اس کی بجائے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کوئی چھوڑ جائے اسے پبلک مال سمجھ کر ضبط کر لیا جائے اور اسے عوام اناس کی ضروریات میں اس طرح خرچ کیا جائے کہ اس شخص سے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی کو کچھ بھی زیادہ ملے لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد اس قانون کے بڑے اقتصادی اثرات ظاہر ہو گئے اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ اس قانون نے ملک کی درآمد اور برآمد پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اس سے اقتصادی سرگرمیوں میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان حالات نے اقتصادیات کے ماہرین کو پریشان کر دیا۔



انہوں نے اس کا بنیادی سبب قانون میراث پر غلط عمل قرار دیا۔ اس لیے اس پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ بنا بریں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قانون میراث حکم شرعی کے علاوہ ایک فطری اور طبعی امر بھی ہے۔ یہ اقتصادی سرگرمیوں کی فعالیت میں ایک گہرا اثر رکھتا ہے۔

## میراث گذشتہ اقوام عالم میں

وراثت کا قانون فطری بنیادوں پر قائم ہے اس لیے وہ گزری ہوئی قوموں میں بھی مختلف شکلوں میں دکھائی دیتا ہے اگرچہ بعض لوگ یہودیوں کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں قانون وراثت کا وجود نہیں تھا لیکن موجودہ تورات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون بڑی تفصیل کے ساتھ سفر اعداء میں موجود ہے۔ اس میں ہے:

اور بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے بیٹا نہ ہو تو اس کی میراث بیٹی کو دے دو اگر بیٹی بھی نہ ہو تو اس کا ورثہ اس کے بھائیوں کو دے دو اگر بھائی بھی نہ ہو تو اس کی میراث اس کے باپ کے بھائیوں کو دے دو اگر اس کے باپ کا کوئی بھائی نہیں ہے تو اس کے پس ماندگان میں سے جو بھی اس کا زیادہ نزدیکی رشتہ دار ہے اُسے ترکہ دے دو۔ تاکہ وہ اس کا وارث بن جائے اور یہ امر بنی اسرائیل کے لیے واجب ہے۔ اس لیے کہ خداوند عالم نے موسیٰ کو یہ حکم دیا ہے یہ

مندرجہ بالا فقرہوں سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل میں میراث کا تعلق صرف اہل نسب ہی سے تھا کیونکہ اس میں شروع سے آخر تک بیوی اور شوہر کا نام نہیں ہے۔

دین یسعی میں اس قانون کو معتبر سمجھا جانے کا کیونکہ موجودہ انجیل میں منقول ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا:-

میں اس لیے نہیں آیا کہ تورات کے احکامات میں کوئی رد و بدل کروں۔

اسی لیے ان کی موجودہ کتب و رسائل مذہبی میں میراث کی کوئی بحث نہیں پائی جاتی۔ صرف چند مقامات پر لفظ وارث کے مشتقات پر گفتگو کی گئی ہے جو سب کی سب معنوی یا اخروی میراث کے بارے میں صحیح ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں تین طریقوں سے میراث بنتی تھی:

۱۔ نسب اس سے مراد ان کے ہاں صرف بیٹے اور مرد تھے۔ بچے اور عورتیں ترکہ سے قطعی طور پر محروم تھیں۔

۲۔ متبنی۔ یعنی ایسا بیٹا جسے ایک خاندان نے دھسکا دیا ہو اور دوسرے نے اُسے اپنی طرف منسوب کر لیا ہو یہ دراصل مزبول بنا ہوتا تھا۔ اس صورت میں اس مزبولے بیٹے اور اس کے مزبولے باپ کے درمیان قانون وراثت جاری ہو جاتا تھا۔

۳۔ عہد و پیمان۔ دو آدمی آپس میں معاہدہ کر لیتے تھے کہ وہ زندگی بھر ایک دوسرے کا دفاع کریں گے اور مرنے کے بعد ایک دوسرے کے رازدار اور وارث رہیں گے۔

اسلام نے میراث کے فطری اور طبعی قانون کو ان خس و خفاشک سے پاک کر دیا اور ظالمانہ تفریقات جو ایک طرف عورت مرد



اور دوسری طرف چھوٹے بڑے کے درمیان متصل، انہیں دور کر دیا۔

اسلام نے تین چیزوں کو میراث کا سرچشمہ قرار دیا۔ اسلام سے پہلے یوں نہ تھا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:

۱۔ نسب اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ یعنی ہر قسم کا تعلق جو تولد کے ذریعے دو اشخاص کے درمیان مختلف سطحوں میں ظاہر ہو۔ چاہے وہ مرد و عورت ہوں چاہے چھوٹے بڑے۔

۲۔ سبب یعنی ایسے روابط جو شادی کے ذریعے مختلف افراد کے درمیان پیدا ہو جائیں۔

۳۔ دلاء اس سے مراد ایسے روابط ہیں جو نسبی یا سببی رشتہ داری کے علاوہ دو اشخاص میں پیدا ہوں مثلاً عتق یعنی اگر کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کر دیتا ہے اور موت کے بعد غلام اپنا کوئی نسبی یا سببی رشتہ دار نہیں چھوڑتا تو اس کا مال آزاد کرنے والے کو مل جائے گا اور یہ خود غلام آزاد کرنے کی ایک جزا اور ترغیب ہے۔

اسی طرح دلاء ضمنان جریرہ ہے یہ ایک خاص معاہدہ تھا جو دو افراد کے درمیان ان کی خواہش اور ارادے سے قائم ہو جاتا تھا اور طرفین یہ امر اپنے ذمہ لے لیتے تھے کہ وہ مختلف مواقع پر ایک دوسرے کا دفاع کریں گے اور مرنے کے بعد جبکہ ان کے درمیان کسی قسم کی نسبی یا سببی رشتہ داری بھی نہ ہو، ایک دوسرے کی میراث لیں گے۔

اسی طرح دلاء امامت ہے یعنی اگر کوئی شخص دنیا سے چل بسے اور اپنے بعد کسی قسم کا نسبی اور سببی رشتہ دار نہ چھوڑے تو اس کی میراث امام کو یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے بیت المال کو ملے گی۔ البتہ مندرجہ بالا طبقات کے لیے شرطیں اور احکام ہیں جو کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

تفسیر

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حِظِّ الْاُنثٰى

اس آیت میں وارثوں کے پہلے طبقے (اولاد اور مال باپ) کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے۔ واضح ہے کہ ربط و تعلق کی رو سے کوئی رشتہ اولاد، ماں اور باپ سے زیادہ قریبی نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن نے انہیں میراث کے دیگر طبقات پر مقدم رکھا ہے۔ پہلی آیت میں فرماتا ہے، خدا تم سے تمہاری اولاد کے بارے میں سفارش اور وصیت کرتا ہے کہ بیٹوں کو بیٹیوں کی نسبت دو گنا حصہ قابل تو جہ بات یہ ہے کہ ترتیب آیت اور طرز بیان کے لحاظ سے بیٹیوں کی میراث کو جو قرار دیا گیا ہے اور بیٹوں کے ورثے کا شاخ۔ کیونکہ (بیٹیوں کا حصہ مقرر) کر کے بیٹوں کا حصہ مقرر کیا گیا ہے کہ بیٹے بیٹیوں سے دو گنا حصہ لیں گے اور یہ بیٹیوں کو میراث دینے کے لیے ایک طرح کی تاکید ہے اور زمانہ جاہلیت کی بدعتوں کا مقابلہ ہے کیونکہ وہ بیٹی کو بالکل محروم کر دیتے تھے۔ باقی رہا ان وارثوں کی میراث کے تفاوت و فرق کا فلسفہ تو وہ عنقریب بیان کیا جائے گا۔

فان كن نساء فوق اثنتين فلهن ثلث ما ترك

اگر مرنے والے کی اولاد صرف دو لڑکیاں یا ان سے زیادہ ہوں تو انہیں مال کا دو تہائی (۲/۳) ملے گا۔

وان كانت واحدة فلهما النصف





لیکن اگر ایک بیٹی جو تو اسے مال کا نصف ملے گا۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں قرآن فرماتا ہے: ”فوق اثنتین“ یعنی اگر دو بیٹیوں سے زیادہ ہوں تو دو تہائی مال ان کا ہے اس بنا پر یہ آیت دو لڑکیوں کے حکم سے خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے کیونکہ اس نے صرف ایک یا چند بیٹیوں کا حکم بیان کیا ہے۔

اس سوال کا جواب آیت کے پہلے حصے پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

لذکر مثل حظ الانثیین

یعنی۔ لڑکا لڑکی سے دو گنا حصہ لے گا۔

اگر کسی مرنے والے کے پس ماندگان میں فقط ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہو تو بیٹی کا حصہ ایک تہائی اور بیٹے کا دو تہائی ہوتا ہے۔ بنا بریں اس کے مطابق دو بیٹیوں کا حصہ دو تہائی ہو گا۔ شاید اسی وجہ سے بعد میں آنے والے جملے میں دو بیٹیوں کے حصہ کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ چند بیٹیوں کے حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دو تہائی سے نہیں بڑھتا (غور فرمائیے گا)۔

نیز سورہ نسا کی آخری آیت پر غور و فکر کرنے سے بھی یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کیونکہ اس آیت میں ایک بہن کا حصہ (ایک بیٹی کی طرح) ادا قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں دو تہائی مال ملے گا۔ اس حکم سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ دو بیٹیوں کا حصہ بھی دو تہائی ہے۔

اس کے علاوہ یہ تعبیر عربی ادب میں دکھائی دیتی ہے، وہ کبھی کہتے ہیں ”فوق اثنتین“ بس سے مراد ہوتا ہے (اثنتان وما فوق) یعنی دو یا دو سے زیادہ۔

ان تمام امور کو چھوڑتے ہوئے حکم مذکور فقہ اسلامی اور منابع حدیث کے لحاظ سے تسلیم شدہ ہے فرض کیجئے کہ مندرجہ بالا جملے میں شک و شبہ کی گنجائش ہے تو وہ مصادر حدیث پر ایک نگاہ ڈالنے سے دور ہو جاتا ہے۔

## مرد کی میراث عورت سے دو گنی کیوں ہے؟

بظاہر تو مرد کا ورثہ عورت سے دو چند ہے لیکن غور کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ایک لحاظ سے عورت کی میراث مرد سے دو گنی ہے اور یہ اس حمایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہے جو اسلام نے عورت کے حقوق کی فرمائی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مردوں کی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا جائے تو مرد کی آمدنی عملی طور پر عورتوں پر خرچ ہوتی ہے۔ جبکہ عورت کے ذمہ ایسی کوئی چیز نہیں۔ مرد کو پاپیہ کہ وہ اپنی بیوی کی زندگی کے لوازمات اس کی ضرورت کے مطابق مکان، لباس، خوراک اور دیگر ضروریات زندگی ہوتا کرے۔ چھوٹے بچوں کی زندگی کی ضروریات بھی مرد کے ذمہ ہیں۔ جبکہ عورتوں کے ذمہ یہ لوازم نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی ضروریات زندگی بھی ان کے ذمہ نہیں ہیں۔ اس وجہ سے ایک عورت یہ کر سکتی ہے کہ وہ اپنی تمام میراث کو اپنی بچت کے طور



پر رکھے جبکہ مرد اپنے اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کے لیے مجبور ہے اس کا عملی نتیجہ یہی نکلے گا کہ مرد کی آمدنی عورت پر اور آدمی اپنے پر خرچ ہوگی جبکہ عورت کا حصہ جوں کا توں باقی رہ جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل مثال کی طرف توجہ فرمائیے:

فرض کیجئے کہ دنیا کی کل دولت ۳۰ ارب روپے ہے۔ جو میراث کی رو سے عورتوں، مردوں، بیٹیوں اور بیٹوں میں بانٹی جاتا ہے اب دنیا کے تمام مردوں کی آمدنی کا عورتوں کی آمدنی کے ساتھ بلحاظ میراث حساب کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس رقم میں سے ۲۰ ارب مردوں کے ہیں اور دس ارب عورتوں کے۔ جب معمول کے مطابق عورتوں کی شادی ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے لوازمات زندگی کا تمام تر بوجھ مردوں پر ہوگا۔ اس طرح عورتیں اپنے حصہ کا دس ارب روپیہ بچا سکتی ہیں کیونکہ وہ عملی طور پر مردوں کے ۲۰ ارب روپے میں شریک ہیں وہ ان پر اور ان کی اولاد پر خرچ ہوگا۔

اس طرح مردوں کا آدھا حصہ (دس ارب روپے) عورتوں پر خرچ ہوگا۔ اب اگر اس کے ساتھ اس دس ارب روپے کو بھی جمع کیا جائے جو انہوں نے بچایا ہے تو یوں یہ رقم مجموعی طور پر ۲۰ ارب روپے بنتی ہے۔ جو پوری دنیا کے سرمایہ کا دو تہائی ہے جبکہ مرد عملی طور پر ۱۰ ارب روپے سے زیادہ اپنے پر خرچ نہیں کر سکتے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خرچ اور فائدہ اٹھانے کے لحاظ سے عورتوں کا اصلی حصہ مردوں کے حقیقی حصہ سے دو گنا ہے یہ فرق اس لیے ہے کہ عموماً عورتوں میں روپیہ کمانے کی صلاحیت کم ہے۔ یہ اسلام کی طرف سے عورتوں کی منطقی اور عادلانہ حمایت ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر عورتوں کا حصہ آدھا ہے۔ مگر ان کا حقیقی حصہ مردوں سے زیادہ مقرر کیا گیا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ آثار اسلامی کی طرف رجوع کرنے سے ہمیں اس نکتے کا سراغ ملتا ہے کہ مندرجہ بالا سوال اسلام کے شروع میں ہی لوگوں کے ذہن میں تھا اور وہ کبھی کبھار اس سلسلے میں رہبران اسلام سے سوالات بھی کر لیا کرتے تھے۔ جو جوابات ان بزرگان اسلام (ائمہ اہل بیت) نے اس سوال کے دینے میں، غالباً وہ سب ایک ہی مضمون کے ہیں اور وہ یہ کہ خداوند عالم نے زندگی کے اخراجات اور حق مہر مردوں کے ذمہ لگایا ہے۔ اس بنا پر ان کا حصہ بھی زیادہ مقرر کیا گیا ہے۔

کتاب "معانی الاخبار" میں حضرت علی بن موسیٰ رضا سے منقول ہے کہ آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا:

یہ جو میراث میں عورتوں کا حصہ مردوں کی نسبت آدھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عورت کی شادی ہوتی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ لیتی ہے اور مرد مجبور ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ دے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے اخراجات مردوں کے کندھے پر ہیں۔ جبکہ عورت مرد کے اخراجات اور اپنے اخراجات سے بے فکر ہے۔

## مال باپ کی میراث

باقی رہا مال باپ کا ورثہ جو پہلے طبقہ کا حصہ ہیں اور ورثہ کے لحاظ سے اولاد کے برابر ہیں (یعنی طبقہ اول سے تعلق رکھتے ہیں)۔ ان کی میراث وہی ہے جو مندرجہ بالا آیت میں آپکی ہے۔ اس کی تین حالتیں ہیں:

پہلی یہ کمرنے والے کی ایک یا کئی بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو اس صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا  
(ولابویہ لكل واحد منهما السدس مما ترک ان کان له ولد۔)

دوسری یہ کمرنے والے کی کوئی اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں۔ اس صورت میں ماں کا حصہ کل مال کا ایک تہائی ہے (فان لم یکن له ولا وورثہ ابواہ فلامۃ الثلث)۔ یہاں باپ کے حصہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا حصہ واضح ہے یعنی دو تہائی (بہ ما لبتہ اگر کمرنے والے کی بیوی ہو یا کمرنے والی کا شوہر موجود ہو تو اس صورت میں بیوی یا شوہر کا حصہ باپ کے حصہ میں سے منہا ہو جائے گا۔ یعنی اس صورت حال میں باپ کا حصہ دوسری شق میں تبدیل ہو جائے گا۔  
تیسری یہ ہے کہ صرف ماں باپ وارث ہوں۔ اولاد نہ ہو۔ لیکن کمرنے والے کے پدری مادری (سگے بھائی) یا صرف پدری (سوتیلے) بھائی موجود ہوں تو اس صورت میں ماں کا حصہ ایک تہائی کی بجائے چھٹا (¼) ہو جائے گا۔ حقیقت میں اگرچہ بھائی میراث نہیں لیں گے لیکن اس صورت میں ماں اضافی مقدار نہ لے سکے گی۔ اسی بنا پر انہیں ”ماجب“ کہتے ہیں (فان کان له اخوة فلامۃ السدس)۔

اس حکم کا فلسفہ واضح ہے کئی بھائیوں کا ہونا باپ کے زندگی کے بوجھ کو بڑھاتا ہے کیونکہ باپ ان کے اخراجات کا کفیل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں بلکہ جوان ہونے کے بعد بھی ان کے کئی اخراجات باپ کو اٹھانا پڑتے ہیں۔ اسی لیے وہ بھائی، ماں کے حصے کی کمی کا سبب بنتے ہیں۔ اگر وہ ماں باپ یا صرف باپ کی طرف سے بھائی ہوں تو وہ بھائی جو صرف ماں کی طرف سے ہیں ان کی کسی قسم کی ذمہ داری باپ پر نہیں، وہ ”ماجب“ نہیں بنتے۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے اس آیت میں بھائیوں کا ذکر کرتے ہوئے جمع کا میثدا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے  
فان کان له اخوة

اگر اس شخص (متوفی) کے کئی بھائی ہوں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عربی میں جمع کم از کم تین کے لیے ہے۔ جبکہ تمام فقہائے اسلام کا یہ طے شدہ نظریہ ہے کہ دو بھائی بھی واجب ہیں اور ان کی وراثت سے ماں کا حصہ ¼ کی بجائے ¼ ہو جاتا ہے۔  
اس سوال کا جواب قرآن کی دوسری آیات کی طرف متوجہ ہونے سے واضح ہو جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام مقامات پر جمع کا لفظ تین یا تین سے زیادہ افراد کے لیے بولا جائے بلکہ کئی مقامات پر یہ لفظ دو افراد کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً سورہ انبیاء کی آیت ۸ میں،

وکانا للحکمہ شاہدین

یہ آیت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے فیصلوں سے تعلق رکھتی ہے اور قرآن نے ان دونوں بزرگوں کے لیے ضمیر جمع (ہم) استعمال کی ہے یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات جمع کا لفظ دو افراد کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ بات شاید اور قرینہ کی محتاج ہے۔ زیر بحث آیت کے اسی مفہوم پر مسلمانوں کا اتفاق اور اجماع ہے اور رہبران اسلام کی طرف سے بھی اس پر دلیل موجود





ہے۔ اس مسئلہ میں (ابن عباس کے سوا) سب علماء اسلام پاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی کا اتفاق ہے کہ دو بھائی بھی اس آیت کے حکم میں شامل ہیں۔

## میراث، وصیت اور قرض کے بعد ہے

من بعد وصیة یوصی بہا و دین

اس کے بعد قرآن فرماتا ہے کہ وارث مال کو اپنے درمیان اس وقت تقسیم کر سکتے ہیں جبکہ مرنے والے نے وصیت نہ کی ہو اور نہ کسی کا قرض اس کے ذمہ ہو۔ اگر وہ وصیت کر گیا ہے یا وہ کسی کا مقروض ہے تو پہلے وصیت کی تعمیل اور قرض کی ادائیگی ضروری ہے (البتہ جیسا کہ باب وصیت میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ وصیت کرنے والا اپنے مال کے تہائی حصہ تک کی وصیت کر سکتا ہے اگر وہ اس سے زیادہ مال کی وصیت کرے تو درست نہیں ہے ہاں البتہ وارث اجازت دے دیں تو صحیح ہے)۔

أبائکم وابتائکم لا تدرؤن ایہم اقرب لکم نفعا۔

خداوند عالم اس آیت میں فرماتا ہے: تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے باپ دادا اور اولاد میں سے تمہارا یہ کون زیادہ مفید ہے یعنی قانون میراث نوع بشر کے حقیقی اور اصلی مصالح اور مفادات کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے اور ان مصلحتوں کی تشویش خدا ہی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ انسان ہر مقام پر اپنی بہتری کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کریں کہ ماں باپ انسان کی بہت سی ضروریات کے ذمہ دار تھے ہیں اس لیے انہیں میراث میں اولاد پر مقدم ہونا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کے برعکس سوچیں۔ ان حالات میں اگر میراث کا قانون لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو اس میں طرح طرح کے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے لیکن خداوند عالم جو حقائق کو جس طرح کر وہ ہیں بخوبی جانتا ہے۔ اس نے قانون میراث کے مثبت نظام کو جس میں نوع بشر کی بھلائی ہے مقرر فرمایا۔

فریضۃ من اللہ ان اللہ کان علیہما حکیمًا

یہ ایک ایسا قانون ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے واجب ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔  
یہ جلد گذشتہ مطالب کی تاکید کے لیے آیا ہے تاکہ لوگ میراث سے مربوط قوانین کے بارے میں کوئی اعتراض نہ کر سکیں۔

## میراث میں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے حصہ

ولکم نصف ما ترک ازواجکم ان لم ینکن لہن ولد

گذشتہ آیت میں اولاد اور ماں باپ کے حصہ کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ یہاں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے میراث لینے کی کیفیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ آیت کہتی ہے مرد صاحب اولاد نہ ہو تو اپنی بیوی کے مال میں سے آدھی میراث لے گا لیکن اگر اس کے ایک یا کئی بیٹے ہوں (پاہے وہ کسی اور شوہر کے کیوں نہ ہوں) تو پھر شوہر مال کا ایک چوتھائی (۱/۴) حصہ لے گا۔

فان کان لہن ولد فلكم الربع مما ترکن

البتہ یہ تقسیم بھی بیوی کا قرض ادا کرنے اور اس کی مالی وصیتوں کو پورا کرنے کے بعد ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:



من بعد وصیة یوصین بها او دین

ابھی بیویوں کی میراث اپنے شوہر کے مال سے جبکہ شوہر کی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ مال کا چوتھا حصہ ہے۔ بیبا کہ ارشاد ہوتا ہے:  
ولهن الربع مما ترکتم ان لکم ولد لیکن اگر شوہر کی اولاد ہو (پاپا ہے یا اولاد کسی اور بیوی سے ہو) تو پھر عورتوں کا  
اٹھواں حصہ ہو گا (ان کا) لکم ولد فلهن الثمن مما ترکتم۔

تیسرا میراث بھی اپنی تقسیم کی طرح شوہر کے قرضوں کی ادائیگی اور مالی وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی (من بعد وصیة تو صون بها او دین)۔  
قابل توجہ امر یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کا حصہ اولاد کی موجودگی میں آدھا ہے۔ یہ اولاد کے حقوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہے۔  
اس بات کا سبب کہ شوہر کا حصہ عورت سے دوگن قرار دیا گیا ہے، وہی ہے جو گذشتہ بحث میں تفصیل کے ساتھ بیٹے اور بیٹی کی  
میراث کے بارے میں تحریر کیا جا چکا ہے۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ جو حصہ عورتوں کے لیے مقرر ہوا ہے (پاپا ہے وہ چوتھا ہوا اٹھواں) وہ ایک بیوی سے  
مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر مرد کی کئی بیویاں ہوں تو بھی مذکورہ حصہ ان سب کے درمیان مساوی تقسیم ہوگا۔ آیہ مذکورہ بالا کا ظہور یہی ہے۔

## بھائیوں اور بہنوں کی میراث

وان کان رجل یورث کلالہ

اس آیت میں ہیں ایک نیا لفظ ملا ہے جو قرآن میں صرف دو مقام پر آیا ہے۔ ایک زیر بحث آیت میں اور دوسرے سورۃ  
سائدہ کی آخری آیت میں اور وہ ہے لفظ "کلالہ"۔ لغات کی کتابیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ "کلالہ" اصل میں مصدری معنی رکھتا  
ہے اور "کوال" کے معنی میں ہے۔ جس کا مطلب ہے "قوت و توانائی کا ختم ہونا"۔

لیکن یہ لفظ بعد میں ان بہن بھائیوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو متوفی کی میراث لیتے ہیں شاید اس کی وجہ اور معنا بہت  
یہ ہے کہ بھائی اور بہنیں میراث کے دوسرے طبقے کا جزو ہیں اور صرف مال باپ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں وارث ہوتے ہیں  
اور ایسا شخص جس کے مال باپ اور اولاد نہ ہو یقیناً رنج و مصیبت میں ہوتا ہے اور اپنی طاقت اور توانائی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔  
اس لیے انہیں "کلالہ" کہا جاتا ہے۔ راجب مفردات میں لکھتا ہے کہ "کلالہ" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو متوفی کی میراث اس صورت میں  
لے جبکہ اس کے مال باپ، اولاد اور اولاد در اولاد نہ ہو۔ لیکن ایک اور روایت جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے  
منقول ہے، اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "کلالہ" عنوان اور نشان ہے ایسے شخص کے لیے جو دنیا سے اس حالت میں چل بسا جو کہ اس کے کھال  
باپ ہوں نہ اولاد ہو۔

نیز اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ کلالہ کا لفظ متوفی کے لیے بولا جائے اور اس قسم کے رشتہ داروں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا  
ہو۔ بیبا کہ اس نے اپنی کتاب میں اس موضوع کی وضاحت کی ہے۔

لے صحاح اللغة میں ہے۔ "الکلالۃ فی الاصل مصدر بمعنی الکلال وهو ذهاب القوة۔



باقی رہا یہ کہ قرآن مجید نے بہن بھائیوں کے الفاظ کی بجائے لفظ کلاہ کیوں چنا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایسے اشخاص جن کے مال باپ ہوں نہ اولاد، وہ یہ بات بد نظر رکھیں کہ ان کا مال ایسے لوگوں کے ہاتھ آئے گا جو اس کی کمزوری اور ناتوانی کی نشانی ہیں۔ اس لیے قبل ازیں کہ غیر لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں وہ خود اس مال کو ضروری مواقع ضرورت مند لوگوں کی مدد اور اجتماعی فلاح و بہبود میں خرچ کرے۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں:

وان كان رجل يورث كلاله او امراته وله اخ او اخت فلكل واحد منهما السدس

یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا سے اٹھ جائے اور بہن بھائی اس کی میراث لے لیں یا کوئی عورت دنیا سے چلے اور اس کا ایک بھائی اور ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک اس کے مال کا چھٹا حصہ لے گا۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ متوفی کا ایک بھائی یا بہن باقی رہ گئے ہوں اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو پھر وہ کل مال کی ایک تہائی لے لیں گے۔ یعنی ان کو چاہیے کہ ایک تہائی مال آپس میں بانٹ لیں (فان كانوا اكثر من ذلك فهم شركاء في الثلث)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: من بعد وصية يوصي بها او دين۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ وصیت پہلے پوری ہو چکی ہو اور قرض ادا کیا جا چکا ہو (غیر مضار) یعنی اس حالت میں جبکہ وصیت اور قرض میں وارثوں کو نقصان پہنچنے کا کوئی پہلو نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت نہ کرے کیونکہ ان روایتوں کے مطابق جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت سے مروی ہیں ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کرنا گویا وارثوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ ایسی وصیت کی تعمیل وارثوں کی اجازت سے ہوگی یا یہ کہ وارثوں کو محروم کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کے لیے مقروض نہ ہوتے ہوئے خواہ مخواہ قرض کی ادائیگی کا ذکر کر دیا جائے۔

آخر میں تاکید کے طور پر فرماتا ہے:

وصية من الله و الله عليه حليم

یعنی۔ یہ خدا کی وصیت اور نصیحت ہے اس کا احترام کرنا چاہیے کیونکہ وہ تمہاری بہتری کو خوب جانتا ہے۔ جس نے یہ حکم مقرر کیا ہے وہ وصیت کرنے والوں کی نیت سے بھی واقف ہے لیکن اس کے باوجود وہ بردبار بھی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جو اس کے حکم کو نہیں مانتے فوراً سزا نہیں دیتا۔

## چند اہم نکات

- 1۔ جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں بہن بھائیوں کی میراث کے بارے میں ہے اگرچہ وہ بظاہر مطلق ہے اور پدری مادری بہن بھائیوں اور صرف پدری یا صرف مادری بھائیوں کے بارے میں ہے۔ لیکن سورہ نساء ہی کی آخری آیت کی طرف توجہ کرنے سے جس کی تفسیر متفرق کئی جگہ کی گئی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد متوفی کے صرف مادری بہن بھائی ہیں (جو ماں کی طرف سے بہن بھائی ہوں)۔





جبکہ سورۃ نسا کی آخری آیت پدری مادری یا صرف پدری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس آیت کے ذیل میں اس سلسلے میں شواہد پیش کریں گے۔

اگرچہ اس بنا پر کہ یہ دونوں آیتیں ”رکلا لہ“ بہن بھائیوں کی میراث سے بحث کر رہی ہیں اور بظاہر ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن دونوں آیات کے مضامین میں غور و فکر کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک بہن بھائیوں کی ایک خاص صورت کے متعلق وضاحت کر رہی ہے۔ بنا بریں ان دونوں آیتوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔

۲۔ ظاہر ہے کہ اس طبقے کی وراثت اس صورت میں ہے جب پہلے طبقہ یعنی ماں باپ اور اولاد میں سے کوئی باقی نہ ہو۔ اس امر کی شاہد یہ آیت ہے:

”واولوا الارحام بعضهم اولى ببعض في كتاب الله“

رشتہ داروں میں سے بعض میراث کے تقرر اور تعین میں دوسروں پر ترجیح رکھتے ہیں یعنی جو مرنے والے کے زیادہ قریب ہیں وہ مقدم ہیں (الغالب - ۷۵)

اسی طرح وہ بہت سی روایتیں جو اس سلسلے میں منقول ہیں وہ میراث کے طبقات کے تعین اور بعض کی بعض پر ترجیح پر مزید گواہ ہیں۔

۳۔ ہم شریکاء فی المثلث اگر ایک سے زیادہ (مادری بھائی اور بہنیں) ہوں تو وہ مال کے ایک تہائی میں برابر برابر کے شریک ہیں اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک تہائی مال آپس میں مساوی طور پر تقسیم کریں گے اور اس صورت میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ شریکات مطلقہ کا مفہوم حصوں کا برابر برابر ہونا ہے۔

۴۔ مندرجہ بالا آیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ انسان ریتق نہیں رکھتا کہ وصیت کے ذریعے یا ایسا قرضہ بیان کر کے جو دراصل اس کے ذمہ نہیں ہے وارثوں کے خلاف سازش کرے اور ان کا حق ضائع کرے۔ ہاں اس کی صرف یہ ذمہ داری ہے کہ جو قرضہ سچ ہے اس کے ذمہ ہے آخری موقع پر انہیں بتا دے اور وہ عا دلانہ وصیت کا حق رکھتا ہے جس کی حد روایات کی رو سے مال کا ایک تہائی حصہ ہے۔

اس سلسلے میں رہبران اسلام کے ارشادات میں سخت ہدایات دکھائی دیتی ہیں ان میں سے ایک حدیث میں ہے:

ان الضرار فی الوصیۃ من الکبائر۔

وارثوں کو نقصان پہنچانا اور انہیں بے جا وصیت کے ذریعے حق شرعی سے محروم کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

اسلام حقیقت میں اس حکم کے ذریعے ایک طرف تو اس شخص کو اس کے مال کے ایک حصہ سے اس کی وفات کے بعد بھی فائدہ و ثواب پہنچانا چاہتا ہے دوسری طرف وارثوں کو بھی فائدہ پہنچانا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کینہ اور دشمنی کی وجہ سے محبت کا رشتہ جسے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہیے کمزور اور سست پڑ جائے۔

۱۳۔ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي



مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خُلِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

۱۳۔ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا سَأَلَ لَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝

ترجمہ

۱۳ یہ خدا کی (مقرر کی ہوئی) سرحدیں ہیں۔ جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے (اور اس کے قوانین کی سرحدوں کا احترام کرے) وہ اُسے ایسی جنت کے باغوں میں بھیجے گا جس کے درختوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری رہتی ہیں اور یہ لوگ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

۱۴ اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی سرحدوں سے تجاوز کرے گا تو وہ اُسے ایسی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت آمیز سزا ہے۔

تفسیر

حد و حدود کی جمع ہے۔ اصل میں اس کا معنی ہے منع کرنا اور روکنا۔ بعد ازاں ہر اس چیز کو جو دو چیزوں کے درمیان حد فاصل ہو اور انہیں ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا کرے حد کہا جانے لگا۔ مثلاً گھر کی حد، باغ کی حد، شہر کی حد اور ملک کی حد۔ گویا ایسے نقاط کو حد کہا جاتا ہے جو انہیں دوسرے نقاط سے جدا کریں۔

خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں لفظ تلك کے ذریعے میراث کے قوانین کی طرف جو گذشتہ آیات میں آپکے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ خدا کی سرحدیں ہیں جنہیں چھانڈنا اور عبور کرنا منع ہے۔ جو ان سے آگے بڑھیں گے وہ گناہگار سمجھے جائیں گے۔ تلك حدود اللہ کا یہ مفہوم کلام مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے اور یہ سب جگہ اجتماعی احکامات اور مقررات بیان کرنے کے بعد آیا ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں احکامات میں منہی ملاپ کی ممانعت اور روزہ کے احکام کے بعد سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۹ اور ۲۳۰، سورہ طلاق کی آیت ۱۰ میں طلاق کے کچھ احکام کے بعد اور سورہ مائدہ کی آیت ۴۵ میں کفارہ کے بیان کے بعد ہے۔ ان سب مقولوں پر احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں جن سے آگے بڑھنا ممنوع ہے اور وہ خدائی سرحدوں کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں۔

وَمَنْ يَطْعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَدْخُلْهُ جَنَّاتٌ.....

خداوند عالم ان چند خدائی حدود اور سرحدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت

۱۴۔ حد و حدود کی تفسیر کے سلسلے میں اس تفسیر کی جلد ۲ میں مزید بحث ہو چکی ہے۔ اور ترجمہ ص ۱۱۱۱ ملاحظہ کیجئے۔



کرتے ہیں اور ان سرحدوں کا احترام کرتے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ جنت کے بانوں میں رہیں گے جن کے دشتوں کے نیچے سدا پانی بہتا رہتا ہے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے (وذلك الفوز العظيم)۔

من يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله ناراً خالداً فيها

آیت کا یہ حصہ ان لوگوں کے مخالف نقطہ نظر کو بیان کرتا ہے جن کی طرف گذشتہ آیتوں میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان کے احکامات کی سرحدیں پھاند جاتے ہیں وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ البتہ ہم جانتے ہیں کہ صرف خدا کی حکم عدولی (چاہے وہ گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو) ہمیشہ کے عذاب کا سبب نہیں ہے۔ اس وجہ سے آیت مذکورہ بالا میں وہ لوگ مراد لیے گئے ہیں جو دشمنی، سرکشی، بغاوت اور آیاتِ الہی کے انکار کی بنا پر خداوند عالم کے احکامات کو اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالتے ہیں۔ حقیقت میں وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اس بات کی طرف غور و فکر کرتے ہوئے کہ لفظ حد و جمع ہے اور تمام قوانین الہی پر محیط ہے، یہ معنی بعید دکھائی نہیں دیتا کیونکہ جو شخص خداوند عالم کے سب قانون توڑ دے وہ ہرگز خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ ورنہ ان میں سے کسی کا احترام تو کرتا۔

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ گذشتہ آیتوں میں اہل بہشت کے بارے میں خالدین فیہا (ہمیشہ جنت میں رہیں گے) جمع کی صورت میں آیا ہے اور اس آیت میں جو دوزخیوں کے متعلق ہے "خالداً فیہا" جو امد کی شکل میں آیا ہے۔ ایسی دو آیات میں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں، تغیر کا یہ فرق اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اہل بہشت کے لیے اجتماعی زندگی ہے جو جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت شمار ہوتی ہے جبکہ اہل دوزخ عذاب الہی میں اس طرح پھنسے ہوئے اور ڈوبے ہوئے ہوں گے کہ انہیں دوسروں کی کوئی مدد بدھ نہ ہوگی۔ عرض وہ عملی طور پر اکیلے ہوں گے یہاں تک کہ یہ بات اس دنیا میں اپنی رائے پر چلنے والوں اور الگ تھلگ رہنے والے لوگوں کے بارے میں مل جل کر اور اجتماعی زندگی بسر کرنے والوں کے مقابل میں صادق آتی ہے کہ یہ لوگ اس دنیا میں جنتی اور وہ دوزخی ہیں

وله عذاب ملہین

ان کے لیے ذلیل اور رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

اسل میں گذشتہ جملے میں عذاب خداوندی کی جسمانی سزاؤں کا پہلو جھلکتا ہے اور کیونکہ اس جملے میں ذلت و رسوائی کا تذکرہ بھی ہے اس لیے یہاں روحانی پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

## اسلامی قانون میراث کی خصوصیات

عام طور پر میراث کے قانون میں اور خاص طور پر اسلام کے میراث کے قانون میں کئی ایک خوبیاں ہیں۔ ذیل میں بعض کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ اسلامی نظام میراث میں یہ خوبی ہے کہ اس میں متوفی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بھی سلسلہ مراتب کو پیش نظر رکھتے ہوئے میراث سے محروم نہیں رہتا اور یہ جو رواج زمانہ جاہلیت کے عربوں اور بعض دوسرے ملکوں میں تھا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو ہتھیار نہ اٹھا سکنے اور جنگ کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے میراث سے محروم کر دیتے تھے اور متوفی کی دولت دُور کے رشتہ داروں





کو دے دیتے تھے، اسلام میں سرے سے اس کا کوئی ذر نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانون میراث ان سب افراد پر محیط ہے جو مرنے والے کے ساتھ کوئی نسبت یا ربط رکھتے ہیں۔

۲ یہ قوانین جائز اور فطری مزدوریات انسانی کے لیے مثبت پہلو رکھتے ہیں کیونکہ انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت ایسے افراد کے ہاتھوں میں دیکھے جو اس کے جگہ کا محکوم ہیں اور ان کی زندگی حقیقت میں ان کی زندگی کی بقا دوام ہے۔ اس لیے قانون میراث میں اولاد کا حصہ سب سے زیادہ ہے جبکہ مال باپ اور باقی رشتہ دار وغیرہ اپنے مقام پر مناسب حصے کے حامل ہیں۔

۳ یہ قانون انسان کو زیادہ دولت کمانے اور اقتصادی گاڑی کے سپروں کو حرکت دینے کے سلسلے میں شوق دلاتا اور ابھارتا ہے۔ کیونکہ جب انسان اپنی زندگی کی محنت کے نتیجے کو اپنے مرکز محبت و تعلق کے حصہ میں دیکھتا ہے تو پھر وہ چاہے کسی سرن اور حالات میں ہو کام کرنے کے لیے اس کا شوق بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کی مصروفیات میں ٹھہراؤ اور وقفہ نہیں آتا۔ جیسا کہ ہم مکہ چکے ہیں کہ جب بعض ممالک میں قانون میراث کو لغو قرار دیا گیا اور مرنے والوں کا مال اور جائیداد حکومت کو دے دیئے گئے تو بلکہ ہی اس ملک کے اقتصادی ماحول میں اس قانون کے منفی اثرات جمود کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس لیے انہیں مجبوراً یہ قانون ختم کرنا پڑا۔

۴ اسلام کا قانون میراث دولت کو ایک جگہ جمع کرنے سے روکتا ہے کیونکہ اس نظام میں ہر انتقال کے بعد دولت و ثروت عادلانہ طور پر بہت سے افراد میں بانٹی جاتی ہے اس لیے یہ نظام دولت کی عادلانہ تقسیم کے لیے معاون و مددگار ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ آج کی دنیا میں تقسیم دولت کی جو مختلف شکلیں ہیں ان سے اکثر معاشرے کو نقصان اور تکلیف پہنچی ہے۔ اسلام کا قانون میراث اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں مال کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ اسے سب ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں۔

۵ اسلامی قانون میراث متونی سے صرف میل جول رکھنے کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ وارثوں کی حقیقی ضرورت کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹوں کا حصہ بیٹیوں کی نسبت دوگنا ہے۔ یا بعض حالات میں باپ کا حصہ ماں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون اسلامی کے مطابق مرد کی زیادہ اقتصادی ذمہ داریاں ہیں عورتوں کی زندگی کا خرچ مردوں کے کندھے پر ہے۔ اسی لیے ان کو عورتوں کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔

### عول اور تعصیب کے کہتے ہیں

ہم اس مقام پر دو اہم علمی مسئلوں کا جائزہ دیتے ہیں اور وہ ہیں عول اور تعصیب۔

یہ بحث اس وجہ سے شروع ہوتی ہے کہ میراث کے حصے جس طرح گذشتہ آیات میں بیان کیے گئے ہیں بعض اوقات مجموعی سے کم اور زیادہ ہو جاتے ہیں مثلاً اگر دو پدری مادر ہی نہیں اور شوہر وارث ہوں تو ان (دو بیٹیوں) کی میراث دو تہائی (۲/۳) ہے اور شوہر کا ورثہ آدھا کر ہے اور ان کا مجموعہ ۱/۲ ہو گا یعنی کل سے ۱/۲ زیادہ ہو جائے گا۔ یہاں یہ بحث واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ آیا عادلانہ طور پر کل ۱ حصوں کی نسبت سے سب وارثوں کو کم دیا جائے یا یہ کہ مقررہ افراد سے کم کیا جائے۔

علمائے اہل سنت کے درمیان تو یہی شہور ہے کہ سب کے حصوں سے کم کیا جائے۔ فقہی اصطلاح میں اسی کو "عول" کہا جاتا ہے (عفت میں عول کے معنی زیادتی اور بندی کے ہیں)۔

بہر حال وہ کہتے ہیں کہ اضافی پانچ دونوں گروہوں سے ان کے حصوں کے مطابق کم دیا جائے۔ اسی طرح دیگر مواقع پر بھی وہ ایسا کرتے ہیں۔ ہم حقیقت میں اس موقع پر میراث کے حصہ داروں کو طلبگاروں کی طرح فرض کرتے ہیں اور مقروض تمام کے مطالبات پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اصطلاح کے مطابق وہ دیوالیہ ہو گیا ہے اور کون نہیں جانتا کہ ایسے مواقع پر طلبگاروں کے حصوں کی مناسبت سے کمی کی جاتی ہے۔

لیکن شیعہ فقہاء کا نظریہ یہ ہے کہ ہمیشہ نقص خاص افراد کے مال میں ہونا چاہیے ان کے مطابق مندرجہ بالا مثال میں نقص اور کمی دونوں ہزول کے حصہ میں کی جائے گی وہ کہتے ہیں کہ جس طرح حدیث میں آیا ہے، ممکن نہیں کہ وہ خدا جو سب چیزوں کے حساب کو یہاں تک کہ یہاں ان کے ریت کے ذروں کو بھی جانتا ہے میراث کے حصوں کو ایسے کیونکر قرار دے سکتا ہے کہ ان میں کمی واقع ہو۔ یقیناً ایسے مواقع پر فضلانے کوئی قانون وضع کیا ہے۔ اگر اس قانون کی طرف توجہ کرنی جائے تو کمی کا تصور نہیں ہو سکتا اور وہ قانون یہ ہے کہ وارثوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے لیے قرآن میں "مداقل" اور "مداکثر" مقرر نہیں ہوتی یعنی ان کا حصہ قابل تفریح اور اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے۔ اس لیے مندرجہ بالا مثال میں نقص شوہر کی طرف نہیں جائے گا۔ پانچ اضافی حصہ دو بہنوں کے حصہ سے کم کرنا پڑے گا (غور فرمائیے گا)۔ کبھی کبھی اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے اور حصوں کا مجموعہ کل مال سے کم ہوتا ہے اور کچھ مال بیچ جاتا ہے مثلاً ایک شخص مر جاتا ہے اور ایک بیٹی اور ماں باقی رہ جاتی ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس صورت میں ماں کا حصہ پانچ ہے اور بیٹی کا پانچ ہے۔ جن کا مجموعہ پانچ ہوتا ہے یعنی پانچ بیچ جاتا ہے۔ علمائے اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ بیعت عصبہ (بروزن کسب) یعنی بعد والے طبقے کو دی جائے گی (مثلاً اس مثال میں متوفی کے بھائیوں کو دی جائے) اسی کو اصطلاح میں تعصیب کہتے ہیں۔

لیکن شیعہ فقہاء کا نظریہ یہ ہے کہ وہ سب مال انہی دو کے درمیان ایک اور تین کی نسبت سے بانٹ دیا جائے کیونکہ پہلے طبقہ کے ہوتے ہوئے دوسرے طبقہ کی باری نہیں آتی۔ اس کے علاوہ بعد کے طبقہ کے مردوں کو اضافی مقدار دینا زامانہ جاہلیت کے دور سے متاثر ہے جو عورتوں کو بلاوجہ میراث سے محروم کر دیتے تھے۔

مندرجہ بالا ایک پیچیدہ علمی بحث ہے جس کا خلاصہ ہم نے تحریر کر دیا ہے اس کی مزید تفصیل کے لیے کتب فقہ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۵۔ وَالَّتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاَسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً  
مِنْكُمْۙ فَاِنْ شَهِدُوا فَاَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ

۱۔ حساب کا طریقہ یہ ہے کہ عدو مکرری پانچ ہے جو کہ دو بہنوں کا حصہ ہے اور پانچ شوہر کا حصہ ہے۔ پانچ اضافی مقدار ہے اسے ۲ اور ہم کی نسبت سے ان دونوں گروہوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔ ریاضی میں نسبت کی تقسیم کا قاعدہ موجود ہے اس کے مطابق عمل کرتے ہوئے دونوں بہنوں کے حصہ میں پانچ اور شوہر کے حصے میں سے پانچ منہا کریں گے۔

۲۔ جو مرد بلا واسطہ یا باواسطہ متوفی سے ربط رکھتے ہیں۔



الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ۝  
 ۱۶- وَالَّذِينَ يَأْتِيَنَّهَا مِنْكُمْ فَادْوُهُمَا ۖ فَإِنَّ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرَضُوا  
 عَنْهُمَا ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَحِيمًا ۝

ترجمہ

۱۵ اور تمہاری عورتوں میں سے جو زانی ہوں، ان پر چار مسلمان مردوں کو گواہ کے طور پر طلب کرو اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو اپنے گھروں میں بند کر دو۔ یہاں تک کہ وہ مرن جائیں یا خدا ان کے لیے کوئی راستہ کھول دے۔

۱۶ اور وہ مرد اور عورتیں (جو شادی شدہ نہ ہوں) اور یہ بڑا کام کر بیٹھیں انہیں تکلیف پہنچاؤ (ان پر مدجاری کرو) اور اگر سچ توہ کرے اور اپنی اصلاح کر لیں (اور گزشتہ حرکت کی تلافی کریں) تو انہیں معاف کر دو کیونکہ خداوند عالم تو بہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

واللہ اعلم بالصواب

لفظِ فاحشہ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے اصل میں بہت بڑے کام یا بڑی گفتگو کے معنی میں ہے اگر یہ لفظ زنا اور عفت و پاک دامنی کے خلاف کاموں کے بارے میں استعمال ہو تو وہ بھی اسی مناسبت سے ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں تیرہ مقامات پر آیا ہے بعض مواقع پر زنا بعض جگہوں پر "لواطت" کے لیے اور بعض مقامات پر نہایت بے ادبستانگین کاموں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اکثر مفسرین نے اس آیت شریفہ کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ یہ آیت ان شوہر دار عورتوں کی سزا کی طرف اشارہ کرتی ہے جو زنا کار ہوں۔ آیت مزید بتاتی ہے کہ اگر تمہاری بیویاں زنا کی تہمت سے آلودہ ہوں تو چار مسلمان مرد اس کام کے گواہوں کے طور پر بلاؤ۔ اگر وہ اس بات کی گواہی دے دیں تو پھر ان عورتوں کو گھر میں بند کر دو یہاں تک کہ ان کو موت آجائے۔

اس امر کی دلیل کہ مندرجہ بالا آیت زنائے محصنہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس قرینہ کے علاوہ جو آنے والی آیت میں ہے لفظ منساع کہ (تمہاری بیویاں) بھی ہے۔ کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید میں بار بار آئی ہے۔ اسی وجہ سے شوہر دار عورتوں کے عفت و عصمت کے منافی عمل کی سزا اس آیت میں "عقید" مقرر ہوئی ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ آیت فوراً بلافاصلہ کہتی ہے: (او یجعل اللہ لہن سبیلًا) یا یہ کہ خدا ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ یعنی ان کے لیے قید کی سزا جاری رہے یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا

۱۷ محصنہ سہاگن یا شوہر دار عورت کو کہتے ہیں۔ (مترجم)





یہ کہ کوئی نیا قانون خدا کی طرف سے ان کے لیے مبین ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایک وقتی حکم تھا جو شروع شروع میں نازل ہوا تاکہ آئندہ جب حالات اور افکار سازگار ہو جائیں تو ان کے بارے میں ایک نیا حکم نازل کیا جائے۔ اس موقع پر جو عورتیں اس قانون کی زد میں آتی ہیں اور ابھی تک زندہ ہیں وہ فطرتاً قید سے آزاد ہو جائیں گی اور دوسری سزا بھی انہیں زد ہی جائے گی۔ ان کی قید خانہ سے آزادی پہلا حکم منسوخ ہو جانے کی وجہ سے ہوگی۔ باقی رہائی سزا کا نہ ملنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سزا کا قانون ان کاموں کے لیے ہوتا ہے جو اس کے آنے کے بعد انجام پائیں اس طرح آئندہ کے لیے جو بھی قانون ہو وہ ان قیدیوں کی رہائی کا راستہ ہے۔ البتہ نیا قانون ان تمام افراد کے لیے ہے جو آئندہ جرم کریں گے (غور فرمائیے گا)۔

باقی رہا وہ احتمال جو بعض نے پیش کیا ہے کہ "او یجعل اللہ لہن سبیلاً" سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے سنگساری کے متعلق اپنے آئندہ حکم کے ذریعے ایسے افراد کے لیے آزادی کی راہ کھول دی ہے، تو یہ نظریہ درست نہیں ہے کیونکہ یہ کبھی بھی "لہن سبیلاً" (ان کے لیے نفع کی راہ) کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ کسی کو قتل کر دینا سببات کا راستہ نہیں ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ قانون جو اسلام نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے بعد میں مقرر کیا ہے، "رجم" (سنگسار کرنا) ہے جو احادیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بطور مسلم موجود ہے اگرچہ قرآن میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

جو کچھ ہم رقم کر چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت ہرگز منسوخ نہیں ہوئی کیونکہ نسخ ان احکامات کے بارے میں صادق آتا ہے جو شروع میں بصورت مطلق ہوں نہ کہ وقتی اور محدود طور پر، جبکہ آیت مندرجہ بالا نے عمر قید کا حکم ایک محدود اور وقتی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور اگر کچھ روایتوں میں ہے کہ آیات مندرجہ بالا ان احکام کے ذریعے جو عفت و عصمت کے منافی اعمال کی سزا کے بارے میں آئے ہیں، منسوخ ہو گئی ہے تو اس سے مراد اصطلاحی نسخ نہیں ہے کیونکہ نسخ کا لفظ روایات کی زبان میں حکم کے ہر طرح سے خاتمے کے لیے بولا جاتا ہے (غور کیجیے گا)۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ اس قسم کی عورتوں کو گھر میں قید رکھنے کا حکم ایک طرف سے تو ان کے فائدے میں ہے کیونکہ یہ ان کو عام قید خانوں میں قید کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ دوسری طرف تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عام قید خانے معاشرے کو بگاڑنے اور تباہ و برباد کرنے میں گہرا اثر رکھتے ہیں کیونکہ یہ عام طور پر بڑائیوں کی بہت بڑی درس گاہ بنتے ہیں۔ مجرم لوگ وہاں اپنے تجربے ایک دوسرے کو منتقل کرتے ہیں کیونکہ وہ اکٹھے رہتے ہیں اور ان کے پاس وسیع فارغ وقت بھی ہوتا ہے۔

واللذان یأتیانہا منکم

اس کے بعد خداوند عالم اس آیت میں غیر محصنہ (غیر شادی شدہ) سے سرزد ہونے والے زنا اور عفت کے منافی عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اگر کنوارے مرد، عورت یا بڑا کام کریں تو انہیں سزا دو۔ اگرچہ اس آیت میں زنائے غیر محصنہ کی صراحت نہیں ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کے بعد آئی ہے اور زنا کی جس سزا کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ اس سزا سے جدا اور الگ ہے جو گذشتہ آیت میں معنی اور اس سے علی ہے۔ بنا بریں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکم زنا کرنے والوں میں سے ایسے گزراہ کے بارے میں ہے جو پہلی آیت میں داخل نہ تھا اور چونکہ گذشتہ آیت اس قرینہ سے جس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں محصنہ کے زنا کے ساتھ مخصوص ہے، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ آیت غیر محصنہ کے زنا کے بارے میں حکم بیان کر رہی ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ اس آیت میں ذکر کی ہوئی سزا ایک کلی سزا ہے اور سورۃ نور کی آیت ۲ میں جو حد زنا ظہن میں سے ہر ایک کے لیے سو کوڑے بیان کی گئی ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ اس آیت کی تفسیر و توضیح جو اسی دلیل کی بنا پر یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔ تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ نے اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

المبکرا اذا اتت الفاحشة السعی اتلتها هذه الشیب فاز وهما

یعنی اس آیت سے مراد غیر شادی شدہ مرد و عورت ہیں اگر وہ بڑا کام کریں تو انہیں سزا دی جائے۔

لفظ "الذنان" اگرچہ تشبیہ مذکر کا صیغہ ہے، تاہم اس سے مراد مرد اور عورت دونوں ہی ہیں اور یہ اصطلاح کے مطابق باب

تغلیب سے ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال تحریر کیا ہے کہ یہ آیت لواطت جیسے بدترین کام کے بارے میں ہے اور گدشتہ آیت کا ربط مساقاۃ عورت سے عورت کا مباشرت کرنا کے ساتھ ہے۔ لیکن "یاأتیانہا" کی ضمیر "فاحشہ" کی طرف پھرنے سے جو گدشتہ آیت میں ہے، یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منافی محضت عمل جس کا اس آیت میں ذکر ہے، اسی نوعیت کا ہے جس نوعیت کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ بنا بریں ایک کو لواطت کے بارے میں اور دوسرے کو مساققت کے بارے میں سمجھنا ظاہر کے خلاف ہے۔ اگرچہ یہ دونوں انواع ہم جنس سے ملاپ کرنے میں شریک ہیں۔

اس بنا پر دونوں آیات کا زنا سے تعلق ہے۔ ان سب کو چھوڑتے ہوئے بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں لواطت کی سزا قتل ہے نہ کہ آزار اور تکلیف پہنچانا اور کوڑے مارنا۔ فرض اس امر کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ زینہ بحث آیت منسوخ ہو گئی ہے فان تابا واصلحا فاعرضوا عنہما ان اللہ کان توابا رحیما

خداوند عالم آیت کے آخر میں اس قسم کے گناہوں کے لیے توبہ اور بخشش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اگر وہ واقعا توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر کے گدشتہ گناہوں کی تلافی کر لیں تو ان کی سزا سے صرف نظر اور چشم پوشی کر لو کیونکہ خداوند عالم توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ یہ حکم حقیقت میں اس قسم کے خطا کاروں کے لیے واپس آنے کی راہ کھولتا ہے کہ توبہ اور اصلاح کی صورت میں اسلامی معاشرہ فراخ دلی کے ساتھ دامن پھیلائے ہوئے انہیں قبول کر لیتا ہے اور اب وہ معاشرے کے دستکارے ہوئے افراد بن کر نہیں رہتے۔

البتہ جیسا کہ فقہی کتب میں ہے توبہ اس صورت میں درست ہے کہ وہ اسلامی عدالت میں ثبوت جرم شہادت گواہان اور عدالت اسلامی کا حکم صادر ہونے سے پہلے کی جائے لیکن وہ توبہ جو حکم صادر ہونے کے بعد ہو، کوئی وزن نہیں رکھتی ہاں اس حکم سے ضمنیاً معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ توبہ کر چکے ہیں انہیں گدشتہ گناہوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر برا سمجھنا نہ کہا جائے۔

تو جہاں سزا کا حکم اور حد شرعی ساقط ہو جائے وہاں پر بدرجہ اولیٰ لوگ اس کے کیے ہوئے گناہ سے چشم پوشی کریں۔ اس طرح وہ لوگ جن کے بارے میں یہ حد جاری ہو گئی ہو اور اس کے بعد وہ توبہ کر لیں وہ بھی مسلمانوں کی طرف سے چشم پوشی کے مستحق ہیں۔

اسلام کے تعزیری قوانین کا سہل اور متنوع طریقہ

کبھی کبھی بعض لوگ کئی ایک مناسبتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ اسلام نے تعزیری قوانین کی اتنی سہولت اور

ناقابل برداشت سزائیں کیوں مقصود کی ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ شادی شدہ عورت سے زنا کرنے کی سزا پہلے عمر قید مقرر ہوئی اور اس کے بعد قتل کی بہنتر نہیں ہے کہ اس قسم کے گناہوں کی سزا زیادہ نرم اور ہلکی دی جائے تاکہ جرم اور سزا میں اعتدال قائم رہے۔

لیکن ذرا سوچئے اگرچہ اسلام کے تعزیری قوانین اور سزائیں بظاہر سخت اور شدید دکھائی دیتی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں جرم کے ثابت ہونے کا طریقہ اتنا آسان نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایسی شرطیں لگائی گئی ہیں کہ غالباً جب تک گناہ ڈنکے کی چوٹ اور برسراہم نہ کیا جائے وہ شرائط پوری نہ ہوں گی۔ مثلاً گواہوں کی تعداد چار ہے۔ جس کی طرف ہم گذشتہ آیت میں اشارہ کر چکے ہیں کہ صرف ہجر اور لا پرواہ افراد ہی مجرم ثابت ہو سکتے ہیں۔ واضح ہے کہ اس قسم کے اوباش لوگوں کو سخت سزا ہی دینا چاہیے۔ تاکہ وہ معاشرے کے لیے عبرت بن سکیں اور وہ گناہ کی آلودگی سے پاک ہو جائے۔ اسی طرح گواہوں کی شہادت کے لیے کچھ شرطیں ہیں مثلاً آنکھوں سے دیکھنا اور قرآن پر قناعت نہ کرنا اور شہادت میں یکسانیت وغیرہ جو کہ جرم کو ثابت اور گناہ کو ناکردیتی ہے۔

اس طرح اس قسم کی سخت ترین سزا کا امکان گناہگاروں کے سامنے رکھا ہے اور یہ احتمال چاہے کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو بہر حال بہت سے لوگوں کی نفسیات پر اثر انداز ہو سکتا ہے لیکن اسلام نے اس کے اثبات کو مشکل کر دیا ہے تاکہ اگر ایسے مواقع آئیں تو عملی طور پر یہ سزا وسیع پیمانے پر نہ دی جاسکے۔ درحقیقت اسلام چاہتا ہے کہ اس قانون تعزیر کا اثر تہدید بھی قائم رہے اور زیادہ افراد قتل بھی نہ ہوں۔ غرض نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سزا کے تعین اور اثبات جرم کی راہ میں اسلام کا یہ طریقہ ایسی روش ہے جو معاشرے کو گناہ کی آلودگی سے بچانے کے لیے بہت موثر ہے جبکہ جن افراد کو یہ سزا دی جاتی ہے وہ زیادہ تعداد میں بھی نہیں ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے اس روش اور طریقے کا عنوان سہل اور متنوع رکھا ہے۔

۱۷۔ اَتِمَّا التَّوْبَةَ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ

مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝

۱۸۔ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ

الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الشَّنَّ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كَفَارًا ۖ أُولَٰئِكَ

أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

ترجمہ  
۱۷۔ تو بہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے بُرا کام کرتے ہیں اور اس کے بعد بلدی سے توبہ کر لیتے ہیں  
خدا ایسے لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

۱۸۔ اور بُرے کام کرنے والے لوگوں میں سے جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ



اب میں توبہ کرتا ہوں۔ یہ توبہ نہیں ہے اور نہ ان کے لیے جو حالت کفر میں دنیا سے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر

قبولیت توبہ کے لیے شرطیں

انما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة

گذشتہ آیت میں عفت اور پاک دامنی کے خلاف عمل کرنے والوں کو توبہ کے سبب سزا نہ ملنے کا مسئلہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ اور اسی سلسلے میں اس جملے کے ذریعے پروردگار کی طرف سے ان کی توبہ قبول ہونے کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے:

ان الله كان توابا رحیما

خدا اپنے بندوں کی توبہ بہت قبول کرتا ہے اور ان پر رحم کرنے والا ہے۔

خداوند عالم اس آیت میں وضاحت کے ساتھ مسئلہ توبہ اور اس کی کچھ شرطیں بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ: توبہ تو صرف ان کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں۔

آئیے اب دیکھیں کہ جہالت کیا چیز ہے کیا یہ جہل و نادانی اور گناہ سے بے خبری ہے یا اس کے منہوس اثرات اور دردناک نتائج سے ناواقفیت کا نام ہے۔ لفظ جہل اور اس کے مشتقات اگرچہ مختلف معانی کے لیے آئے ہیں لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں خواہشات نفسانی کا مطلق، سرکش ہوا دہوس کا غلبہ اور عقل و ایمان کی قوتوں پر ان کا تسلط و طرح اس حالت میں گناہ کی وجہ سے علم رخصت نہیں ہو جاتا لیکن وہ اعراض نفسانی سے دب کر عمل طور پر بے اثر ہو جاتا ہے اور جب علم اپنا آخر کھو بیٹھے تو وہ از روئے عمل جہل و نادانی کے برابر ہے۔ اگر گناہ اس قسم کی جہالت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ حکم پروردگار کے انکار اور دشمنی کی بنا پر ہو تو اس قسم کا گناہ کفر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ اس روش کو چھوڑ دے اور عناد و انکار سے باز آجائے۔

در اصل یہ آیت اسی حقیقت کو بیان کر رہی ہے جسے حضرت امام زین العابدینؑ نے دعائے ابو حمزہ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، آپؑ بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے ہیں:

اللہی لعلی اعصل حین عصیتک وانا بربوبیتک جاحد و لا بامرک مستغف و لا لعقوبتک متعین  
ولا لوعیدک متھاوہ لکن خطیئة عرضت و مسولت لی نفسی و غلبتی هوای.....

اے خدا جب میں نے تیری نافرمانی کی اس وقت گناہ کی طرف پیش قدمی تیری خدائی سے انکار کی وجہ سے رشتی اور نہ ہی تیرے حکم کو معمولی سمجھنے کے سبب سے تھی اور نہ ہی تیری سزا کو خفیف سمجھتے ہوئے نہ تیری سزا کے وعدے کو عزیزا جم جانتے

ہوئے تھی بلکہ ایک غلطی اور غلطی تھی، جو مجھ سے ہو گئی۔ نفس امارہ نے مجھ پر حق کو مشکوک کر دیا اور مجھ پر ہوا جو میں نے غلبہ کر لیا۔

اس جملے میں توبہ کی ایک اور شرط کی طرف اشارہ ہے، فرماتا ہے:

تندیتوبون من قریب

یعنی۔ وہ جلدی سے توبہ کر لیں۔

اس بارے میں کہ ”قریب“ سے کیا مراد ہے مفسرین میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض اس سے مراد آثار موت ظاہر ہونے سے پہلے لیتے ہیں اور بعد والی آیت جو یہ بتلاتی ہے کہ موت کی علامتیں ظاہر ہونے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی، اس پر بطور گواہ پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر لفظ قریب شاید اس وجہ سے ہے کہ اصولی طور پر دنیا کی زندگی چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہو مختصر ہے اور اس کا خاتمہ نزدیک ہے۔

لیکن بعض نے گناہ کے قریب کا وقت مراد لیا ہے۔ یعنی اپنے گناہ سے جلد از جلد پشیمان ہو اور خدا کی طرف لوٹ آئے کیونکہ مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے آثار و نشانات کو روح و جسم سے بالکل دھو ڈالے۔ یہاں تک کہ گناہ کا کوئی اثر دل میں باقی نہ رہے اور اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان جلد از جلد اس سے پہلے کہ گناہ اس کے جسم میں جو پکڑے اور اس کی طبیعت ثانیہ بنے، اس سے پھٹتا ہے۔ ورنہ بصورت دیگر زیادہ تر گناہوں کے اثرات انسان کے قلب و جان کے گوشوں میں باقی رہ جاتے ہیں۔ پس مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے فوراً بعد کی جائے۔ قریب کا لفظ لغت اور عرف عام کی رو سے ان ہی معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ پوری توبہ نہیں ہے اور شاید علی اللہ (یعنی۔ وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ پر لازم ہے) بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تعبیر قرآن کی صرف اسی آیت میں آئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کی توبہ قبول کرنا بندوں کے حقوق میں سے ہے جبکہ عرصہ دراز کی توبہ قبول کرنا تفضل الہی ہے نہ کہ حق۔

فاولیک یتوب اللہ علیہم وکان اللہ علیہما حکیمًا

خداوند عالم توبہ کی شرطوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ خدا ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

ولیس التوبة للذین یعملون السیات

اس آیت میں ان افراد کی طرف اشارہ ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ فرماتا ہے: وہ لوگ جو موت کی چوکھٹ پر پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم گناہ سے توبہ کرتے ہیں، ان کی توبہ قبول نہیں کی۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کہ جان کنی کے عالم میں جبکہ موت بالکل سامنے دکھائی دے رہی ہو، انسانی آنکھ سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور اس میں ایک خاص بینائی پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ حقائق جن کا تعلق دوسری دنیا کے ساتھ ہے اور اپنے اعمال جو اس زندگی میں کیے تھے، اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے کیونکہ اب مسائل حسی پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ لہذا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہر گناہگار اپنے برے کاموں پر پھٹتا ہے اور اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو اپنے قریب آگ کا شعلہ دیکھ کر اس سے بھاگنا چاہتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ شرعی ذمہ داری اور آزمائش پروردگار کی بنیاد اس طرح



کے مشاہدات پر نہیں ہے بلکہ اس کا دار و مدار غیب کے ایمان اور عقل و خرد کی آنکھ کے مشاہدہ پر ہے۔  
اسی بنا پر کلام مجید میں ہے کہ جس وقت دنیا کے عذاب کی پہلی نشانی گزرے ہوئے زمانے کی بعض قوموں پر ظاہر ہو جاتی تھی تو ان پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ہم فرعون کی سرگذشت میں پڑھتے ہیں:

حق اذا دركہ العرق قال امنت انہ لا اله الا الذی امنت به بنوا اسرائیل وانا من

المسلمین الان وقد عصیت قبل و كنت من المفسدین۔ (یونس ۹۱-۹۰)

یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے پکار کر کہا: اب میں ایمان لاتا ہوں کہ بنی اسرائیل کے معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں تسلیم فرم کرتا ہوں لیکن اس سے کہہ دیا گیا کہ توبہ یہ بات کہتا ہے جبکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا ہے اور توفساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اس وجہ سے تیری توبہ قبول نہیں ہوگی۔

بعض قرآنی آیتوں (مثلاً سورہ سجدہ کی آیت ۱۲) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گناہگار قیامت میں عذاب الہی کو دیکھتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ لیکن ان کی پشیمانی انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ ایسے لوگ بالکل ان مجرموں کی طرح ہیں جن کی نگاہ جب سولی کی لکڑی پر پڑتی ہے اور اس کا پھندا اپنی گردن میں مسموم کرتے ہیں تو اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پچھتاوا نہ باعث فضیلت ہے نہ سبب عزت و افتخار اور نہ ہی ترقی درجات کا ذریعہ۔ اسی لیے یہ توبہ بے اثر ہے۔

یقیناً یہ آیت ان روایات کے خلاف نہیں ہے جو یہ کہتی ہیں کہ توبہ آخری سانس تک قبول ہو سکتی ہے کیونکہ روایات میں آخری سانس سے مراد وہ لمحہ ہے جن میں ابھی موت کی نشانیاں نہ دیکھی ہوں اور اصطلاح کے مطابق ابھی برزخی نگاہ پیدا نہ ہوئی ہو۔

دوسرا گروہ ان افراد کا ہے جن کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ یہ وہ ہیں جو کفر کی حالت میں مرجائیں خداوند عالم آیت بالا میں ان کے بارے میں فرماتا ہے:

ولا الذین یموتون وهم کفار یعنی "جو حالت کفر میں مرجاتے ہیں ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہے" یہ حقیقت قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی واضح کی گئی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جو کفر کی حالت میں دنیا سے چلے جاتے ہیں وہ کس وقت توبہ کریں گے کہ ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی توبہ عالم آخرت میں قبول نہیں ہوگی اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ توبہ سے مراد بندوں کی توبہ نہیں بلکہ خدا کی طرف سے توبہ ہے۔ یعنی خدا ان کے لیے عنود رحمت کی طرف نہیں آئے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ آیت کی نظر ایک اور مقصد پر ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ وہ افراد جنہوں نے صحت و سلامتی اور ایمان کی حالت میں اپنے گناہوں سے توبہ کی ہے لیکن موت کے وقت دنیا سے بحالت ایمان نہیں گئے۔ ان کی گزشتہ توبہ بے معنی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے نیک اعمال کی ایک شرط قبولیت "موافات بر ایمان" یعنی ایمان کے ساتھ دنیا سے جانا ہے اس لیے جو لوگ زندگی



کے آخری لمحات میں کافر بھوں ان کے پہلے اعمال دیہاں تک کہ وہ نیک عمل جو ایمان کی حالت میں کیے تھے (قرآنی آیتوں کی توضیح کے مطابق رائیگاں ہو جائیں گے۔ اگرچہ انہوں نے ایمان کی حالت میں گناہوں سے توبہ کر لی ہو لیکن اس صورت میں وہ بھی بیکار ہو جائیں گے۔ گویا توبہ کے قبول ہونے کی دو شرطیں ہیں۔

۱۔ موت کی نشانیاں ظاہر ہونے سے پہلے ہو۔

۲۔ انسان ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھے۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ توبہ میں دیر نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اچانک موت آجائے اور اس کے لیے توبہ کے دروازے بند ہو جائیں۔ یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ توبہ کی تاخیر جس کو "تسولین" کہتے ہیں اور حالت کفر کی موت کو ہم پر قرار دیا گیا ہے اور یہ اس اہمیت کی علامت ہے جو اس موضوع کو قرآن دے رہا ہے۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے "اولئک اعتدنا للہم عذابا لیمعا یعنی۔ ہم نے ان دونوں گروہوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ توبہ کے لیے مذکورہ بالا شرطوں کے علاوہ اور بھی شرطیں ہیں جن کی طرف متعلقہ آیتوں میں اشارہ ہوگا۔

۱۹۔ یَاٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوْا النِّسَاءَ کَرٰهًا وَّلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذٰهَبُوْا بِبَعْضِ مَا اَتٰیَتْمُوْهُنَّ اِلَّا اَنْ یَّاتِیَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبٰیْنَةٍ وَّعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ کَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰی اَنْ تَکْرَهُنَّ شِیْئًا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا ۝

ترجمہ

۱۹۔ اے ایمان والو! تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ عورتوں سے سختی سے (اور انہیں تکلیف پہنچا کر) میراث لو اور جو کچھ (بطور حق مہر) انہیں دیا ہے اسے اپنی ملک بنانے کے لیے ان پر سختی نہ کرو۔ مگر یہ کہ وہ کھلے بندوں برائی کریں اور ان سے اچھا سلوک کرو اگرچہ تم ان سے (کئی وجوہات کی وجہ سے) نفرت و حقارت کرتے ہو (تو فوراً علیحدگی کا پختہ ارادہ نہ کرو) کیونکہ اکثر اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا اس میں بہت زیادہ نیکی قرار دیتا ہے۔



## شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی بیویوں کو اپنے پاس تو رکھتے تھے مگر ان سے بیویوں کا سا سلوک نہیں کرتے تھے اور اس انتظار میں رہتے تھے کہ کب یہ مری اور وہ ان کے مال پر قبضہ کریں۔

جیسا کہ ابن عباس کہتے ہیں:

یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں نازل ہوئی جن کی بیویوں کا حق مہر بہت زیادہ تھا اس کے باوجود کہ وہ ان سے ازدواجی تعلقات رکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن ان کا حق مہر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو طلاق بھی نہ دے سکتے تھے۔ اس لیے وہ ان پر سختی کرتے تھے تاکہ وہ حق مہر بخش کر طلاق لے لیں۔

مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کی ایک اور شانِ نزول بھی نقل کی ہے جو اس آیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ آیت ۲۲ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ جسے انشاء اللہ ہم اسی آیت کی ذیل میں بیان کریں گے۔

تفسیر

## حقوق نسواں کا دوبارہ دفاع

يا ايها الذين امنوا لا يجعل لکم ان ترثوا النساء کرها

ہم اس سورت کے شروع میں لکھ چکے ہیں کہ اس سورت کی آیتیں زمانہ جاہلیت کے بہت سے برسوں کے خلاف برسرِ پیکار میں چنانچہ زیرِ بحث آیت میں اس زمانہ کی چند بڑی عادتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ان سے دور رہیں:

۱۔ عورتوں کو ان کے مال کی لالچ میں قیدی نہ بناؤ۔ جیسا کہ شانِ نزول میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مردوں کی ایک ظالمانہ روش یہ تھی کہ وہ ان دولت مند عورتوں سے جو بد صورت ہوتی تھیں شادی کر لیتے۔ پھر انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیتے تھے نہ انہیں طلاق دیتے اور نہ ہی ان سے بیوی کا سا برتاؤ کرتے، اس امید پر کہ انہیں موت آجائے تو ان کے مال پر قبضہ کر لیں۔ آیہ مذکورہ بالا ۱۲۵ اعلان کرتی ہے کہ اسے ایمان والو! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کی میراث انہیں تکلیف پہنچا کر زبردستی لے لو۔ اس طرح سے قرآن نے مذکورہ کام کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔

۲۔ عورتوں سے مہر کا حق بخشوانے کے لیے سختیاں نہ کرو۔ ان کی ایک بڑی عادت یہ تھی کہ وہ عورتوں کو طرح طرح سے ستاتے تھے تاکہ وہ حق مہر بخش دیں اور طلاق لے لیں۔ خاص طور پر یہ معاملہ ایسے موقع پر ہوتا تھا جب کہ کسی عورت کا

حق مہر زیادہ ہو اس آیت نے اس کام سے منع فرمایا ہے ولا تعضلوہن لئذہبوا ببعض ما اتیتہموہن۔ یعنی ان پر اس لیے سختی نہ کرو کہ اس طریقے سے جو حصہ تم نے انہیں دیا ہے اسے اپنی ملک بنا سکو لیکن اس کا ایک استثنائی حکم بھی ہے جس کی طرف اللہ ان یأتین بغاحشہ مبینۃ کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ بڑے سے اور شرمناک کام کریں تو پھر شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ ان پر سختی کریں تاکہ وہ اپنا حق مہر تمہارے لیے حلال کر کے طلاق لے لیں۔ درحقیقت یہ ایک قسم کی سزا ہے جو بڑے عورتوں سے ان کے کثرت کے بدلے تاوان لینے کی طرح ہے۔ کیا آیت مذکورہ میں ”فاحشۃ مبینۃ“ (واضح برائی) سے مراد وہ بڑے کام ہیں جو عفت و پاکدامنی کے منافی ہیں یا اور کسی قسم کے سخت ناگوار اعمال ہیں۔ مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں ایک طولانی بحث ہے لیکن اس حدیث میں جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے اس کی تشریح ہو چکی ہے کہ یہ عورت کی ہر طرح کی سخت مخالفت، نافرمانی اور بڑے سلوک پرست قتل ہے۔ البتہ یہاں پر ہر چھوٹی بڑی مخالفت مراد نہیں ہے کیونکہ لفظ فاحشہ میں اہمیت اور اس کا خلاف معمول ہونا مخفی ہے۔ لفظ ”مبینۃ“ بھی اس کی تاکید کرتا ہے۔

۳۔ ان کے ساتھ شائستہ اور مناسب طریقہ کے ساتھ زندگی بسر کرو ”وعاشروہن بالمعروف“ فرما کر عورتوں کے بارے میں شائستہ معاشرت اور مناسب انسانی سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد مزید کہا گیا ہے:

فان کرہتموہن فغسی ان تکرہوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا

یعنی۔ یہاں تک کہ اگر تم بعض وجوہات کی بنا پر اپنی بیویوں سے مکمل طور پر خوش نہیں ہو اور انہیں پسند نہیں کرتے ہو اور وہ تمہاری نظر میں کئی باتوں میں اچھی نہیں ہیں تو فوراً ان سے علیحدگی کا پختہ ارادہ یا ان سے بڑا سلوک نہ کرو۔ بلکہ جہاں تک جو سکے ان سے اچھا سلوک کرو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری رائے کا دار و مدار شک و شبہ پر ہو اور جسے تم پسند نہیں کرتے خدا نے اسی میں بہت زیادہ خیر و برکت اور نفع رکھا ہو۔ اس بنا پر جب تک پانی سر سے اونچا نہ ہو جائے یہی مناسب ہے کہ حسن معاشرت اور خوش گفتاری کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے بلا دہر اور بلا دلیل خواہ مخواہ کے بغض و حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان حالات میں ان کے فیصلے ٹھیک نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ اچھائیاں ان کی نظریں برائیاں اور برائیاں ان کی نگاہ میں اچھائیاں بن جاتی ہیں لیکن وقت گزرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے آہستہ آہستہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس لیے ضمنی اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس آیت میں عید اکشیرا کی تعبیر سے ان میاں بیوی کو جو ایک دوسرے کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں ایک خوشخبری دی گئی ہے جو وسیع مفہوم رکھتی ہے جس کے کئی ایک مصداق ہیں جن میں سے ایک واضح مصداق نیک، صالح، لائق اور عزت دار اولاد بھی ہے۔

۲۰۔ **وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ أَحَدَهُنَّ قِطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ تَأْخُذُونَ بَدْتَانَا ۗ وَإِشْمَامٌ مِّبِينًا ۝**

لے تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۲۵۷۔





۲۱۔ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنْكُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ۝

ترجمہ

۲۰۔ اگر تمہارا یہ ارادہ ہو کہ اپنی بیوی کی جگہ دوسری بیوی کا انتخاب کرو اور تم اسے (حق مہر کے طور پر) بہت زیادہ مال دے چکے ہو تو اس میں سے کوئی چیز بھی واپس نہ لو۔ کیا تم عورتوں سے مہر واپس لینے کے لیے تہمت اور کھلے گناہ کا سہارا لیتے ہو۔

۲۱۔ اور تم کس طرح اسے واپس لے سکتے ہو جبکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اور پورا پورا میل ملاپ رکھتے ہو۔ (چھوڑنے کے باوجود) وہ تم سے (شادی کے وقت) مضبوط وعدہ لے چکی ہیں۔

شان نزول

اسلام سے پہلے یہ رسم تھی کہ اگر مرد چاہتے کہ پہلی بیوی کو طلاق دیں اور نئی شادی کریں تو حق مہر سے بچنے کے لیے اپنی بیوی پر نفرت کے منافی تہمت لگاتے اور اس پر سختی کرتے تھے تاکہ وہ اس بات پر تیار ہو جائے کہ اپنا حق مہر جو عام طور پر پہلے ہی وصول ہو جاتا تھا واپس کر دے اور طلاق لے لے۔ پھر وہی دوسری بیوی کا حق مہر مقرر کر دیتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت اس بڑے فعل سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے اسے قابل مذمت قرار دیتی ہے۔

تفسیر

یہ آیت بھی عورتوں کے بعض حقوق کی حمایت میں نازل ہوئی ہے اور عام مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ جب وہ پہلی بیوی سے علیحدگی اور نئی بیوی لانے کا ارادہ کریں تو انہیں یہ حق نہیں ہے کہ پہلی بیوی کے حق مہر میں کمی کریں یا اگر اسے ادا کر چکے ہوں تو اس سے واپس لے لیں۔ قنطار کا معنی ہے بہت زیادہ مال و دولت، چنانچہ رانغب مفردات میں لکھا ہے کہ قنطار کی اصل قنفرہ ہے جس کا معنی "پہل" ہے اور چونکہ زیادہ مال بھی پہل کی مانند ہے جس سے انسان زندگی بھر فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی بنا پر اسے قنطار کہا گیا ہے۔ یہاں گفتگو کی بنیاد یہ ہے کہ طلاق شوہر کے فائدے کے لیے دی جا رہی ہے نہ کہ عورت کے منافیِ عفت کا ہلکا

۱۔ تفسیر صافی آیہ زیر بحث۔

۲۔ مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ میں سورۃ آل عمران کی آیت ۴۱ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے (اردو ترجمہ ص ۲۶)۔

کی دوسرے، اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کا تسلیم شدہ حق پامال کیا جائے۔

اتأخذونه بهتاناً واثماً مبيناً

اس کے بعد زمانہ جاہلیت کے اس طرز عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کروہ لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگاتے تھے مزید فرماتا ہے، کیا تم عورتوں کا حق مہر واپس لینے سے تہمت اور واضح گناہ کا ارتکاب کرنا چاہتے ہو۔ یعنی ایک تو یہ ظلم ہے اور ایک بزدلانہ اور غلط کام ہے۔ اور دوسرے کھلم کھلا گناہ ہے۔

وكيف تأخذونه وقد افضى بعضكم الى بعض

اس آیت میں مردوں کے جذبہ محبت کو متحرک کرنے کے لیے نئے سرے سے استفہام انکاری سے کام لیتے ہوئے مزید ارشاد فرمایا گیا ہے، تم اور تمہاری بیویاں مدتوں خلوت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور ایک روح دو قالب کی طرح آپس میں بھرپور میل ملاپ رکھتے رہے۔ پھر کس طرح اس نزدیکی کے باوجود بیگانوں اور دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہو اور ان کے مانے ہوئے حقوق کو پامال کر رہے ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے آجکل کی فارسی زبان میں اگر دو بگڑی دوست ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں تو انہیں کہا جاتا ہے کہ تم نے مدتوں ایک دوسرے کے ساتھ نان و نمک کھایا ہے اب کیوں جھگڑتے ہو۔ دراصل ایسے موقع پر شریک حیات پر ظلم اپنے آپ پر ظلم کے مترادف ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے، اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ تمہاری بیویوں نے شادی کے وقت تم سے پختہ عہد و پیمان لیا ہوا ہے، تم اب کس طرح اس مقدس اور مضبوط عہد کو ٹھکرا سکتے ہو اور واضح عہد شکنی کی طرف قدم بڑھا سکتے ہو۔

واخذن منكم ميثاقاً غليظاً

ضمناً فور کرنا چاہیے کہ یہ آیت اگرچہ پہلی بیوی کو طلاق دینے اور نئی سے شادی کرنے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے لیکن پھر بھی صرف اسی صورت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی علیحدگی اور طلاق مرد کے ارادے سے ہو اور عورت جدائی نہ چاہے وہاں تمام مہر ادا کیا جائے اور اگر پہلے دیا جا چکا ہے تو اس میں سے کوئی چیز واپس نہ لی جائے چاہے دوسری شادی کا ارادہ ہو نہ ہو۔ اس بنا پر ان اردتہ استبدال زوج اگر تم دوسری بیوی انتخاب کرنا چاہتے ہو۔ یہ جلد حقیقت میں زمانہ جاہلیت کی کیفیت کے بارے میں ہے تاہم اس سے اصل حکم متاثر نہیں ہوتا۔ یہاں اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "استبدال" کا معنی ہے "تبدیلی چاہنا"۔ اسی لیے اس میں طلب اور ارادہ پایا جاتا ہے۔ اب اگر ہم دیکھتے ہیں "اردتہ" (تم چاہو) اس کے ساتھ متصل ہے، تو یہ اس بنا پر ہے کہ آیت چاہتی ہے کہ یہ نکتہ گوش گزار کرے کہ نئی بیوی سے شادی کرنے کے لیے ناجائز اور بزدلانہ جھگڑے اور مقدمے شروع نہ کرو۔

۲۲۔ وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ إِنَّهُ

لے انشاء اصل میں مادہ نفا سے ہے۔ جس کا معنی ہے وسعت و کشادگی۔ جب ایک شخص دوسرے سے مکمل میل جول قائم کر لیتا ہے تو دراصل وہ اپنے محدود جسم کو ایک وسیع تر جسم اور وجود میں تبدیل کر لیتا ہے۔ اس لیے انشاء کا معنی ہے ربط ضبط (میل جول) پیدا کرنا۔



## كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا ۝

ترجمہ

۲۲ اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں۔ مگر وہ جو ہو چکا ہے (اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے) کیونکہ یہ کام بڑا، باعثِ نفرت اور غلط ہے۔

شانِ نزول

زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا اور اپنے پیچھے بیوی بچے چھوڑ جاتا تو اگر وہ بیوی اس کے بیٹوں کی سگی ماں نہ ہوتی تو وہ بیٹے اُسے مال کی طرح اپنی میراث بنا لیتے اور اس طرح وہ یہ حق سمجھتے کہ اپنی سوتیلی ماں سے خود شادی کر لیں یا اس کی کسی اور سے شادی کر دیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد ایک مسلمان کے بارے میں ایک مادہ پیش آیا، وہ یہ کہ ابوقیس نامی ایک انصاری فوت ہو گیا۔ اس کے بیٹے نے اپنی سوتیلی ماں سے شادی کرنا چاہی تو اس عورت نے کہا میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہوں اس لیے یہ کام مناسب نہیں سمجھتی اس کے باوجود حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی شرعی ذمہ داری معلوم کر لیتی ہوں۔ اس کے بعد اس عورت نے یہ بات حضور کی خدمت میں عرض کی۔ اس پر آیت مذکورہ بالا نازل ہوئی اور اس کام سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔

تفسیر

جیسا کہ ہم شانِ نزول میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس آیت نے زمانہ جاہلیت کے ایک نہایت مکروہ اور ناپسندیدہ فعل پر غلط بطلان کھینچ دیا اور فرمایا: وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ یعنی ان عورتوں کے ساتھ جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں نکاح نہ کرو۔ لیکن کیونکہ عام طور پر کوئی قانون گذشتہ امور پر عادی نہیں ہوتا۔ اس لیے مزید فرمایا: إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ یعنی۔ مگر وہ شادیاں جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد تین سخت برائیاں اس قسم کی شادی کے بارے میں بیان فرمائیں۔ پہلی یہ کہ ارشاد ہوتا ہے: یہ بہت بڑا کام ہے اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً، اس کے بعد مزید فرماتا ہے: یہ عمل ایسا ہے جو لوگوں کی نظروں میں نفرت کا سبب ہے۔ یعنی انسان کی فطرت اسے پسند نہیں کرتی (وہمقتا) اور آخر میں فرماتا ہے: یہ غلط طریقہ ہے (وساء سبیلًا) یہاں تک کہ تاریخ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ بھی اس قسم کی شادی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جو بچے اس سے پیدا ہوتے تھے انہیں "مقیّت" (قابلِ نفرت اولاد) کے نام سے پکارتے تھے۔

واضح ہے کہ یہ حکم کئی ایک مصلحتوں کے پیش نظر اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے مقرر ہوا کیونکہ سوتیلی ماں سے نکاح ایک طرف تو سگی ماں سے نکاح کی طرح ہے کیونکہ سوتیلی ماں کے احکام بھی سگی ماں کے سے ہیں۔ دوسری طرف باپ کے حریم میں تصرف اس





کے احترام کی جھگ ہے۔ ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ عمل اس شخص کی اولاد میں نفاق کا بیج بوتا ہے کیوں کہ جو سکتا ہے کہ سوتیلی ماں سے نکاح کرنے کے معاملہ میں اولاد کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے، بلکہ باپ اور بیٹے کے درمیان بھی رقابت پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ عام طور پر پہلے اور دوسرے شوہر میں رقابت اور دشمنی ہوتی ہے۔

اگر یہ کام (سوتیلی ماں سے شادی) باپ کی زندگی میں (باپ کے طلاق دینے کے بعد) انجام پائے پھر تو حسد اور دشمنی کی واضح دلیل ہے۔ اگر اس کے مرنے کے بعد ہو پھر بھی ہو سکتا ہے کہ بیٹے کو مرے ہوئے باپ سے دل میں ایک قسم کا حسد پیدا ہو۔ تین قسم کی تعبیریں جو اس کام کی برائی اور مذمت میں زیر نظر آیت میں آئی ہیں بعید نہیں کہ ان کا اشارہ انہی تین فلسفوں کی طرف ہو۔

۲۳۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأَخْتِ وَأُمَّهَاتُ الْمَنِّ الْأَخْتِ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَّاتُ بَيْتِكُمُ الَّتِي فِي مَجُورِكُمْ مِّنْ نِّسَائِكُمُ الَّتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ إِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَأَحْلَابُ آبَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

ترجمہ

۲۳ تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری چھو پھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں، تمہاری بھانجیاں اور وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، تمہاری رضاعی بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہو اور جو ان بیویوں سے ہیں جن کے ساتھ تمہاری جنسی آمیزش رہی ہے اور اگر ان سے جنسی آمیزش نہیں رہی تو ان کی بیٹیاں تمہارے لیے ممنوع نہیں ہیں (اسی طرح) تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری نسل سے ہیں (نہ کہ منسوبے بیٹے) نیز (تم پر حرام ہے) یہ کہ دو بہنوں کو جمع کرو لگروہ جو گدشتہ زمانے میں ہو چکا ہے خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر



## محارم سے نکاح کی حرمت

اس آیت میں محارم (وہ عورتیں جن سے رشتہ زوجیت منع ہے) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ اس آیت کی بنیاد پر تین طریقوں سے محرمیت پیدا ہو۔

۱۔ ولادت، جسے نسبی تعلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ طریق ازدواج سے، جسے سببی ارتباط کہتے ہیں۔

۳۔ رضاعت (دودھ پلانے) سے، جسے ارتباط رضاعی بولتے ہیں۔

سب سے پہلے نسبی محارم کی طرف جو سات طرح کے ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

حرمت علیکم امهاتکم وبناتکم واخواتکم وبناتکم وبنات الاخ وبنات الاخت .

تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، بھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔

یاد رکھیے کہ ماں سے مراد وہ عورت نہیں ہے جس سے انسان بلا واسطہ پیدا ہوا ہو بلکہ دادی پڑدادی اور باپ کی ماں اور اسی قسم کی دوسری عورتیں مراد ہیں۔ جس طرح بیٹی سے مراد صرف بلا واسطہ بیٹی نہیں ہے بلکہ بیٹی، پوتی، نواسی اور ان کی اولاد بھی ہے اسی طرح دوسرے پانچ مواقع پر بھی ایسا ہی ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ تمام لوگ فطری طور پر اس قسم کی شادیوں سے نفرت کرتے ہیں، اسی وجہ سے سب قومیں (چند افراد کو چھوڑ کر) محارم سے نکاح حرام سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجوسی جو اپنے منابغ اور کتب کی بنا پر اس قسم کی شادیوں کو جائز سمجھتے تھے آج اس کا انکار کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگ اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس امر کو ایک پرانی عادت اور رسم قرار دیں۔ لیکن یہ سراسر ہے کہ ایک قانون کی عمومیت تمام لوگوں، زمانوں، سالوں اور شہروں میں عملی طور پر اس کے فطری ہونے کی ترجمانی کرتی ہے۔ کیونکہ ایک عام رسم و عادت میں دائمی اور عالمگیر بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس سے قطع نظر بھی آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہم خون افراد کی ایک دوسرے سے شادیاں بے شمار خطرات کی حامل ہوتی ہیں یعنی چھپی ہوئی وراثتی بیماریاں شدت اختیار کر لیتی ہے اور آشکار ہو جاتی ہیں (اس سے یہ مراد نہیں کہ اس طرح بیماری پیدا ہوتی ہے)۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو محارم سے گزار کر قوم و قبیلہ میں بھی جو نسبتاً نزدیک ہیں مثلاً چچا زاد کا ایک دوسرے سے شادی کرنا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ بھی وراثتی بیماریوں کے خطرات میں شدت پیدا کرتا ہے لیکن یہ مسئلہ اگر دور کے رشتہ داروں میں کوئی مشکل پیدا نہ بھی کرے (جیسا کہ عام طور پر نہیں کرتا) تب بھی نزدیک کے رشتہ داروں میں جو کہ زیادہ ہم خون ہیں یقیناً خرابی اور بیماری میں شدت پیدا کر دیتا ہے۔

۱۷۔ البتہ اسلام میں چچا زاد کا ایک دوسرے سے شادی کرنا اور اس قسم کے دوسرے رشتہ دار حرام نہیں ہوتے کیونکہ یہ محارم کی طرح نہیں ہیں اور اس قسم کے رشتوں میں کسی مادہ کا احتمال بہت کم ہے۔ ہم خود بہت سے مواقع کے معنی ظاہر ہیں کہ اس قسم کی شادیاں ہوئیں اور ان کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہوئے وہ صحت مند اور ذہنی طور پر لائق ہیں۔

علاوہ ازیں عام طور پر محارم میں جنسی جذب و کشش کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ اپنے جڑتے، پھیلنے پھولنے اور پروان چڑھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ایک عام اور دائمی وجود ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ استثنائی اور غیر معمولی قوانین کی عمومی اور کلی حالت کے لیے میزان نہیں بن سکتے۔

نیز یہیں معلوم ہے کہ جنسی کشش ہی ازدواجی زندگی کے رشتے کے استحکام کے لیے شرط اول ہے۔ اس بنا پر اگر محارم کے درمیان ازدواج ہو تو وہ ناپائیدار اور گرم جوشی سے عاری ثابت ہوگا۔

اس کے بعد رضائی محارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: **وأمہتکم اللاتق ارضعتکم واخواتکم من الرضاعة۔** یعنی۔ اور تمہاری دو مائیں جو تمہیں دودھ پلاتی ہیں اور تمہاری رضاعی بہنیں تم پر حرام ہیں۔

اگرچہ قرآن نے آیت کے اس حصے میں صرف دو گروہوں یعنی رضاعی بہنوں اور ماؤں کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن بے شمار وجود رکھنے والی بنا پر رضاعی محارم انہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ مشہور حدیث کے مطابق جو حضرت پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے: **یجر من الرضاع ما یجر من النسب۔** یعنی تمام افراد جو کسی رشتہ کے لحاظ سے حرام ہیں وہ رضاعت (دودھ پلائی) کی رو سے بھی حرام ہیں البتہ دودھ پلانے کی مقدار جو حریمت پر اثر ڈالتی ہے، یہ اور اس طرح کی دیگر شرائط کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

### محارم رضاعی کی حریمت کا فلسفہ

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ کسی خاص فرد کے دودھ سے کسی کے گوشت اور ہڈیوں کی پرورش اس کی اولاد سے اس کی شبابہت پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً جو عورت کسی بچے کو ایک مقدار تک دودھ پلاتی ہے تو اس کا جسم اس کے دودھ سے ایک خاص نشوونما پاتا ہے۔ اس سے ایک خاص قسم کی شبابہت اس بچے اور عورت کے اپنے بچوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں ان میں سے ہر ایک اس مال کے بدن کا ایک جزو شمار ہوتا ہے اور وہ دو نسبی بھائیوں کے مانند ہوتے ہیں۔

آخر میں محارم کے تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں چند عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

- ۱۔ **واہبات نسائکم۔** اور تمہاری بیویوں کی مائیں۔ یعنی صرف اتنی سی بات کہ ایک عورت کسی شخص کے نکاح میں آجائے اور میثاق نکاح جاری ہو جائے تو اس عورت کی ماں اور اس کی ماں کی ماں اور اس طرح کے سب رشتے اس پر حرام ابدی ہو جائیں گے۔
- ۲۔ **وربائیکم اللاتی فی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بہن۔** اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جو تمہاری گود میں ہیں بشرطیکہ اس بیوی کے ساتھ ہم بستری کر چکے ہو یعنی ایک عورت سے صرف بقدر شرمی کرنے سے اس کی وہ لڑکیاں جو دوسرے شوہر سے ہیں اس شخص پر حرام نہیں ہوتیں بلکہ ان کی حریمت کے لیے یہ شرط ہے کہ عقد شرعی کے علاوہ اس عورت سے مباشرت بھی کرے۔ اس مقام پر یہ قید بتاتی اور تائید کرتی ہے کہ بیوی کی ماں کا حکم جو کہ ابھی ابھی لکھا گیا ہے وہ اس قسم کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے اور اصطلاح کے مطابق حکم کے اطلاق کو تقویت دیتا ہے اگرچہ فی حجورکم (جو تمہاری گود میں ہیں) کی قید کا نظہور یہ ہے کہ اگر بیوی کی دوسرے شوہر سے بیٹی انسان کی گود میں پرورش نہ پائے تو وہ اس پر حرام نہیں ہے لیکن روایات کے قرینہ اور حکم کے مستمک ہونے کی بنا پر یہ قید اصطلاح کے مطابق استثنائی نہیں ہے بلکہ واقعی تحریم کے نکتہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ایسی لڑکیاں جن





کی مائیں دوسری شادی کر لیتی ہیں عموماً کم عمر ہوتی ہیں اور اکثر نئے شوہر کی گود میں اس کی اپنی بیٹیوں کی طرح پرورش پاتی ہیں۔ آیت کہتی ہے کہ یہ واقعی تمہاری بیٹیوں کی مانند ہیں تو کیا کوئی شخص اپنی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔ رہا سب بھی جو کہ ربیبہ کی جمع ہے اسی بنا پر ہے۔

آیت کے اس حصہ کے بعد مطلب کی تاکید کے طور پر مزید فرماتا ہے کہ اگر ان سے منسی آمیزش نہیں رکھتے تو پھر ان کی بیٹیاں تم پر حرام نہیں ہیں (فان لم تکنوا دخلتم جہنم فلا جناح علیکم)۔

۳۔ و حلائل ابناکم الذین من اصلا بکم۔ یعنی۔ اور تمہارے ان بیٹیوں کی بیویاں جو تمہاری صلب و نسل سے ہیں۔ حقیقت میں من اصلا بکم یعنی۔ وہ بیٹے جو تمہاری نسل سے ہیں، اس وجہ سے ہے کہ زمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم پر غلط بطلان کھینچا جائے کیونکہ اس زمانے میں معمول تھا کہ کچھ افراد کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے یعنی جو کسی اور کا بیٹا ہوتا آست اپنے بیٹے کے نام سے پکارتے تھے اور منہ بولے بیٹے پر حقیقی بیٹے کے تمام احکام و قانون لاگو ہوتے تھے اور اسی وجہ سے منہ بولے بیٹیوں کی بیویوں سے شادی نہیں کرتے تھے۔ اسلام میں منہ بولا بیٹا اور اس کے سب احکام کی طور پر کوئی بیٹا نہیں رکھتے۔

۴۔ وان تجمعوا بین الاختین۔ اور تم پر دو بہنوں کا جمع کرنا منع ہے۔ یعنی تم ایک ہی وقت میں دو بہنوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر دو بہنوں یا زیادہ کے ساتھ مختلف زمانوں میں یا پہلی بہن سے ملیندگی کے بعد دوسری سے شادی کی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں دو بہنوں کو اکٹھا رکھنے کا رواج تھا اور کئی لوگ ایسی شادیاں کر چکے تھے۔ اس لیے قرآن مندرجہ بالا جملہ کے بعد کہتا ہے: الاما قد سلف یعنی اس حکم کا دوسرے احکام کی طرح، گزشتہ شادیوں پر اثر نہیں پڑے گا۔ یعنی جو لوگ اس قانون سے پہلے اس قسم کی شادیاں کر چکے ہیں ان کے لیے کوئی مذاب اور سزا نہیں ہے۔ اگرچہ اس وقت ان میں سے صرف ایک کو چھوڑنا پڑے گا۔

اسلام نے اس قسم کی شادی سے کیوں روکا ہے۔ شاید اس کی رمزیہ ہو کہ دو بہنیں طبعی اور فطری نسبی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جائیں گی تو وہ پہلی فطری محبت باقی نہ رہے گی بلکہ ایک قسم کا تضاد ان میں جنم لے گا جو ان کی زندگی کے لیے انتہائی مضرب ہے کیونکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہند بڑ محبت اور ہند بڑ رقابت ان کے دلوں میں باہم برس پیکار رہیں گے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ جملہ الاما قد سلف ان تمام محارم کے بارے میں ہے جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی اگر اس آیت کے نزول سے پہلے ذکر کیے ہوئے محارم میں سے اس زمانے کے مرد و عورتوں کے مطابق کوئی شخص شادی کر چکا ہے تو یہ تحریم کا حکم اس پر لاگو نہیں ہوگا اور ان کی اولاد جائز اولاد ہوگی لیکن اس آیت کے نزول کے بعد ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ آیت کا آخری جملہ یعنی ان الذمہ کان غفوراً رحیماً بھی اس مفہوم سے مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔

۷۔ "عائل" عید کی جمع ہے۔ جو مادہ "عل" سے اس عورت کے معنی میں ہے جو انسان پر عائل ہو یا مادہ ملول سے ہے جس کے معنی اس عورت کے ہیں جو ایک جگہ کسی مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے۔



۲۳ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ  
وَاحِلَ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ  
مُسَافِحِينَ ۖ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً  
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ۗ إِنَّ اللَّهَ  
كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝

ترجمہ

۲۳ اور شوہر دار عورتیں (تم پر حرام ہیں) مگر وہ کہ جن کے تم مالک بن گئے ہو۔ یا ایسے احکام ہیں جو خدا نے تم پر مقرر کیے ہیں۔ ان (مذکورہ) عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تم پر حلال ہیں اور جنہیں اپنے مال کے ذریعے اپناؤ بشرطیکہ تم پاک دامن رہو اور زنا سے بچو اور جن عورتوں سے متنعہ کرو تو ان کا حق مہر جو تم پر واجب ہے ادا کرو اور تم پر اس کی نسبت کوئی گناہ نہیں جس پر ایک دوسرے کے ساتھ مہر مقرر کر کے موافقت کرو، خدا دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

والمحصنات من النساء . . . . .

یہ آیت گذشتہ آیت کی بحث کا ضمیمہ ہے جو ان عورتوں کے متعلق ہے جن سے شادی کرنا حرام ہے، یہ آیت مزید خبردار کرتی ہے کہ سہاگنوں کے ساتھ شادی اور مباشرت حرام ہے۔

”محصنات“ ”محصنہ“ کی جمع ہے اور ”محسن“ کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ”قلندہ“۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ شوہر دار یا ضعیف و پاکہ دامن عورتوں کے لیے جو غیر مردوں سے منجبی تعلق سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتی ہیں یا کسی مرد کی سرپرستی میں ہوں گے لیے بولا جاتا ہے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ آزاد عورتوں کو کینزوں کے مقابلے میں (محصنات) کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی آزادی حقیقت میں ایک پارہ پوری کے مانند ہے جو ان کے گرد موجود ہے اور کوئی دوسرا ان کی اجازت کے بغیر اس میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن واضح ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں شوہر دار عورتیں ہی مراد ہیں۔ یہ حکم صرف مسلمان عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر مذہب و ملت کی عورتوں کے بارے میں ہے یعنی ان سے شادی نہیں کر سکتے۔

اس حکم میں جو استثنا ہے وہ صرف ان غیر مسلم عورتوں کے بارے میں ہے جو جنگ میں مسلمانوں کی قیدی ہو جائیں، اسلام کی نظر



شائستہ سائنس آں آفرید گاری است ❖ کار و چنیں دل آویز نقشہ ز ماس و طسینی !  
وہ خالق ہی لائق تعریف ہے کہ جس نے پانی اور مٹی سے ایسا دل آویز نقش بنایا۔  
یہاں سجدہ خضوع اور انکساری کے معنی میں ہے۔

❖ ❖ ❖  
بہر حال ہم نے اس موقع پر آدم کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور "ہم نے کہا اے آدم! اس طرز عمل سے یہ تصدیق ہوگئی کہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ اس کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ تمہیں جنت سے باہر نہ نکال دے۔ جس سے تورنج و تکلیف میں مبتلا ہو جائیگا: (فقلنا یا آدم ان هذا عدو لك ولزوجك فلا ینخرجنكما من الجنة فتشقی)۔  
یہ بات واضح ہے کہ یہاں جنت "دار آخرت کی بہشت جاوداں کے معنی میں نہیں ہے کہ جو ایک نقطہ تکامل دار تھا ہے اور اس سے باہر نکلنا اور وہاں سے بازگشت ممکن نہیں ہے۔ یہ جنت جس کا یہاں ذکر ہے ایک باغ تھا کہ جس میں اس دنیا کے باغوں کی سب چیزیں موجود تھیں اور پردہ دگار کے لطف و کرم سے اس میں کوئی تکلیف اور زحمت نہیں تھی۔ لہذا خدا آدم کو اس خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ اگر اس امن و امان کی جگہ سے تم باہر نکل گئے تو تورنج و مشکل میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ "فتشقی" شقاوت کے مادہ سے ہے اور شقاوت کے معانی میں سے ایک درد و رنج بھی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا روئے سفین پہلے دونوں یعنی آدم و حوا کی طرف کیوں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ :

فلا ینخرجنكما من الجنة

شیطان تم دونوں کو جنت سے نہ نکال دے۔

لیکن باہر آنے کا نتیجہ مفرد کی صورت میں آدم کے بارے میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے :

فتشقی

اے آدم! تو درد و رنج میں جا پڑے گا۔

تفسیر کا یہ اختلاف ممکن ہے کہ اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ پہلے درجے میں درد و رنج آدم ہی کے حصے میں آئے تھے۔ یہاں تک کہ یہ انہی کی ذمہ داری تھی کہ اپنی بیوی کی مشکلات بھی اپنے کندھے پر اٹھائیں اور مردوں کی ذمہ داری شروع دن سے اسی طرح سے چلی آرہی ہے۔  
یہ بات ہے، کہ چونکہ شروع میں آدم سے ہی عہد و پیمانہ لیا گیا تھا، لہذا آخر میں بھی انہی سے خطاب کیا گیا ہے۔

❖ ❖ ❖  
اس کے بعد خدا، بہشت کے راحت و آرام اور اس سے باہر کے ماحول کے درد و رنج کی آدم کے لیے اس طرح تشریح کرتا ہے :

تو یہاں پر نہ تو بھوکا رہے گا۔ اور نہ ہی برہنہ ہوگا: (ان لك الاتجوع فیہا ولا تعری)۔

"نہ تو اس میں پیاسا رہے گا اور نہ ہی سورج کی تپتی ہوئی دھوپ تجھے تکلیف پہنچائے گی" (وانك لا تظم وافیہا ولا تصحی)۔

یہاں مفسرین کے لیے ایک سوال سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ پیاس کا حرارت آفتاب کے ساتھ اور بھوک کا برہنگی کے ساتھ کیوں ذکر کیا

گیا ہے حالانکہ عام طور پر پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ کرتے ہیں۔





کا مالک ہونے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد۔ یہ شاید ضمنی طور پر غیر مسافحین کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہو کہ سٹرازدواج میں تمہارا نصب العین اور مقصد صرف منی پیاس کی تسکین نہ ہو بلکہ شادی بیاہ اس بلند ترین مقصد کو زندہ کرنے کے لیے ہو جس کے لیے منی پیاس انسان میں رکھی گئی ہے اور وہ ہے بقائے نسل انسانی اور برائیوں سے اس کی حفاظت۔

## اسلام میں وقتی شادی

فما استمطعتہ بہ منہن فأتوهن اجورہن فزیضۃ

آیت کے اس حصے میں وقتی شادی کی طرف اشارہ ہے جسے اصطلاح میں "متعہ" کہتے ہیں۔ ارشادِ رب العزت ہے: تم جن عورتوں کے ساتھ متعہ کرتے ہو ان کا حق مہر ایک حق واجب کے طور پر ادا کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواجِ موقت کی اصل تشریح اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں میں تسلیم شدہ تھی۔ اس لیے تو خداوندِ عالم اس آیت میں حق مہر ادا کرنے کی وصیت فرما رہا ہے اور کیونکہ یہ ایک اہم تفسیری اور اجتماعی بحث ہے اس لیے ضروری ہے کہ کئی گوشوں اور پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

- ۱ - جو قرآن آیت مندرجہ بالا میں موجود ہیں وہ اس آیت کے وقتی شادی پر دلالت کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔
- ۲ - اس قسم کی شادیاں حضرت رسول اکرم کے عہد میں ہوتی تھیں اور رسول اللہ کے دور میں اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔
- ۳ - اس قسم کی ازدواج معاشرتی اور اجتماعی ضرورت بھی ہے۔
- ۴ - متعہ بہت سے مسائل کا حل بھی ہے۔

اب پہلی جہت کو لیتے ہیں اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ متعہ جس سے استمتعہم لیا گیا ہے۔ اسلام میں وقتی نکاح کے لیے ہے اور اصطلاح کے مطابق اس بارے میں حقیقتِ شرعیہ موجود ہے۔ اس امر کا گواہ یہ ہے کہ متعہ کا لفظ اسی معنی میں امادیش پیغمبر اور کھات صحابہ میں بار بار استعمال ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر اس لفظ کے مذکورہ معنی نہ لیے جائیں تو پھر اس کے لغوی معنی (نفع اٹھانا) مراد لیے جائیں گے تو اس صورت میں آیت کے معنی کا خلاصہ یہ ہوگا کہ اگر عقد دائمی والی عورتوں سے فائدہ اٹھاؤ تو ان کا حق مہر نہیں ادا کرو۔ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ حق مہر کی ادائیگی کی شرط عورتوں سے تمتع اور نفع حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تمام مہر بنا بر مشہور ہے یا کم از کم نصف حق مہر نکاح ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے۔

۱۰ غلاموں کی آزادی کے سلسلے میں اسلام نے جو زبردست لائبرل عمل اختیار کیا اس کے بارے میں متعلقہ آیات کے ذیل میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

۱۱ کنز العرفان، مجمع البیان، نور الثقلین، بردہ ان اور القدر کی جلد ۶ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۲ مشہور یا زیادہ مشہور یہ ہے کہ دائمی عقد کے بعد پورا مہر مرد پر واجب ہو جاتا ہے، اگرچہ دشول سے پہلے طلاق سے حق مہر آدھا واجب رہ جاتا ہے۔



نیز یہ کہ بزرگ اصحاب اور تابعین مثلاً عبداللہ ابن عباس اسلام کے مشہور عالم و مفسر، ابی بن کعب، جابر بن عبداللہ، عمران بن حصین سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ، سدھی اور دیگر بہت سے مفسرین اہل سنت اور تمام مفسرین اہل بیت مندرجہ بالا آیت سے نکاح موقت کے معنی سمجھے ہیں۔ یہاں تک امام فخر رازی جن کی شہرت یہ ہے کہ وہ شیعوں کے مسائل میں اشکال تراشی کرتے ہیں، اس آیت کے بارے میں تفصیلی بحث کے بعد کہتے ہیں کہ حکم مذکور ایک مدت کے بعد منسوخ ہو گیا تھا۔ چوتھے یہ کہ ائمہ اہل بیت نے جو اسرار وحی کو تمام لوگوں سے زیادہ جانتے تھے بالاتفاق آیت کے یہی معنی لیے ہیں ان سے اس سلسلے میں بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ ان میں سے ایک روایت حضرت امام جعفر صادق سے مروی ہے، آپ نے فرمایا:

المتعة نزل به القرآن وجرت بها السنة من رسول الله

متعد کا حکم قرآن میں نازل ہوا ہے۔ اور سنت رسول اس کے مطابق جاری ہوئی ہے

علاوہ ازیں حضرت امام باقر سے منقول ہے کہ آپ نے ابو بصیر سے متعد کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا:

نزلت في القرآن فما استمتعتم به منهن فأتوهن اجورهن فريضة.

قرآن مجید نے اس سلسلے میں گفتگو کی ہے چنانچہ فرماتا ہے، افعال استمتعتم کے

نیز امام محمد باقر سے منقول ہے کہ آپ نے متعد کے بارے میں عبداللہ بن عمیر شہی کے جواب میں فرمایا:

احلها الله في كتابه وعلى لسان نبيه فهو حلال الى يوم القيامة.

خداوند عالم نے اسے قرآن میں اپنے پیغمبر کی زبان پر حلال کیا اور وہ قیامت تک حلال ہے یہ

کیا یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے

تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے بلکہ ضرورت دین اس پر دلالت کرتی ہے کہ نکاح موقت آغاز اسلام میں جائز تھا۔ متعدد آیت کی متعد کے جواز پر دلالت اصل حکم کے مسلم ہونے پر کسی قسم کی نفی نہیں کرتی۔ کیونکہ مخالفین کا خیال ہے کہ اس حکم کا شرعی ہونا سنت سے ثابت ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان آغاز اسلام میں اس پر عمل کرتے تھے اور وہ مشہور جلد جو حضرت عمر سے منقول ہے:

متعتان كانتا على عهد رسول الله وانا محرمها ومعاقب عليهما متعة النساء ومتعة الحج

دو متعد پیغمبر کے عہد مبارک میں تھیں۔ جنہیں میں (عمر) حرام کرنا ہوں اور ان پر سزا بھی دوں گا مورتوں سے

متعد اور حج تمتع (جو ایک خاص قسم کا حج ہے)۔

۱۔ وہ لوگ جو پیغمبر کے زمانے کے بعد آئے اور آنحضرت کے زمانے کو نہ پا سکے۔

۲۔ نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۶۷، تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۳۶۰۔

۳۔ گذشتہ حوالہ۔

۴۔ تفسیر برہان، زیر بحث آیت کے ذیل میں (تو) برہے کہ یہ حدیث اور گذشتہ دونوں احادیث کافی میں ہیں۔

۵۔ کنز العرفان جلد ۲ صفحہ ۵۸، تفسیر قرطبی و طبری، سنن کبریٰ ذہبی کی کتاب نکاح۔

حرام مال کھانا اور کبھی وہ نسبتی پہلو رکھتے ہیں یعنی یہ ایسا کام ہوتا ہے کہ اگر ایک انسان سے سرزد ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ کبھی اس کی نسبت سے وہ ایک مطلوب اور شائستہ عمل ہوتا ہے لیکن اگر وہی کام کسی دوسرے سے سرزد ہو جائے تو اس کے مرتبہ و مقام کا لحاظ کرتے ہوئے وہ غیر مناسب ہوتا ہے۔

مثلاً ایک ہسپتال بنانے کے لیے لوگوں سے امداد کی اپیل کی جاتی ہے۔ ایک کارگیر آدمی اپنی ایک دن کی مزدوری کہ جو کبھی چند روپے سے زیادہ نہیں ہوتی دے دیتا ہے۔ یہ عمل اس کی نسبت سے ایثار اور اچھا عمل ہے، کامل طور پر مطلوب و پسندیدہ ہے لیکن اگر ایک دولت مند آدمی بھی اتنی ہی مقدار میں مدد کرے تو نہ صرف یہ کہ یہ عمل اُس کی طرف سے ناپسندیدہ ہے بلکہ ملامت و مذمت کے لائق ہے حالانکہ اصولی طور پر نہ صرف یہ کہ اُس نے کوئی حرام کام نہیں کیا ہے بلکہ ظاہراً ایک کارِ خیر میں مدد بھی کی ہے۔

یہ وہی بات ہے کہ جسے ہم یوں کہتے ہیں :

حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقْرَبِينَ

نیک لوگوں کی اچھائیاں مقربین کے لیے گناہ ہیں۔

نیز یہ وہی چیز ہے کہ جو ترک اولیٰ کے عنوان سے مشہور ہوئی ہے اور ہم اسے گناہِ نسبتی سے یاد کرتے ہیں کہ جو نہ تو گناہ ہے اور نہ ہی مقامِ عصمت کے خلاف ہے۔

اسلامی احادیث میں بھی کبھی کبھی مستہبات کی مخالفت پر معصیت کا اطلاق ہوا ہے۔ ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے روزانہ کی نافلہ نمازوں کے بارے میں فرمایا :

” یہ سب مستحب ہیں واجبہ نہیں ہیں ... اور جو شخص ان کو ترک کرے اُس نے

معصیت کی کیونکہ مستحب ہے کہ جب انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو اس کام کو جاری رکھنا چاہیے۔

اس موضوع اور حضرت آدم سے مربوط دوسرے مسائل اور ان کے جنت سے باہر نکلنے کے بارے میں چھٹی جلد سورہ اعراف کی آیہ ۱۹ سے بعد اور جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۳۰ تا ۲۸ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۳۔ قَالَ اهْبِطْ مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ فَاِمَّا يَاتِيَنَّكُمْ

مِّنِّي هُدًىٰ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۗ

۱۲۴۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهُ يَوْمَ

الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۗ

۱۲۵۔ قَالَ رَبِّ لَوْ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۗ





۱۲۶۔ قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۖ وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَىٰ ۝  
 ۱۲۷۔ وَكَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِآيَاتِ رَبِّهِ وَلَعَذَابُ  
 الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ ۝

### ترجمہ

- ۱۲۳۔ (خدا نے) فرمایا: تم دونوں (اور اسی طرح شیطان) اس (باغ) سے نیچے اترو۔ اس حالت میں —  
 کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو لیکن جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا  
 نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی رنج و تکلیف میں مبتلا ہوگا۔
- ۱۲۴۔ اور جو شخص میری یاد سے رُوگردانی کرے گا، وہ تنگ زندگی گزارے گا اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محسوس  
 کریں گے۔
- ۱۲۵۔ وہ کہے گا: پروردگارا: تو نے مجھے نابینا کیوں محسوس کیا؟ میں تو بینا تھا۔
- ۱۲۶۔ (خدا) فرمائے گا: یہ اس بنا پر ہے کہ میری آیات تیرے پاس پہنچیں اور تو نے انہیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج  
 تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔
- ۱۲۷۔ اور جو شخص اسراف کرے گا اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائے گا، ہم اُسے اسی قسم کی جزا دیں گے  
 اور آخرت کا عذاب زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے۔

### تفسیر

#### تنگ زندگی :

آدم کی توبہ اگرچہ قبول ہو گئی تھی مگر انہوں نے ایسا کام کیا تھا کہ اب پہلی جیسی حالت کی طرف لوٹنا ممکن نہیں تھا، لہذا خدا  
 نے "انہیں اور حوا کو حکم دیا کہ تم دونوں، اور اسی طرح شیطان بھی تمہارے ساتھ، جنت سے زمین پر اتر جاؤ" (قال اهبطوا  
 منها جميعا)۔

"در آنحالیکہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے" (بعضکم لبعض عدو)۔

لیکن میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ راہ سعادت اور نجات تمہارے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ پس جس وقت میری ہدایت تمہارے  
 پاس آئے تو تم میں سے جو کوئی اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ ہی بد نجات" (فاما یا تیسکم منہدی



فمن اتبع هدای فلا یضل ولا یشقی۔

اور اس غرض سے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے فرمان کو بھلا دیتے ہیں، ان کی پریشانی کا نتیجہ بھی واضح ہو جائے، مزید فرمایا گیا ہے:

اور جو شخص میری یاد سے زود گردانی کرے گا وہ تنگ اور سخت زندگی بسر کرے گا: (ومن اعرض عن ذکری فان له معیشتہ ضنکاً)۔

” اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محسوس کریں گے “ (ونحشره ۱ یوم القیامۃ اعفی)۔

وہاں وہ یہ ” عرض کرے گا کہ پروردگارا! تو نے مجھے نابینا کیوں محسوس کیا ہے جب کہ پہلے تو میں بینا تھا “ (قال رب لعلیٰ حشرتنی اعفی وقد کنت بصیراً)۔

خدا کی طرف سے اُسے فوراً یہ جواب دیا جائے گا: یہ اس بنا پر ہے کہ بہارنی آیات تیرے پاس آئی تھیں، تو تو نے انہیں فراموش کر دیا اور انہیں ملحوظ نظر نہ رکھا۔ لہذا آج کے دن تو بھی فراموش کر دیا جائے گا۔ (قال كذلك اتلنا فسیتها وكذلك الیوم تنسی)۔

اور تیری آنکھیں پروردگار کی نعمتوں اور اُس کے مقام قرب کو نہ دیکھ پائیں گی۔

اور آخر میں مجموعی نتیجہ نکالتے ہوئے آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ اسراف کریں گے اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم انہیں اسی قسم کی جزا دیں گے: (وکذلك نجزی من اسرف ولولولؤمن بآیات ربہ)۔

” اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے “

(ولعذاب الأخرۃ اشد والبقی)۔

## چند اہم نکات:

۱۔ یادِ خدا سے غفلت اور اس کے نتائج: کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے زندگی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اُسے بند دروازوں کا سامنا ہوتا ہے اور کبھی اس کے بالکل عکس وہ بند بھی جاتا ہے ہر طرف اپنے لیے دروازوں کو کھلا ہوا پاتا ہے۔ ہر کام کے لیے حالات سازگار ہوتے ہیں اور کوئی بندش اور کسی قسم کی گرہ اس کے سامنے نہیں ہوتی یا اس حالت کو وسعتِ زندگی کہتے ہیں جب کہ پہلی حالت کو ” ضیق “ اور زندگی کی تنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ” معیشت ضنک “ کی تعبیر کہ جو اوپر والی آیت میں آئی ہے، اُس سے بھی یہی مراد ہے۔

کبھی معیشت کی تنگی اس بنا پر نہیں ہوتی کہ اس کی آمدنی کم ہے، بسا اوقات اس کی آمدنی میں ریل پیل ہوتی ہے لیکن نخل،

۱ ” ضنک “ سختی اور تنگی کے معنی میں ہے، یہ لفظ ہمیشہ مفرد کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تشبیہ، جمع اور مؤنث

نہیں ہے۔



حرص اور لالچ زندگی کو اس پر تنگ کر دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ایسا شخص اس بات پر مائل نہیں ہوتا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہے اور دوسرے اس کی زندگی سے فائدہ اٹھائیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے بھی اسے کھلا نہیں رکھنا چاہتا۔  
علی علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق :

”وہ اپنی زندگی تو فقیروں کی طرح سے بسر کرتا ہے لیکن اُس کا حساب سرمایہ داروں کا سا ہوگا۔“

واقعاً انسان ان تنگیوں اور سختیوں میں کیوں گرفتار ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا اصلی عامل یادِ خدا سے رُودردانی ہے۔ یادِ خدا رُوح کے لیے آرام و سکون اور تقویٰ و شہادت کا باعث ہے اور اس کو بُلا دینا اضطراب، خوف اور پریشانی کا سبب ہے۔

جس وقت انسان خدا کو بُلا دینے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو بُلا دے تو وہ شہوات، خواہشات، حرص اور طمع میں غرق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حصہ میں تنگ زندگی ہی ہوگی۔ نہ اس میں کچھ قناعت ہوگی کہ جو اس کی رُوح کی تسکین کا موجب نہ اُس کی ممنونیت کی طرف توجہ ہوگی کہ جو اُسے رُوحانی غنا اور توغری عطا کر دے اور نہ ہی اس کا وہ اخلاق ہوگا کہ جو اُسے ظنیان شہوات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا سکے۔

اصولاً زندگی کی یہ تنگی زیادہ تر ممنونیت کی کمی اور رُوحانی استغنا کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مستقبل کے بارے میں مطمئن نہ ہونا، موجودہ امکانات و وسائل کے نابود ہو جانے کا خوف اور مادی دُنیا کے ساتھ انتہائی وابستگی بھی اس کا سبب بنتی ہے اور وہ شخص کہ جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اُس نے اس کی پاک ذات کے ساتھ دل لگایا ہے، وہ ان تمام پریشانیوں سے امان میں ہوتا ہے۔

البتہ یہاں تک تو بات ایک فرد سے متعلق تھی لیکن جب ہم ایسے معاشرے میں جائیں کہ جو یادِ خدا سے منہ پھیرے ہوئے ہو تو پھر مسئلہ اس سے بھی زیادہ وحشت ناک ہو جائے گا۔ وہ معاشرے کہ جو تعجب خیز اور حیرت انگیز صنعتی ترقی کے باوجود اور زندگی کے تمام وسائل فراہم ہونے کے باوجود شدید اضطراب اور پریشانی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں، وہ عجیب و غریب تنگی اور سختی میں گرفتار ہیں اور وہ اپنے آپ کو محسوس اور قیدی سمجھتے ہیں۔

سب ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ تمام روابط اور تعلقات ذاتی مفادات کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ جنگِ خوف و استوسازی کا بھاری بوجھ ان کے زیادہ تر اقتصادی وسائل کو نکل گیا ہے اور ان کی کریں اس بھاری بوجھ کے نیچے خم ہو گئی ہیں۔ قید خانے جھرموں سے بھرے پڑے ہیں ان کے اپنے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہر گھڑی اور ہر منٹ میں کئی قتل اور کئی ہونک جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ نشہ آور چیزوں اور فحاشی نے انہیں اپنا غلام اور قیدی بنا رکھا ہے۔ ان کے گھروں کے ماحول میں نہ نورِ محبت ہے اور نہ ہی نشاطِ بخش پیار کا رشتہ۔  
ہاں! یہ ہے ان کی سخت زندگی اور ”معیشتِ ضنک“

امریکہ (شیطانِ اعظم) کے ایک سابق صدر نکسن نے اپنی پہلی صدارتی تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اپنے گروا گرو ایسی زندگیاں دیکھ رہے ہیں کہ جو اندر سے خالی ہیں۔ ہم خود کو خوش



زنا کاری کے برابر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بہر حال وہ نکاح کے اصول و قواعد کی رو سے نکاح کی ایک شکل ہے۔  
اعتراض کی دوسری بات یہ ہے کہ متعدد اس امر کا سبب ہے کہ بعض ہوس پرست افراد اس قانون سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی آڑ میں طرح طرح کی برائیاں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیک اور عزت والے افراد کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتے اور صاحب حیثیت اور عزت دار عورتیں کبھی اس کے قریب نہیں آتیں۔

وہ کونسا قانون ہے جس سے لوگ غلط فائدہ حاصل نہیں کرتے تو پھر کیا ضروری ہے کہ کسی فطری قانون اور اجتماعی ضرورت کو اس لیے روک دیا جائے کہ اس سے غلط فائدہ اٹھایا جاتا ہے یا غلط فائدہ اٹھانے والوں کی روک تھام کی جائے۔

فرض کیجئے کہ ایک جماعت حج بیت اللہ سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مقدس سفر میں منشیات کا کاروبار کرتی ہے تو کی اس صورت میں لوگوں کو اس عظیم اسلامی کانفرنس میں شرکت سے منع کر دیا جائے گا یا غلط کاروبار کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ آج کے محترم افراد اس قانون اسلامی سے نفرت کرتے ہیں تو دراصل اس میں قانون کا عیب نہیں بلکہ قانون پر غلط عمل کرنے والوں کا قصور ہے یا اس سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس میں غلط فائدہ اٹھانے والوں کا قصور ہے۔ اگر آپ کے معاشرے میں نکاح موقت پر صحیح خطوط اور درست صورت میں عمل کیا جائے اور اسلامی حکومت مخصوص قوانین و ضوابط کے تحت اسے درست طور پر عمل میں لائے تو غلط فائدہ اٹھانے والوں کی بھی روک تھام ہو سکے گی یوں محترم افراد بھی (ضرورت اجتماعی کے اجلا میں) نفرت و حسدت نہیں کریں گے۔

بچتے ہیں کہ متعدد کی وجہ سے لا وارث بچتے، نابالغ اولاد کی طرح معاشرے میں رہتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جو کچھ اس سے پہلے تحریر کر چکے ہیں اس سے اس سوال کا جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نابالغ اولاد قانون کی نظر میں مال باپ میں سے کسی سے بھی وابستہ نہیں ہے۔ جبکہ متعدد کی اولاد اور عقد دائمی کی اولاد میں میراث اور دیگر حقوق اجتماعی کی رو سے ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ گویا حقیقت حال سے بے خبری اشکال اور شک و شبہ کا سرچشمہ ہے۔

## رسل اور نکاح موقت

اس گفتگو کے آخر میں ایک مفید بات کی یاد دہانی ضروری معلوم ہوتی ہے جسے مشہور انگریزی دانشور برٹرنڈ رسل نے اپنی کتاب "زنا شوقی اور اخلاق" میں آزمائشی شادی کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ وہ نوجوانوں کا محاکمہ کرنے والے جج "بن بی لینڈ سی" کی تجویز دستاورد شادی یا آزمائشی شادی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:

جج صاحب موصوف کی تجویز کے مطابق نوجوانوں کو یہ اختیار ملنا چاہیے کہ وہ ایک نئی قسم کی شادی کر سکیں۔ جو عام شادی (نکاح دائمی) سے تین امور میں مختلف ہو۔

۱۔ یہ برٹرنڈ رسل کی کتاب کے فارسی ترجمے کا نام ہے۔ (مترجم)

- ۱ - طرفین کا مقصد صاحب اولاد ہونا نہ ہو اس سلسلے میں ضروری ہے کہ انہیں عمل روکنے کے طریقے سکھائے جائیں۔
  - ۲ - ان کی علیحدگی باسانی ہو سکے۔
  - ۳ - طلاق کے بعد عورت کسی قسم کے نان و نفقہ کا حق نہ رکھتی ہو۔
- رسل حج لیندسی کا مقصد بیان کرنے کے بعد کہتا ہے:

میرا خیال ہے کہ اگر اس قسم کی شادی کو قانونی طور پر درست مان لیا جائے تو بہت سے نوجوان خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کے طالب علم وقتی نکاح پر تیار ہو جائیں گے اور ایک وقتی مشترک زندگی میں قدم رکھیں گے۔ ایسی زندگی جو اپنی جگہیں آزادی لیے ہوئے ہے۔ اس طرح بہت سی معاشرے کی خرابیوں، لڑائی جھگڑوں، خصوصاً جنسی بے راہ روی سے نجات مل جائے گی۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ نکاح موقت کے بارے میں مندرجہ بالا تجویز کئی لحاظ سے اسلامی حکم کی طرح ہے لیکن جو شرطیں اور خصوصیتیں اسلام نے نکاح موقت کے لیے تجویز کی ہیں وہ کئی لحاظ سے زیادہ واضح اور مکمل ہیں۔ اسلامی نکاح موقت میں اولاد نہ ہونے دینا ممنوع نہیں ہے اور فریقین کا ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی آسان ہے۔ جدائی کے بعد نان و نفقہ بھی واجب نہیں ہے۔

ولا جناح علیکم فیما تراءضیتم بہ من بعد الفریضۃ

آیت کے آخر میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اگر طرفین عقد ایک دوسرے کی رضامندی کے ساتھ حق مہر کی مقدار میں کمی بیشی کریں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس لیے کہ مہر ایک ایسا قرض ہے جو طرفین کی مرضی سے تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں عقد موقت و دائمی میں کوئی فرق نہیں ہے اگرچہ ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ یہ آیت نکاح موقت کے بارے میں ہے۔

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں ایک اور بھی احتمال ہے اور وہ یہ کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ نکاح موقت کے ختم ہونے پر طرفین مدت نکاح اور اس طرح حق مہر کے اضافے کے متعلق آپس میں موافقت کر لیں۔ نکاح موقت مدت مقررہ ختم ہونے سے پہلے بھی قابل تجدید ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ طے کر لیتے ہیں کہ معین شدہ مدت نکاح اور مقررہ حق مہر دونوں میں بعد ضرورت اضافہ کر دیا جائے۔ روایات اہل بیت میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ان اللہ کان علیہم احکیمًا

جن احکام کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ ایسے ہیں جو نفع بشر کے لیے خیر و سعادت کے حامل ہیں کیونکہ پروردگار عالم بندوں کے مصالح سے آگاہ اور اجرائے قانون میں حکیم ہے۔

۲۵ - وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ یَنْکِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ  
فَمِنْ مَّا مَلَکَتْ أَیْمَانُكُمْ مِنْ فِتْنَتِکُمْ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ

بِإِيمَانِكُمْ بَعْضُكُم مِّنْ بَعْضٍ ۖ فَإِنِ كُفِرْتُمْ بِأَذْنِ أَهْلِيهِنَّ وَ  
 اتُّوهِنَّ أَجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرِ مُسَفِّحَاتٍ وَلَا  
 مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ ۚ فَإِذَا أُحْصِنَ فَإِنَّ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ  
 نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ۗ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ  
 مِنكُمْ ۗ وَأَن تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۵ اور جو لوگ (آزاد) پاک دامن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ کینزوں میں سے پاک دامن ایماندار  
 عورتوں سے جو ان کی ملکیت میں ہیں نکاح کریں خدا تمہارے ایمان سے آگاہ ہے اور تم سب ایک ہی پیکر کے مختلف  
 اجزا ہو۔ اور ان (کینزوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر دو۔ لیکن ان کا حق مہراں ہی کو اس شرط کے ساتھ  
 دو کہ وہ پاک دامن رہیں۔ نہ یہ کہ وہ کھلے بندوں زنا کرتی پھریں اور نہ ڈھکے چھپے یا رہنا میں اور جب وہ سہاگن ہوں اور  
 پھر عفت کے منافی کام کریں تو ان کے لیے آزاد عورتوں سے ادھی سزا ہوگی۔ (کینزوں سے نکاح کرنے کی) یہ اجازت  
 صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو (جنسی تقاضوں کے حوالے سے) سخت تنگ ہوں۔ اگر صبر و تحمل سے کام لو تو تمہارے  
 لیے زیادہ بہتر ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

کینزوں سے نکاح

ومن لم يستطع منكم طولا ان ينكح .....

گذشتہ آیات میں نکاح کے متعلق مباحث کے بعد یہ آیت کینزوں سے نکاح کرنے کی شرطیں بیان کرتی ہے۔ سب سے پہلے  
 کہتی ہے: جو لوگ آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کے لیے مالی قدرت نہیں رکھتے وہ کینزوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔ جن کا حق مہر اور عام  
 طور پر باقی مصارف ان کی نسبت زیادہ ہلکے اور آسان ہوتے ہیں۔ البتہ کینزوں سے نکاح سے مراد یہ نہیں ہے کہ کینز کا مالک اپنی کینز

کے لفظ طول (بروزن نوع) اصل میں مادہ طول (بروزن نور) سے ہے اور یہ توانائی، رسائی، مالی وسائل وغیرہ کے معنی میں آیا ہے۔



سے نکاح کرے کیونکہ وہ تو ان شرطوں کے مطابق جو فقہ کی کتابوں میں ہیں اپنی کینز کو ایک بیوی کی طرح رکھ سکتا ہے۔ بنا بریں اس سے مراد مالک کے علاوہ دیگر افراد کا کسی کینز سے نکاح کرنا ہے۔

ضمنی طور پر لفظ ”مومنات“ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کینز کا یقینی طور پر مسلمان ہونا ضروری ہے تاکہ اس سے نکاح کر سکے۔ اس بنا پر اہل کتاب کینزوں سے نکاح نہیں کر سکتا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ان کینزوں کے لیے ”فتنیات“ کا لفظ استعمال کرتا ہے فتیات جمع ہے اور عام طور پر یہ لفظ قابل احترام عورتوں اور زیادہ تر نوجوان لڑکیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم بایمانکم

یہ جہاں بتاتا ہے کہ تم ان کے ایمان کی تثنیص کے لیے ان کی ظاہری حالات اور اعتقاد کے پابند سمجھ باقی رہا ان کا باطن اور ان کے دل کے بھید تو خدا تمہارے ایمان و عقیدہ سے زیادہ آگاہ ہے۔

بعضکم من بعض

چونکہ بعض لوگ کینزوں سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے قرآن فرماتا ہے کہ تم سب ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہو اور تم ایک دوسرے سے ہو۔ اس بنا پر تمہیں کینزوں سے نکاح کرنے میں کراہت نہیں کرنا چاہیے جو انسانی نقطہ نظر سے مختلف نہیں ہیں اور معنوی قدر و قیمت کی رو سے بھی دوسروں کی طرح ان کی قدر و منزلت تقویٰ پر ہینز گاری سے وابستہ ہے اور تم ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہو۔

فانکحوا من باذن اہلہن

لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ نکاح مالک کی اجازت سے ہو۔ کیونکہ یہ اس کی اجازت کے بغیر باطل ہے اور مالک کو اہل سے تعبیر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مالکوں کو چاہیے کہ وہ کینزوں کے ساتھ جنس تجارت اور مال و دولت کا سلوک نہ کریں بلکہ ایک خاندان کے سرپرست کی طرح ان کے ساتھ اولاد اور اہل و عیال جیسا مکمل انسانی برتاؤ کریں۔

وانتوہن اجورہن بالمعروف

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے مناسب حق مہر مقرر کیا جائے اور وہ خود ان ہی کو دیا جائے یعنی مہر کی مالک خود لڑکیاں ہوں گی۔ اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ اس آیت میں ایک لفظ مخدوف ہے۔ ان کے خیال میں اصل میں یوں ہے: **انتمو مالکھن اجورہن** (ان کا مہر ان کے آقاؤں کو دو) لیکن یہ تفسیر ظاہر آیت کے مطابق نہیں ہے۔ اگرچہ بعض روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔ ضمناً آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غلام بھی ان اموال کے مالک ہو سکتے ہیں جو جائز طریقوں سے ان کے ہاتھ آئے۔ اور ”بالمعروف“ یعنی اچھائی کے ساتھ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حق مہر مقرر کرنے میں ان پر کوئی ظلم و ستم نہ کیا جائے بلکہ ان کا واقعی حق یا معمول کے مطابق ادا کیا جائے۔

محصنات غیر مصافحات ولا متخذات اخدان

اس نکاح کی ایک اور شرط یہ ہے کہ ایسی کینزوں کا انتخاب کیا جائے جو منافیِ عفت و پاک دامنی کوئی حرکت ظاہر نہ بظاہر یا



ڈھکے چھپے یا رہنا کر زکریٰ و لا متخذات اخدان ۱۔ ۷

ممکن ہے اس موقع پر یہ سوال پیدا ہو کہ "غیر سافیات" کی تعبیر کے ذریعے زنا سے منع کرنے کے بعد پوشیدہ دوست بنانے (اخدان) سے منع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس امر کے پیش نظر کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف کھلے بندوں زنا بُرا فعل ہے لیکن ڈھکے چھپے یا رہی لگا کر یہ کارروائی بُری نہیں ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے ہر دو قسم کی وضاحت کیوں فرمائی ہے۔

فاذا احصن فان اتین بفاحشة فعليهن نصف ما على المحصنات من العذاب

اس جملے میں ان احکام کی مناسبت سے جو کیزوں کے ساتھ شادی کرنے اور ان کے حقوق کی حمایت کے بارے میں ہیں درمیان میں ان کی سزا کے بارے میں بھی بحث آگئی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ پاکدامنی اور عفت کی راہ سے ہٹیں اور بدکاری کریں تو آزاد عورتوں کی نسبت انہیں آدھی سزا دی جائے یعنی انہیں پچاس کوڑے مارے جائیں۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ قرآن فرماتا ہے "اذا احصن" یعنی اگر وہ محصنہ ہوں تو ان کے لیے یہ سزا ہوگی۔

### "محصنہ" سے یہاں کیا مراد ہے

مفسرین نے اس کے بارے میں کئی احتمال رکھے ہیں۔ بعض نے مشہور فقہی اصطلاح اور سابقہ آیت کے مطابق شوہر دار عورت کے معنی میں اور بعض نے اسے مسلمان کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ لفظ صرف اس جملے میں دو مرتبہ آیا ہے اس لیے دونوں جگہ ایک ہی معنی میں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف سہاگنوں کی سزا سنگساری ہے نہ کہ تازیانے۔ غرض اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی تفسیر جس میں محصنہ کے معنی شوہر دار عورت بیان کیا گیا ہے قابل قبول نہیں ہے۔ اسی طرح دوسری تفسیر یعنی مسلمان ہونا اس پر بھی کوئی شاہد نہیں ہے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ لفظ محصنات چونکہ قرآن مجید میں زیادہ تر پاک دامن عورتوں کے معنی میں آیا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق یہ ہے کہ زیر نظر آیت اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ یعنی وہ لونڈیاں جو مالکوں کی سختی کے ڈر سے جم فریضی کرتی تھیں انہیں تو سزا معاف ہے لیکن وہ کیزی جو اس جان لیوا سختی سے دوچار نہیں ہیں اور پاکدامنی کی زندگی بسر کر سکتی ہیں اگر وہ منافی عفت کام کریں تو انہیں آزاد عورتوں کی طرح سزا دی جائے گی۔ لیکن ان کی سزا آزاد عورتوں کی نسبت آدھی ہوگی۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ

عنت (بروزن سند) اصل میں ہڈی کے دوبارہ ٹوٹنے کو کہتے ہیں یعنی ہڈی کا درست ہو کر زخم ملنے کے بعد نئے سرے سے کسی حادثے کی وجہ سے ٹوٹ جانا۔ واضح ہے کہ اس قسم کا ٹوٹنا انتہائی دردناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے اسی لیے "عنت" کا لفظ روح فرسا

۷ اخدان خدان کی جمع ہے۔ یہ اصل میں دوست اور ساتھی کے معنی میں ہے۔ لیکن عام طور پر ایسے افراد کے لیے بولا جاتا ہے جو منافع جنس کے ساتھ پوشیدہ اور ناجائز تعلق رکھتے ہوں۔ یاد رکھیے کہ لفظ خدان قرآن میں مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

مشکلوں اور دکھ تکلیف پہنچانے والے کاموں کے لیے استعمال ہوتا ہے قرآن مجید مندرجہ بالا جملے میں فرماتا ہے: کینزوں کے ساتھ شادی ان لوگوں کے لیے ہے جو جنسی خواہش کی وجہ سے بہت تنگ ہوں اور آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے ہوں اس بنا پر اس قسم کی شادی دوسرے افراد کے لیے جائز نہیں ہے لیکن ہے کہ اس حکم کا فلسفہ یہ ہو کہ اس زمانے میں خصوصاً لائونڈریوں کی تربیت برے اور گئے گزرے حالات میں ایسی ہوتی تھی کہ وہ طبعاً اخلاقی، روحانی اور معاشرتی نقائص میں مبتلا تھیں اور مسلم ہے کہ جو بچے اس شادی سے پیدا ہوتے، ان پر مال کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا۔ اسی بنا پر اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے ایک زبردست تدبیر کی اور عمدہ پروگرام پیش کیا تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے غلام بن کر نہ رہ جائیں نیز ضمنی طور پر غلاموں اور کینزوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شادی کر سکیں۔ یقیناً یہ بات اس امر کے منافی نہیں ہے کہ بعض کینزیں اخلاقی اور تربیتی لحاظ سے مخصوص استثنائی کیفیت رکھتی تھیں۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ کینزوں کی اکثریت کے بارے میں تھا۔ اب اگر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ بعض بزرگان دین کی مائیں کینزی تھیں تو استثنائی لحاظ ہی سے متعلق تھیں۔ البتہ یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جو کچھ کینزوں کے بارے میں ہے، ضرورت کے بغیر ممنوع ہے وہ ان سے شادی اور نکاح ہے نہ کہ ملکیت کے اعتبار سے جنسی میل ملاپ۔

وان تصبروا خیر لکم

جہاں تک تمہاری طاقت میں ہو کہ تمہارا دامن گناہ سے آلودہ نہ ہو، اپنے آپ کو کینزوں کے ساتھ شادی بیاہ سے بچانا

فائدہ مند ہے۔

و اللہ شفیق رحیم

اور خدا ان برے کاموں کو جو تم گزرے ہوئے زمانے میں جہالت اور بے خبری کی وجہ سے کرتے رہے ہو بخشنے والا اور

مہربان ہے۔

۲۶- یُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

۲۷- وَاللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهْوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ۝

۲۸- يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخَلَقَ الْإِنْسَانَ ضَعِيفًا ۝

ترجمہ

۲۶ خدا چاہتا ہے (کہ ان احکام کے ذریعے نیکی اور خوش قسمتی کی راہیں) تمہارے لیے واضح کرے اور گزرے ہوئے لوگوں



کے (صحیح) طریقوں اور سنتوں کی طرف تمہاری ہدایت و رہبری کرے اور تمہیں گناہوں سے پاک کرے اور خدا انا و حکیم ہے۔

۲۶ اور خدا چاہتا ہے کہ تمہیں بخش دے (اور گناہوں سے پاک کر دے) لیکن جو لوگ شہوت کے غلام ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بالکل منحرف ہو جاؤ۔

۲۸ خدا چاہتا ہے (کنیزوں سے نکاح اور اسی قسم کے دوسرے احکامات کے ذریعے) تمہارے لیے کام کو آسان کر دے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے (اور اپنی فطرت و سرشت کے پیش نظر مثبت جواب دہی کا محتاج ہے)۔

تفسیر

یہ پابندیاں کس بنا پر ہیں

یرید اللہ لیبین لکم ویهدیکم مسان الذین من قبلکم ویتوب علیکم  
ان شروط و قیود اور مختلف احکام کے بعد جو گذشتہ آیتوں میں نکاح کے متعلق اشارہ بیان ہوئے ہیں ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ ان تمام قانونی قید و بند اور حدود کا کیا مقصد ہے کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ان امور میں انسان کو کھلی آزادی دے دی جاتی تاکہ جس طرح بعض دنیا پرست ہر ذریعے اور ہر طریقے سے لذت اور فائدہ اٹھاتے ہیں دوسرے لوگ بھی اس سے بہرہ ور ہوتے۔ مندرجہ بالا آیت حقیقت میں ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتاتی ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ان مقررات اور احکام کے ذریعے تمہارے لیے حقائق واضح کرے اور تمہاری رہبری ایسے راستوں کی طرف کرے جن میں تمہارے لیے فائدہ ہی فائدہ ہے اور دیکھو تمہارے لیے ہی یہ پروگرام نہیں ہے بلکہ گذشتہ پاکیزہ قومیں بھی اس قسم کی سنتیں (قواعد و ضوابط) رکھتی تھیں۔ علاوہ ازیں خدا چاہتا ہے کہ تمہیں بخش دے اور اس کی نعمتیں جو تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے تم پر بند ہو گئی ہیں دوبارہ تمہیں عنایت فرمائے اور یہ اس صورت میں ہے کہ قبل از اسلام زمانہ جاہلیت میں نافرمانی کے جو راستے تم نے اختیار کر رکھے تھے ان سے پلٹ آؤ۔

واللہ علیہ حکیم

خدا اپنے احکام کے اسرار و رموز کو جانتا ہے اس نے اپنی حکمت سے تمہارے لیے احکام کو نافذ کیا ہے۔

واللہ یرید ان یتوب علیکم و یرید الذین یتبعون الشہوات ان تمیلوا میلا عظیما

از سر نو تاکید کرتا ہے کہ خداوند عالم ان احکام کے ذریعے یہ چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اور برکتیں جو تمہارے شہوتوں میں آلودہ

ہونے کی وجہ سے تم سے چھین گئی تھیں، ان سے دوبارہ تمہیں نوازے لیکن وہ شہوت پرست جوگن ہوں کی موجودگی میں غرق ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم نیکی کے راستے سے بالکل منہ موڑ لو اور ان کی طرح سر سے لے کر پاؤں تک گناہوں میں ڈوب جاؤ۔ اب تم خود فیصلہ کرو کہ وہ پابندیاں جو تمہاری نیکی اور بلند می درجات کے لیے ہیں تمہارے لیے بہتر ہیں یا یہ آزادی اور شتر بے مہار ہونا جس میں شکست، تنزل اور بدبختی ہے۔

یہ آیات حقیقت میں ان افراد کو جو جہاد سے زمانے میں بھی دینی قوانین خصوصاً جنسی مسائل کے سلسلے میں امتزاعات کرتے ہیں جواب دیتی ہیں کہ ان بے قید و بند آزادیوں کی حقیقت سراب کی سی ہے اور ان کا نتیجہ انسانیت کی تکمیل و ترقی، کامیابی اور خوش بختی کی راہ سے روگردانی، بے راہروی میں گرفتاری اور ہلاکت کے گڑھوں میں گرنے کے مترادف ہے۔ جن کے بہت سے نمونے ہم اپنی آنکھوں سے خاندانوں کی تباہی، مختلف قسم کے جنسی جرائم، نامہائز اولاد، جنسی بیماریوں اور نفسیاتی پریشانیوں کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

یرید اللہ ان یخفف عنکم وخلق الانسان ضعیفاً

یہ آیت اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پہلا حکم مقررہ شرطوں کے ماتحت کمیزوں سے نکاح کی آزادی کے بارے میں ایک قسم کی آسانی اور کشادگی کے لیے تھا کیونکہ انسان اصولی طور پر ایک کمزور مخلوق ہے جس پر خواہشات نفسانی شہوانی کے طوفان ہر طرف سے حملہ کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کو ان کے مقابلے کے لیے ایسے جائز شرعی طریقے بتائے جن سے انسان ان خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے اور اپنے آپ کو غلط راستوں پر پلنے سے محفوظ رکھ سکے۔

۲۹۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ○

۳۰۔ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عَدُوًّا وَآنَا وَظَلَمًا فَسَوْفَ نُنْصِيهِ نَارًا هَاطًا وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ○

ترجمہ

۲۹ اے ایمان والو ایک دوسرے کے مال باطل (اور ناجائز طریقے) سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ ایسی تجارت ہو جو تمہاری رضامندی سے کی جائے اور خود کشی نہ کرو۔ خدا تم پر مہربان ہے۔

۳۰ اور جو شخص اس کام کو از روئے ظلم کرے تو اُسے ہم بہت جلد آگ میں ڈالیں گے اور یہ کام خداوند عالم کے لیے آسان ہے۔

## تفسیر

### معاشرے کی سلامتی کا دار و مدار اقتصادی سلامتی پر ہے

یا ایہا الذین آمنوا لاتأکلوا أموالکم ببینکم بالباطل

درحقیقت یہ آیت قوانین اسلام کی بنیاد کو مالی معاملات اور مبادلات سے تعلق رکھنے والے مسائل سے مربوط کرتی ہے۔ اسی وجہ سے فقہائے اسلام میں دین اور معاملات کے تمام ابواب میں اسی سے استدلال کرتے ہیں۔ آیت ایماندار لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے: ایک دوسرے کے اموال غلط اور باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔ یعنی دوسروں کے مال میں ہر قسم کا تصرف جو منطقی اور عقلی جواز کے بغیر ممنوع قرار دیا گیا ہے اور ان سب کو ایک لفظ "باطل" کے تحت بیان کر دیا گیا ہے۔ جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے ہم جانتے ہیں کہ باطل حق کے مقابلے میں ہے اور وہ ہر اس چیز کو جو بڑی، بے مقصد اور بے بنیاد ہو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی مندرجہ بالا عبارت کے مشابہ عبارتوں کے ذریعے اس امر کی تاکید کی گئی ہے مثلاً قوم پرہیزگار کی مذمت اور ان کی بدکرداری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(نساء ۱۲۱)

واکلہم أموال الناس بالباطل

وہ لوگوں کے مال میں جواز کے بغیر غلط تصرف کرتے تھے۔

اور سورۃ بقرہ کی آیت ۱۸۸ میں ہے:

لاتأکلوا أموالکم ببینکم بالباطل

اس میں بھی لوگوں کو بلا دہ اور بے بنیاد دعوؤں کے ذریعے مال ہڑپ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اس بنا پر ہر قسم کی زیادتی، دھوکا، فریب، سودی لین دین اور ایسے معاملے جن کی حدیں مکمل طور سے معین و مقرر نہیں ہیں، ایسی اجناس کی خرید و فروخت جن میں منطقی اور عقلی طور پر فائدہ نہیں ہے اور فساد و گناہ کے وسائل کی خرید و فروخت سب کے سب اسی کلی قانون کے تحت ہیں۔ اگرچہ بہت سی روایتوں میں لفظ باطل کی تفسیر قمار بازی اور سود وغیرہ کی گئی ہے لیکن یہ دراصل ان چیزوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو واضح طور پر اس لفظ میں شامل ہیں نیز کہ باطل انہی تک محدود ہے۔ شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ اکل (کھانا) سے تعبیر کرنا ہر قسم کے تصرف کی طرف اشارہ ہے۔ چاہے وہ معمول کے مطابق کھانے سے جو یا پہننے اور رہائش وغیرہ سے اور یہی معنی عربی زبان کے علاوہ آجکل کی فارسی میں بھی مکمل طور پر رائج ہے۔

الا ان تکون تجارة عن تراض

یہ جگہ گذشتہ قانون کلی کی استثنائی صورت بیان کر رہا ہے لیکن اصطلاحی طور پر استثنائے منقطع ہے۔ یعنی جو کچھ اس جملے



میں آیا ہے وہ پہلے قانون میں شروع ہی سے داخل نہ تھا اور صرف ایک تاکید اور یاد دہانی کے طور پر ذکر ہوا ہے اور یہ اپنے مقام پر خود ایک کلی قانون ہے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: مگر یہ کہ تمہارا دوسروں کے مالوں میں تصرف عدل انصاف کے مطابق ہو جو ظفرین کی باہمی رضا و رغبت سے ہو اس لیے اس بیان کے مطابق تمام مالی مبادلات اور لوگوں میں مروج مختلف طرح کی تجارت اگر ظفرین کی رضامندی سے ہو اور عقل و منطق کے مطابق ہو تو وہ اسلام میں جائز ہے۔ مگر وہ امور اس میں داخل نہیں ہیں جن سے بر بنائے مصلحت صریحاً ممانعت کی گئی ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا

اس کے بعد آیت کے ذیل میں لوگوں کو قتل نفس سے منع کیا گیا ہے۔ اگر قرآن کا یہ مجرمانہ رکھا جائے: ان الله كان بكم رحيماً یعنی خداوند عالم تمہاری نسبت زیادہ مہربان ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا جو خودکشی سے نہی کے بارے میں ہے۔ یعنی مہربان خدا نہ صرف اس پر راضی نہیں کر کوئی دوسرا تمہیں قتل کرے بلکہ خود تمہیں بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ تم خود سے اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ روایات اہل بیت میں بھی زیر نظر آیت کا مفہوم خودکشی سے امتناع ہی بیان کیا گیا ہے۔ اب یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ قتل نفس اور لوگوں کے مال میں باطل و ناحق تصرف میں کیا تعلق ہے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے اور حقیقت میں قرآن نے ان دونوں احکام کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر کر کے ایک اہم اجتماعی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر لوگوں کے مالی مسائل صحیح بنیادوں پر استوار نہ ہوں اور معاشرے کے اقتصادی معاملات خوشگوار طریقے سے آگے نہ بڑھیں تو ایک دوسرے کے اموال میں ناحق تصرف کریں تو سماج ایک قسم کی خودکشی میں گرفتار ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کہ شخصی خودکشی میں اضافہ ہوگا اجتماعی اور معاشرتی خودکشی بھی اس کے ضمنی اثرات میں سے ہوگی۔ اس سے دور حاضر کے مختلف مسائل میں آنے والے حوادث و انقلاب اس حقیقت کے شاہد عادل ہیں۔ چونکہ خداوند عالم اپنے بندوں پر مہربان ہے لہذا انہیں خطرے سے خبردار کرتا ہے تاکہ وہ ہوشیار اور چوکنے رہیں۔ کہیں غلط قسم کے مبادلات مال اور غیر صحیح اقتصادی نظام ان کے معاشرے کو نیست و نابود کر کے نہ رکھ دے۔

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عَدُوًّا وَإِنَّا وَظَلَمًا فَسَوْفَ نَصَلِيهِ نَا

اور جو شخص اس حکم کو نہ مانے اور لوگوں کا ناحق مال لے کر لگا بھکار ہو یا خودکشی کی طرف بڑھے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس جہان کی آگ میں جلے گا بلکہ وہ قبر و غضب پروردگار کی آگ میں بھی جلے گا اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے (وكان ذلك على الله يسيراً)

بقیہ ماحشیہ از صفحہ سابقہ

استثناہ منقطع اکثر و بیشتر حکم عام کی عمومیت کی تاکید کے لیے آتا ہے اور یہی معنی آیت مندرجہ بالا پر صادق آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس حقیقت کا بھی پتہ دیتا ہے کہ تصرفات باطل کی حرمت کے باوجود زندگی کی راہیں تمہارے لیے بند نہیں ہیں اور تم جائز تجارت کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہو۔

تفسیر مجمع البیان آیہ مذکور کے ذیل میں، فوراً نقلین جلد اول صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ فرمائیے۔

صلی (بر وزن سرو) اصل میں آگ کے قریب جانے کے معنی میں ہے۔ تاہم آگ سے گرم ہونے، جھلسنے اور جلنے کو بھی صلی کہتے ہیں زیر بحث آیت میں یہ لفظ آگ میں داخل ہونے اور جلنے کے معنی میں ہے۔

۳۱۔ اِنْ تَجْتَنِبُوا كَبِيرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نَكْفِرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ  
مُدْخَلًا كَرِيمًا

ترجمہ

۳۱ اگر تم ان گناہانِ کبیرہ سے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے گناہوں کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں نہایت عمدہ اور اچھی جگہ عنایت فرمائیں گے۔

تفسیر

گناہانِ کبیرہ و صغیرہ

ان تجتنبوا کبائر ما تنهون عنه نکفر عنکم سیئاتکم

یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ اگر تم گناہانِ کبیرہ کو جن کی مانعت کی جا چکی ہے چھوڑ دو، تو ہم تمہارے سیئات کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں بخش دیں گے اور تمہیں جنت عطا کریں گے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام قرآن نے کبیرہ رکھا ہے اور دوسری قسم کا "سینئۃ" اور سورہ نجم کی آیت ۳۲ میں سینئۃ کی بجائے "لعمۃ" فرمایا ہے اور سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں کبیرہ کے مقابلے میں صغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جہاں ارشاد ہوتا ہے:

لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاها

یہ اعمال نامہ کسی چھوٹے بڑے گناہ کو نہ جھولے گا اور اُسے ضرور شمار کرے گا۔

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کی جانی پہچانی دو قسمیں ہیں کہ جن کو کبھی کبیرہ اور صغیرہ سے اور کبھی کبیرہ اور صغیرہ سے اور کبھی کبیرہ اور صغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ گناہ صغیرہ و کبیرہ کے تعین کے لیے کیا ضابطہ اور میزان ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں نسبتی امور ہیں یعنی جب دو گناہوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جائے تو جس کی اہمیت زیادہ ہے وہ کبیرہ ہے اور جس کی کم حیثیت ہے وہ صغیرہ ہے۔ اس لیے ہر گناہ اپنے سے زیادہ بڑے گناہ کی نسبت سے گناہ صغیرہ ہوگا اور اپنے سے چھوٹے گناہ کی نسبت کبیرہ ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنی کسی طرح بھی زیر نظر آیت کے مطابق نہیں کیونکہ آیت نے

۱۔ لم ۱۔ وزن قسم، چھوٹے اور کم اہمیت والے کام کو کہتے ہیں۔

۲۔ ظہری مرحوم نے مجمع البیان میں اس عقیدے کی نسبت شیخ علماء کی طرف دی ہے حالانکہ انہیں ہے کیونکہ ہمارے بہت سے علماء دوسرا نظریہ رکھتے ہیں جس کی ہم تردید کریں گے۔

دو گروہوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے مد مقابل قرار دیا ہے اور ایک سے پرہیز کو دوسرے کی بخشش کا ذریعہ قرار دیا ہے (غور فرمائیے گا)۔

لیکن اگر کبیرہ کے لغوی معنی کو دیکھیں تو ہر وہ گناہ کبیرہ ہو گا جو اسلام کی نظر میں بڑا اور زیادہ اہم ہے اور اس کی اہمیت کی نشانی یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید نے صرف اس کی ممانعت پر تقاضات نہ کی ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عذاب جہنم کی دھمکی بھی ہو مثلاً قتل زنا، سود خوری وغیرہ۔ اسی لیے روایات اہل بیتؑ میں ہے:

الکبائر التي اوجب الله عز وجل عليها النار

گناہان کبیرہ وہ ہیں جن پر خداوند عالم نے آگ کی سزا مقرر فرمائی ہے

اس حدیث کا مضمون حضرت امام باقرؑ حضرت امام جعفر صادقؑ اور امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے۔ گناہان کبیرہ کو سمجھنے اور مذکورہ ضابطے کی روشنی میں انہیں پہچاننے کے بعد کام آسان ہو جاتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ روایات میں کبائر کی تعداد سات اور بعض میں بیس اور بعض میں ستر ہے جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں وہی کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ اصل میں ان روایات میں سے بعض پہلے درجہ کے گناہان کبیرہ کی طرف بعض دوسرے درجہ کے کبائر کی طرف اور بعض سب گناہان کبیرہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

## ایک اشکال اور اس کی وضاحت

یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت تو گناہان صغیرہ کی تشبیح سے دلاتی ہے کیونکہ وہ کہتی ہے: گناہان کبیرہ کو ترک کرنے کے بعد گناہان صغیرہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔

اس آیت میں جس تعبیر کا ذکر کیا گیا ہے اس سے اعتراض کا جواب بخوبی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن فرماتا ہے: منکفرینکم سینانکم اہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو چھپا دیں گے، یعنی گناہان کبیرہ سے پرہیز کرنا نہ خصوصاً بنیادیں مضبوط ہونے کی صورت میں انسان میں تقویٰ ایک ایسی حالت پیدا کر دیتا ہے جو ممکن ہے چھوٹے گناہوں کے اثرات کو اس کے وجود سے دھو ڈالے۔ اصل میں یہ آیت اس آیت کی طرح ہے:

ان الحسنات يذهبن السيئات (ہود: ۶۳)

حسنات، بیہات کو ختم کر دیتے ہیں۔

زیر نظر آیت میں حقیقی نیک اعمال کے حقیقی آثار کی طرف اشارہ ہے اور یہ بالکل اس طرح سے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ اگر انسان خطرناک زہریلے مواد سے پرہیز کرے اور اس کی صحت بھی صحیح و سالم ہو تو صحت کی سلامتی کی وجہ سے بعض غیر مناسب غذاؤں کے ناپسندیدہ اثرات ختم ہو سکتے ہیں۔





## گناہِ صغیرہ کس طرح گناہِ کبیرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے

اس موقع پر ہمیں ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ گناہِ صغیرہ اس صورت میں صغیرہ رہتا ہے جب اس میں تکرار نہ ہو علاوہ ازیں اسے معمولی سمجھتے ہوئے، غرور اور سرکشی کے طور پر نہ کیا جائے کیونکہ قرآن اور اسلامی روایات کے مطابق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثر مواقع پر گناہانِ صغیرہ گناہانِ کبیرہ میں بدل جاتے ہیں مثلاً

۱ - جب انہیں بار بار کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لاصغیرة مع الاصرار

کوئی گناہ بار بار کرنے سے گناہِ صغیرہ نہیں رہتا۔

۲ - جب کسی گناہ کو چھوٹا اور معمولی سمجھا جائے۔ چنانچہ بیخِ البلاغہ میں ہے:

امشد الذنوب ما استهان به صاحبه

سنت ترین گناہ وہ ہے جس کا کرنے والا اسے چھوٹا سمجھے۔

۳ - جب گناہِ طفیان، بچہ اور حکم پروردگار کے سامنے سرکشی کے ارادے سے کیا جائے۔ یہ بات مختلف آیتوں سے

اجمالی طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ النور کی آیت ۳۳ میں ہے:

رہے وہ لوگ جو سرکشی اور طفیان کریں، دنیاوی زندگی کو آخرت پر مقدم سمجھیں تو ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۴ - وہ گناہ جو ایسے افراد سے سرزد ہوں جو معاشرے میں ایک خاص مقام رکھتے ہوں اور ان کی لغزش دوسروں کے برابر

نہ سمجھی جاتی ہو۔ جیسے قرآن سورۃ احزاب میں ازواجِ پیغمبر کے بارے میں فرماتا ہے:

اگر تم کوئی بُرا کام کرو گی تو اس کی سزا گنی پاؤ گی۔

اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من سببت شیئاً فعلیہ و زرھا و وزر من عمل بہ الا ینقص من اوزارہد شیئاً

اگر کوئی شخص بری سنت اور طریقے کی بنیاد رکھے تو اس کا گناہ اس پر ہو گا۔ اسی طرح ان تمام لوگوں کا گناہ

جی جو اس پر عمل کریں گے اس کے بغیر کہ ان کے گناہ میں کچھ کمی ہو سکتی ہے۔

۵ - جب اس گناہ کے کرنے پر خوش ہو اور اس پر فخر کرے۔ جیسا کہ حضرت پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

من اذنب ذنباً و هو ضاحک دخل النار و هو باک

۱۔ اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۲۸۸ -

۲۔ بیخ البلاغہ کلماتِ قصار -

۳۔ مجزۃ البیضا جلد ۱ صفحہ ۶۱ -

جو شخص گناہ کرے اور پھر اس پر ہنسے تو وہ روتے ہوئے جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔

۴۔ گناہ کے بعد فوراً سزا ملنے کو رضائے الہی کی دلیل سمجھے اور اپنے آپ کو سزا سے محفوظ اور بارگاہ الہی میں محبوب قرار دے جیسا کہ قرآن مجید کی سورہ مجادلہ آیت ۸ میں ہے:

(مغزور گناہگار) اپنی طرف سے کہیں گے کہ خدا ہمیں کیوں سزا نہیں دیتا۔

اس کے بعد قرآن مزید فرماتا ہے:

ان کے لیے دوزخ کی آگ کافی ہے۔

۳۲۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهِۦ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۗ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَتَبُوْا ۗ وَ لِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَتَبْنَ ۗ وَ سَأَلُوْا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

ترجمہ

۳۲ جو فضیلت خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر دی ہے اس کی تمنا اور آرزو نہ کرو۔ (یہ طبعی فرق تمہارے معاشرے کے نظام کی حفاظت کے لیے حقوق اور عدالت کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے باوجود مرد اس سے جو کسب و کوشش کرتے ہیں حصہ پالیتے ہیں اور عورتیں جو کسب اور کوشش کرتی ہیں اس میں سے حصہ حاصل کرتی ہیں۔ کسی کے حقوق پامال نہیں ہونے چاہئیں) اور خدا سے اس کے فضل (اور رحمت و برکت) کا سوال کرتے رہو اور وہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

شان نزول

مشہور مفسر "طبری" مجمع البیان میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ (زوجہ پیغمبر) نے پیغمبر اکرم کی خدمت میں عرض کیا:

جب مرد جہاد کے لیے جاتے ہیں تو عورتیں کیوں جہاد نہیں کر سکتیں اور ہمارے لیے ادھی میراث کیوں ہے؟

کاش ہم بھی مرد ہوتیں اور ان کی طرح جہاد پر جاتیں اور معاشرے میں ان کی سی حیثیت رکھتیں۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس کے ذریعے اس سوال اور ایسے ہی دوسرے سوالات کا جواب دیا گیا۔ تفسیر المناریں ہے کہ جب میراث کی آیت نازل ہوئی اور اس نے مردوں کا حصہ عورتوں سے دوگنا بتایا تو بعض مسلمان مرد کہنے لگے: کاش ہمارا معنوی اجر و ثواب ان کی طرح ہوتا اور بعض عورتوں نے کہا کہ کاش ہماری سزا اور عذاب بھی مردوں کی سزا سے ادھی ہوتی جس طرح ہماری میراث ان کی نسبت ادھی ہے۔

اس پر آیت مندرجہ بالا نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔ یہی شان نزول تفسیر فی ظلال اور روح المعانی میں معمولی سے

## سُورَةُ انبِيَاءٍ كِي فَضِيْلَتِ

پنجمبر اسلامؐ سے اِس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں منقول ہے :  
 من قرء سورة الانبياء احسبه الله حسابا يسيرا . وصافحه وسلم  
 عليه كل نبي ذكر اسمه في القرآن .  
 جو شخص سورہ انبیاء کو پڑھے گا ، خدا اس کے حساب کو آسان کر دے گا . (روز قیامت  
 اس کے اعمال کا حساب لینے میں سخت گیری نہیں کرے گا ) اور ہر وہ پنجمبر کر جس کا نام  
 قرآن میں ذکر ہوا ہے وہ اُس سے مصافحہ کرے گا اور — اسے سلام کرے گا .  
 اور امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہے :

من قرء سورة الانبياء حبا لها كان كمن رافق النبيين اجمعين  
 في جنات النعيم ، وكان مهيئا في اعين الناس حياة الدنيا .  
 جو شخص سورہ انبیاء کو عشق و محبت کے ساتھ پڑھے گا وہ جنت کے پُر نعمت باغوں میں  
 تمام انبیاء کا رفیق اور ہم نشین ہو گا اور دنیا کی زندگی میں بھی لوگوں کی نگاہ میں باوقار ہو گا ۔

لفظ "حبا لها" ( اس سورہ سے عشق و محبت رکھتے ہوئے ) درحقیقت ان روایات کے معنی کے سمجھنے کے لیے ایک کلید ہے  
 کہ جو قرآن کی سورتوں کی فضیلتوں کے سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں یعنی صرف الفاظ کا پڑھ لینا ہی مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معانی و مطالب  
 سے محبت کرنا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ معنی و مفہوم سے محبت عمل کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی ، اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں  
 فلان سورہ کا عاشق ہوں اور اس کا عمل اس کے مفاہیم کے خلاف ہو تو وہ تجھوٹ بولتا ہے۔  
 ہم نے بار بار کہا ہے کہ قرآن کتاب عقیدہ و عمل ہے اور اس کا پڑھنا مقدم اور تمہید ہے سمجھنے کے لیے اور سمجھنا مقدم ہے  
 ایمان و عمل کے لیے۔

۱۔ تفسیر نورائستلین ، ج ۳ ، ص ۴۱۲ -

۲۔ تفسیر نورائستلین ، ج ۳ ، ص ۴۱۲ -



## اس سورہ کے مضامین

۱۔ یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، انبیاء کی سورت ہے کیونکہ اس میں سولہ انبیاء کے نام آئے ہیں۔ بعض کے خاص خاص حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور بعض کا صرف ذکر ہے۔ اور وہ ہیں: موسیٰ، ہارون، ابراہیم، لوط، ائحٰق، یعتوب، نوح، داؤد، سلیمان، الیوب، اسمعیل، ادریس، ذاکفل، ذالنون (یونس) زکریا اور یحییٰ علیہم السلام۔ اس بنا پر اس سورہ کے اہم مباحث انبیاء کے پردگراؤں کے بارے میں ہیں۔ علاوہ ان کے کچھ ایسے انبیاء بھی ہیں جن کے نام اس سورہ میں صراحت کے ساتھ نہیں لیے گئے لیکن ان کے بارے میں کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں مثلاً پیغمبر اسلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

۲۔ اس کے علاوہ کئی سورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ عقائد دینی خصوصاً مبداء و معاد کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ اس سورہ میں بھی بات پوری طرح موجود ہے۔

۳۔ اس سورہ میں خالق کی وحدت اور یہ کہ اس کے سوا اور کوئی معبود اور پیدا کرنے والا نہیں ہے نیز عالم کی پیدائش، مقصد اور پردگرام کے مطابق ہونے اور اس جہان پر حاکم قوانین کی وحدت اور اسی طرح حیات و موت کے سرچشمہ کی وحدت نیز موجودات کی فنا اور موت کے پردگرام میں وحدت کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔

۴۔ اس سورہ کے ایک حصہ میں حق کی باطل پر، توحید کی شرک پر، عدل و انصاف کے لشکر کی جنود اہلسی پر کامیابی و کامرانی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۵۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ یہ سورہ غافل اور بے خبر لوگوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے حساب و کتاب سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام میں بھی اسی سلسلہ کی دوسری تنبیہیں ہیں۔

وہ انبیاء جن کے نام اس سورہ میں آئے ہیں ان میں سے بعض کی زندگی کا بیان اور ان کے تفصیلی پردگرام دوسری سورتوں میں ذکر ہوتے ہیں لیکن اس سورہ میں زیادہ تر انبیاء کے حالات اس حصہ کا ذکر ہے کہ وہ جس وقت سخت قسم کی تنگی میں گرفتار ہوتے تھے تو وہ حق تعالیٰ کے دامن لطف کی طرف کس طرح سے دست توسل پھیلاتے تھے اور کس طرح سے خدا ان کے لیے بند دروازے کھول دیتا تھا اور طوفان و گرداب سے انہیں نجات بخشتا تھا۔

ابراہیمؑ جب نرود کی آگ میں گرفتار ہوئے۔

یونسؑ جب مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔

زکریاؑ نے جب اپنی عمر کے آفتاب کو غروب ہونے کے قریب دیکھا لیکن ان کا کوئی جانشین نہیں تھا کہ جو ان کے پردگرام کی تکمیل کرے۔

اور اسی طرح باقی انبیاء جب وہ سخت مشکلات میں گھرے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ۱- اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝
- ۲- مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحَدَّثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝
- ۳- لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ وَاَسْرُوا النَّجْوَىٰ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا هَلْ هَذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۝ اَفَتَأْتُونَ السَّحْرَ وَاَنْتُمْ تَبْصُرُونَ ۝
- ۴- قُلْ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝
- ۵- بَلْ قَالُوا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلْ اَفْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَاْتِنَا بآيَةٍ كَمَا اُرْسِلَ الْاَوَّلُونَ ۝

### ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱- لوگوں کا حساب کتاب ان کے نزدیک آچہ ہے لیکن وہ غفلت میں منہ پیرے ہوئے ہیں۔
- ۲- جو کوئی بھی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس آتی ہے وہ اسے کھیل سمجھتے ہیں اور مذاق اڑانے کے انداز میں اسے سنتے ہیں۔
- ۳- (حالت یہ ہے کہ) ان کے دل کھیل اور بے خبری میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ ظالم چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کیا اس کے سوا کچھ اور بات ہے کہ یہ تم ہی جیسا ایک بشر ہے؟ کیا تم دیکھتے بھالتے جادو کے پاس جاتے ہو؟
- ۴- (لیکن پیغمبر نے) کہا: میرا پروردگار آسمان اور زمین کی ہر بات جانتا ہے اور وہ (بڑا) سننے والا اور جاننے والا ہے۔
- ۵- انہوں نے کہا (جو کچھ محمدؐ لایا ہے یہ وحی نہیں ہے بلکہ یہ پریشان خواب و خیال میں بلکہ اُس نے دل سے جھوٹ گھر کے خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بلکہ وہ ایک شاعر ہے۔ (اگر وہ سچا ہے) تو ہمارے لیے ایسا ہی ایک بجزوئے لئے



جیسے مجزے پہلے انبیاء کو دے کر بھیجا گیا تھا۔

## تفسیر

### طرح طرح کے بہانے :

یہ سورہ - جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے - تمام لوگوں کے لیے ایک سخت تنبیہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے، ایک بلا فیئینہ والی اور بیدار کن تنبیہ - فرمایا گیا ہے : لوگوں کا حساب ان کے قریب آپہنچا ہے ، حالانکہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور منہ موڑے ہوئے ہیں ( اقترَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُوَ فِي غَفْلَةٍ مَّعْرُضُونَ )۔

ان کا عمل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس غفلت اور بے خبری نے ان کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے ورنہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ انسان حساب کے نزدیک ہونے پر ایسا رکھتا ہو - وہ بھی انتہائی دقیق حساب - اور پھر وہ تمام مسائل کو معمولی سمجھے اور ہر قسم کے گناہ میں آلودہ ہو۔

لفظ "اقترَبَ" میں "قرب" کی نسبت کہیں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حساب بہت ہی نزدیک آگیا ہے۔

"ناس" کی تعبیر اگرچہ ظاہری طور پر عام لوگوں کے لیے آئی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ سب کے سب غفلت میں ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ جب بھی عمومی بات ہوگی تو اس میں استثنا بھی ہوگا۔ اور یہاں ایسے بیدار دل لوگوں کو کہ جو ہمیشہ حساب کی فکر میں رہتے ہیں اور اس کے لیے آمادہ و تیار ہوتے ہیں، اس حکم سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حساب لوگوں کے نزدیک ہو رہا ہے، نہ کہ لوگ حساب کے۔ گویا حساب تیزی کے ساتھ لوگوں کی طرف دوڑ رہا ہے۔

ضمنی طور پر "غفلت" اور "اعراض" کے درمیان فرق ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ وہ حساب کے نزدیک ہونے سے غافل ہیں اور یہ غفلت اس بات کا سبب بنتی ہے، کہ وہ حق کی آیات سے رُذگردانی کریں۔ درحقیقت "حساب سے غفلت" علت ہے اور "آیات حق سے اعراض" اس کا معلول ہے یا اس عظیم عدالت میں جواب دینے کے لیے آمادگی سے اور خود حساب سے اعراض پڑنے یعنی چونکہ غافل ہیں لہذا اپنے آپ کو حساب کے لیے آمادہ نہیں کرتے اور رُذگردانی کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حساب کا نزدیک ہونا اور قیامت کس معنی میں ہے؟

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ باقی ماندہ دنیا گزشتہ کے مقابلہ میں کم ہے۔ تو اس بنا پر قیامت نزدیک ہوگی یعنی گزشتہ کی نسبت نزدیک خاص طور پر جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ منقول ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

بعثت انا والساعة كها تين

میری بعثت اور قیامت ان دونوں ( انگلیوں ) کی طرح ہے ( شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو ایک



دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اللہ

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ یہ تعبیر قیامت کے (حتمی طور پر واقع) ہونے کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ عربوں کی مشہور ضرب المثل میں کہا جاتا ہے کہ :

### کل ما هوات قريب

جو چیز قطعی و یقینی طور پر آکر رہے گی، وہ قریب ہے۔

اس کے باوجود یہ دونوں تفسیریں آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ لہذا ممکن ہے دونوں نکات کی طرف اشارہ ہو۔ بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں "حساب" قیامت سفر مئی یعنی موت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ موت کے وقت بھی کچھ نہ کچھ محاسبہ ہوتا ہے اور انسان کو اس کے اعمال کا کچھ بدلہ دیا جاتا ہے۔

لیکن زیر بحث آیت ظاہراً قیامت کبریٰ کی طرف راجح نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت ان کے اعراض اور زودگردانیوں کی ایک نشانی کو اس صورت میں بیان کرتی ہے : ان کے رب کی جو بھی کوئی نئی نصیحت اور یاد دہانی ان کے پاس آتی ہے، وہ اُسے کھیل اور مذاق کے ٹوڈ میں سنتے ہیں : (ما یا آتیہو من ذکر من ربہو محدث الا استمعوه وهو یلعبون)۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی سورہ یا آیت - اور پروردگار کی طرف سے کسی بھی بیدار کرنے والی بات پر سنجیدگی سے سوچیں اور کچھ دیا اس پر غور و فکر کریں اور کم از کم یہ احتمال ہی کر لیں کہ یہ بات ان کی زندگی اور مستقبل پر اثر کرنے والی ہوگی۔ وہ نہ تو خدا کی طرف سے اس لیے جانے کی فکر کرتے ہیں اور نہ ہی پروردگار کی تنبیہوں کی۔

اصلی طور پر جاہل، متکبر اور خود غرض لوگوں کی ایک بد بختی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خیر خواہی کرنے والوں کی پسند و نصح کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہی بات اس کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ ہرگز خواب غفلت سے بیدار نہ ہوں جبکہ ایک مرتبہ بھی وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا تو ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا راستہ اسی لمحے تبدیل ہو جائے۔

زیر غور آیت میں لفظ "ذکر" ہر بیدار کرنے والی بات کی طرف اشارہ ہے اور "محدث" (نیا اور جدید) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانی کتابیں یکے بعد دیگرے نازل ہوتی ہیں اور قرآنی سورتیں اور اس کی آیتیں، ہر ایک تازہ بہ تازہ اور نئے نئے مضامین و مضامین لیے ہوتے ہوتے ہیں کہ جو مختلف اشراغیظ طریقوں سے غافلوں کو بیدار کرتی ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے کیا فائدہ کہ جو ان سب کا مذاق اڑاتے ہیں۔

گلوہ نہی چیزوں سے وحشت رکھتے ہیں۔ وہ انہی قدیم خرافات پر کہ جو انہیں اپنے بڑوں سے ورثہ میں ملی ہیں، خوش میں گویا انہوں نے ہمیشہ کے لیے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ ہر نئی حقیقت کی مخالفت کریں گے۔ جبکہ قانون ارتقا کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان کو ہر روز تازہ بہ تازہ اور نئے سے نئے مسائل کا سامنا ہو۔

۱۔ مجمع البیان آیات زیر بحث کے ذیل میں -

۲۔ تفسیر قرطبی، جلد ۶، ص ۴۲ -



پھر مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے : وہ ایسی حالت میں ہیں کہ ان کے دل لہو و لعب اور بے خبری میں ڈوبے ہوئے ہیں :

(لاہیة قلوبہم)۔

کیونکہ وہ تمام محکم اور سنجیدہ مسائل کو ظاہری لحاظ سے شوخی اور لہو و لعب سمجھتے ہیں۔

(جیسا کہ لفظ "یلعبون" فعل مضارع اور مطلق صورت میں، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے) اور باطنی لحاظ سے غفلت میں

ڈالنے والے فضول مسائل کے ساتھ لہو و لعب اور فکری مشغولیت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور یہ امر فطری اور طبعی ہے کہ ایسے افراد ہرگز راہ سعادت نہیں پاسکتے۔

اس کے بعد ان کے شیطانی منصوبوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

یہ ظالم سازش پر مبنی اپنی سرگوشیاں چھپاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تم ہی جیسا ایک عام بشر ہے: (واسرؤ النجوى الذین

ظلمواہل هذاالبشر مثاکم)۔

جبکہ وہ ایک عام بشر سے زیادہ نہیں ہے، تو لازماً اس کے یہ خارق عادت کام اور اس کی بات کی اثر پذیر جادو کے سوا

کچھ نہیں" تو کیا تم جادو کے پیچھے جاتے ہو، حالانکہ تم (یہ سب کچھ) دیکھ رہے ہو" (افتانوں السحر وانتم تبصرون)۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت دشمنان اسلام بہت طاقتور تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا

ضرورت تھی کہ وہ اپنی باتوں کو چھپائیں، یہاں تک کہ اپنی سرگوشیوں کو بھی (اس بات پر توجہ رہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی سرگوشیوں

کو مخفی رکھتے تھے)۔

مکن ہے یہ اس بنا پر ہو کہ وہ ان مسائل میں کہ جو کسی سازش اور منصوبہ بندی کا پہلو رکھتے تھے، مشورہ کرتے ہوں تاکہ عام

لوگوں کے سامنے ایک ہی منصوبہ کے ماتحت پیغمبر اکرمؐ کا مقابلہ کریں۔

علاوہ ازیں وہ قدرت و طاقت کے لحاظ سے تو مسلمانوں کے تھے لیکن منطوق اور نفوذ کلام کی قدرت کے لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ اور

مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ اور یہی برتری اس بات کا سبب بنتی تھی کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے مقابلہ کے لیے جعلی باتیں گھڑتے، عمل بیٹھ کر

خفیہ مشورے کرتے تھے۔

بہر حال وہ اپنی اس گفتگو میں دو چیزوں کا سہارا لیتے تھے۔ ایک رسول اللہؐ کا بشر ہونا اور دوسرے ان کی طرف جادو کی نسبت دینا۔

اور بعد کی آیات میں جو اور چیزیں انہوں نے غلط منسوب کیں ان کا ذکر بھی آئے گا۔ قرآن ان کا بھی جواب دیتا ہے۔



لیکن پہلے قرآن کھلی صورت میں رسول اکرمؐ کی زبان سے اس طرح جواب دیتا ہے :

میرا پروردگار ہر بات کو جانتا ہے چاہے وہ آسمان میں ہو یا زمین میں (قال ربی یعلم القول فی السماء والارض)۔

عربی ادب میں معمول ہے کہ اگر فاعل اسم ظاہر ہو تو فعل مفسرہ دلایا جاتا ہے لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض اوقات

خاص علل و اسباب کی بنا پر فعل کو جمع کی شکل میں اور فاعل کو اسم ظاہر لاتے ہیں۔ "واسرؤ النجوى الذین ظلموا"

کا جملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔

یہ تصور نہ کرنا کہ تمہاری محفئی باتیں اور پوشیدہ سازشیں اُس پر مخفی ہیں۔ کیونکہ " وہ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے " (وہو

السمیع العلیوں)۔

وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے اور تمام کاموں سے باخبر ہے۔ نہ صرف وہ باتوں کو سنتا ہے بلکہ وہ ان خیالات و تصورات کو بھی جو ان کے ذہنوں میں گزرتے ہیں اور ان ارادوں کو بھی کہ جو ان کے سینوں میں چھپے ہوئے ہیں، جانتا ہے۔

مخالفین کی بہانہ بازیوں کی دو قسموں کا بیان کرنے کے بعد، ان بہانہ بازیوں کی دوسری چار قسموں کا ذکر شروع کرتے ہوئے قرآن اس طرح کہتا ہے: انہوں نے کہا کہ پیغمبر جو کچھ وحی کے عنوان سے لایا ہے، یہ پریشان خوابوں اور پرگندہ خیالوں کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جنہیں وہ حقیقت اور واقعیت سمجھ بیٹھا ہے: (بل قالوا اضغاث احلام)۔

اور کبھی اپنی اس بات کو بدل کر کہتے ہیں کہ: " وہ جھوٹا آدمی ہے اور اس نے خدا سے یہ باتیں جھوٹ منسوب کی ہیں (بل افتراء)۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ: " نہیں وہ تو ایک شاعر ہے " اور یہ باتیں اس کے شاعرانہ تخیلات کا مجموعہ ہیں (بل ہو شاعر)۔ اور آخری مرحلہ میں کہتے ہیں کہ اگر ہم ان تمام باتوں کو چھوڑ دیں پھر بھی اگر وہ سچ کہتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہے تو ہمارے لیے کوئی معجزہ لے کر آئے جیسا کہ گزشتہ انبیاء معجزات کے ساتھ بھیجے گئے تھے " (فلایأتنا بآیۃ حکما ارسل الاولین)۔ رسول اللہ کی طرف ان چیزوں کی نسبت، جو ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں، کا مطالعہ اور تحقیق خود اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ وہ لوگ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد بہانہ جوئی اور حریفانہ کوہر قیامت اور ہر صورت میں میدان سے باہر نکالنا تھا۔

کبھی جادوگر کہتے، کبھی شاعر، کبھی منترچی اور کبھی (معاذ اللہ) خیالی دنیا میں بسنے والا ایک شخص کہ جو اپنے خواب پریشاں کو وحی کہنے لگا ہے۔

اگر ہمارے پاس ان کی باتوں کو باطل کرنے کے لیے، ان کی ادھر ادھر کی ان منتشر باتوں کے علاوہ اور کوئی بھی دلیل نہ ہوتی، تو ان کے باطل ہونے کے لیے یہی کافی ہتھیار لیکن بعد کی آیات میں ہم دیکھیں گے کہ قرآن دوسرے طریقوں سے بھی انہیں قاطع جواب دیتا ہے۔

## ایک نکتہ:

کیا قرآن حادث ہے؟ بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں لفظ "محدث" کی مناسبت سے کہ جو دوسری زیر بحث آیت میں ہے "کلام اللہ" کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں بہت بحث کی ہے۔ یہ وہی مسئلہ ہے کہ

۱۔ اضغاث: جمع "ضغث" (بروزن "حرم") خشک لکڑیوں یا گھاس وغیرہ کے گٹھے کے معنی میں ہے۔

"احلام" جمع ہے "حلم" کی (بروزن "نم") خواب اور رویا کے معنی میں اور چونکہ کلمہ کلمہ وغیرہ کے گٹھوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بکھری

ہوئی چیزوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھتے ہیں اس لیے اس تعبیر کا خواب پریشاں پر بھی اطلاق ہوا ہے۔





جر خلفا بنی عباس کے زمانہ میں سالہا سال تک بحث و تنقید کا موضوع بنا رہا اور جس نے ایک طویل مدت تک بہت سے علماء کو الجھائے رکھا۔

لیکن ہم موجودہ زمانہ میں اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ بحث زیادہ تر سیاسی پہلو رکھتی تھی۔ حکمران چاہتے تھے کہ علمائے اسلام کو آپس میں الجھائے رکھیں اور اصولی اور بنیادی مسائل کہ جو وضع حکومت اور لوگوں کے طرز زندگی اور اسلام کے اصلی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں سے توجہ ہٹائے رکھیں۔

موجودہ زمانے میں ہمارے لیے یہ بات پورے طور پر واضح ہے کہ اگر "کلام اللہ" سے مراد اس کا معنی و مفہوم ہے، تو وہ قطعی طور پر قدیم ہے یعنی ہمیشہ وہ علم خدا تھا اور خدا کا علم ہمیشہ سے اس پر محیط ہے۔

اور اگر اس سے مراد یہ الفاظ اور یہ کلمات اور یہ وحی ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی، تو وہ بلاشبک و شبہ "عادت" ہے۔ کون عاقل یہ کہتا ہے کہ الفاظ و کلمات انہی ہیں، یا پیغمبر پر وحی کا نزول دور بعثت کے آغاز سے نہیں ہوا؟ لہذا آپ ملاحظہ کریں گے کہ ہم بحث کو جس طرف سے بھی لیں مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہے۔

دوسرے الفاظ میں قرآن الفاظ بھی رکھتا ہے اور معانی بھی۔ اس کے الفاظ قطعاً و یقیناً "حادث" ہیں اور اس کے معانی قطعاً یقیناً "قدیم" ہیں۔ لہذا کھینچنا تانی اور بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور پھر یہ بحث اسلامی معاشرے کی کونسی علمی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مشکل کو حل کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ بعض گزشتہ علمائے منکار اور سازشی حکام اور بادشاہوں کی فریب کاریوں سے دھوکا کیوں کھایا۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اہل بیتؑ نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے واضح اور عملی طور پر انہیں خبردار کیا ہے کہ وہ اس قسم کی بحثوں سے پرہیز کریں!

۶۔ مَا آمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِنْ قَرِيْبَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ ۝

۷۔ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ فَسَلُّوا أَهْلَ الذِّكْرِ

إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

۸۔ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا إِلَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا

خَالِدِينَ ۝

۹۔ تَوَّصَدَقْتَهُمُ الْوَعْدَ فَأَنْجَيْنَاهُمْ وَمِنْ نَشَاءٍ وَ

۱۰۔ اَهْلَكُنَا الْمُسْرِفِينَ ۝  
لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُونَ ۚ

### ترجمہ

- ۶۔ تمام آبادیاں کہ جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ( انہوں نے بھی طرح طرح کے معجزات کا تقاضا کیا تھا اور ان کے مطالبات کے مطابق معجزات دکھا دیئے گئے تھے لیکن ) وہ ہرگز ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟
- ۷۔ ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) مرد بھی بھیجے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔ (وہ سب کے سب انسان ہی تھے اور نوع بشر میں سے تھے) اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لو۔
- ۸۔ ہم نے انہیں ایسے جسم نہ دیئے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ عمر جاوداں رکھتے تھے۔
- ۹۔ اس کے بعد جو وعدہ ہم نے ان سے کیا تھا اس کی ہم نے وفا کی۔ انہیں اور جس جس کو ہم چاہتے تھے (ان کے دشمنوں کے چنگل سے) نجات دی اور زیادتی کرنے والے کو ہم نے ہلاک کر دیا۔
- ۱۰۔ ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہارے لیے نصیحت (اور بیداری) کا وسیلہ موجود ہے۔ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔

### تفسیر

### تمام پیغمبر نوع بشر میں سے تھے :

گزشتہ آیات میں دشمنان اسلام کی طرف سے ایسے چھ اعتراضات کا ذکر تھا کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ زیر بحث آیات انہیں کا جواب دے رہی ہیں۔ ان میں کبھی کلی صورت میں اور کبھی کسی خاص مسئلے کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے۔ پہلی زیر بحث آیت ان کے من پسند معجزات طلب کرنے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اور کہتی ہے: تمام شہر اور آبادیاں کہ جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے، انہوں نے بھی اسی قسم کے معجزات کا تقاضا کیا تھا لیکن جب ان کے مطالبات پورے کر دیئے گئے تو وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے (ما امنت قریۃ اھلکناھا اھم یؤمنون)۔ اس ضمن میں انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ اگر اقراچی معجزات کے سلسلے میں تمہارے تقاضے کو پورا کر دیا جائے اور پھر بھی تم ایمان نہ لاؤ، تو تمہاری تباہی و نابودی حتمی و یقینی ہو جائے گی۔

۱۔ من پسند کے معجزات کو اصطلاح میں "اقراچی معجزات" کہتے ہیں۔ ان معجزات کا تقاضا درحقیقت بہانہ سازی کے طور پر تھا۔



آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قرآن اس آیت میں ان کے تمام ایسے اعتراضات کی طرف کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور تفتیش ہیں، اشارہ کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ: سچے پیغمبروں کی دعوت کے سلسلے میں اس طرح کی ٹھکر کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جہٹ دھرا اور ضدی افراد ہمیشہ ہی اسی قسم کے بہانوں کو وسیلہ بنایا کرتے تھے اور آخر کار ان کا انجام بھی سوائے کفر کے اور اس کے بعد ان کی ہلاکت اور دردناک عذاب الہی کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

بہرہ والی آیت ان کے سب سے پہلے اعتراض کا خصوصیت سے جواب دے رہی ہے، یہ اعتراض پیغمبر کے بشر ہونے کے سلسلے میں تھا۔ آیت کہتی ہے تو ہی نہیں کہ پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہے بلکہ تمام کے تمام پیغمبر جو تجھ سے پہلے آئے ہیں وہ سب کے سب مرد ہی تو تھے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے (وما ارسلنا قبلك الا رجالا انوحی الیہم)۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جسے سب لوگ جانتے ہیں اور اس سے آگاہ ہیں اور اگر تم نہیں جانتے، تو جو آگاہ ہیں ان سے پوچھ لو (فاستلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون)۔

## اہل ذکر کون ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ "اہل ذکر" لغوی مفہوم کے لحاظ سے تمام آگاہ اور باخبر افراد کے لیے بولا جاتا ہے اور زیر نظر آیت "بارئ کے عالم کی طرف رجوع کرنے" کے ایک کلی عقلی قانون کو بیان کر رہی ہے۔ اگرچہ موقع کے لحاظ سے آیت کا مصداق علماء اہل کتاب ہی تھے، لیکن یہ بات قانون کی کلیت میں مانع نہیں ہے۔ اسی بنا پر علماء اور فقہائے اسلام نے اس آیت سے "مجتہدین اسلام کی تقلید کرنے کے جواز کے" مسئلہ میں استدلال کیا ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان روایات میں کہ جو اہل بیت کی طرف سے ہم تک پہنچی ہیں اہل ذکر کی علی علیہ السلام یا تمام ائمہ اہلبیت سے تفسیر کی گئی ہے تو یہ منحصر ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس قانون کلی کے واضح ترین مصداق کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے سورہ نحل کی آیہ ۴۲ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

بعد والی آیت انبیاء کے بشر ہونے کے سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے: ہم نے پیغمبروں کو ایسے جسم نہیں دیئے تھے کہ جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ہرگز عمر جاوداں بھی نہیں رکھتے تھے (وما جعلناہم جسدا لا یأکلون الطعام و ما کانوا خالدین)۔

"لا یأکلون الطعام" کا جملہ اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ جو قرآن میں دوسرے مقام پر اسی اعتراض کے سلسلے میں آئی ہے:

"وقالوا ما لهذا الرسول یأکل الطعام ویمشی فی الأسواق"



۳۶۔ وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَلًا ۗ فَخُورًا ۝

ترجمہ

۳۶ اور خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ سے نیکی کرو۔ (اسی طرح) رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، نزدیک اور دور کے یتیموں، مسکینوں اور خیرچ نہ رکھنے والے مسافروں کے ساتھ اور ان غلاموں سے جن کے تم مالک ہو نیکی کرو۔ کیونکہ خداوند عالم اس شخص کو جو تکبر اور گھمنڈ کرنے والا ہو (اور دوسروں کا حق ادا نہ کرے) دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں حقوق اسلامی کے ایک اور سلسلے کو بیان کرتا ہے ان میں خدا کے حقوق، بندوں کے حقوق یا لوگوں سے معاشرت کے آداب شامل ہیں۔ مجموعی طور پر اس آیت سے دس احکامات اور قاعدوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ وَاَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا

قرآن سب سے پہلے لوگوں کو خدا کی عبادت کرنے اور شرک و بت پرستی ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جو تمام اسلامی احکامات کی جڑ ہے۔ توحید باری کی دعوت روح کو پاک نیت کو خالص، ارادہ کو قوی اور ہر مفید منصوبہ انجام دینے کا ارادہ مضبوط کرتی ہے۔ چونکہ یہ آیت اسلامی حقوق کا ایک سلسلہ بیان کر رہی ہے تو سب سے پہلے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے تاکید کرتی ہے کہ خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

۲۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا

اس کے بعد ماں باپ کے حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصیحت کرتی ہے کہ ان کے ساتھ نیکی کرو۔ ماں باپ کا حق ایسے مسائل میں سے ہے جن کا قرآن میں اکثر ذکر کیا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی امر ایسا ہو جس کی اس قدر تاکید کی گئی ہو۔ یہ بات قرآن میں چار مقامات پر توحید کے ذکر کے فوراً بعد آئی ہے

۱۔ بقروہ ۸۳، انعام ۱۵۱، اسرا ۲۳ اور زیر نظر آیت۔



اس بار بار کے تذکرہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ اور واسطہ ہے درحقیقت ایسا ہی ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی نعمت تو زندگی کی نعمت ہے جو اللہ کی طرف سے پہلے درجہ میں ہے اور بعد کی منازل میں ماں باپ سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اولاد ماں باپ کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ اسی لیے ماں باپ کے حقوق کو چھوڑ دینا خداوند عالم کے شرک کے برابر ہے۔ ماں باپ کے حقوق کے بارے میں مفصل بحث ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ سورۃ اسراء اور سورۃ لقمان کی متعلقہ آیات کے ذیل میں آئے گی۔

۳۔ وبذی القربی

اس کے بعد تمام رشتہ داروں سے نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ بھی ایسے مسائل میں سے ہے جن کے متعلق بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ کبھی صلہ رحم کے عنوان سے اور کبھی ان سے نیکی اور احسان کے ذیل میں۔ حقیقت میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ نوع انسانی کے وسیع رشتے میں کچھ زیادہ مضبوط رشتے استوار کرے یہ رشتے چھوٹی چھوٹی اکائیوں اور زیادہ ترہم شکل اکائیوں میں موجود ہیں جنہیں عرف عام میں کنبہ اور خاندان کہتے ہیں یہ اس لیے ہے تاکہ مشکلات اور حادثات میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور اپنے حقوق کی حفاظت کریں۔

۴۔ والیتانی

اس کے بعد اہل ایمان کو یتیموں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان کے حق میں نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے کیونکہ ہر معاشرے میں طرز طرح کے حادثات کے نتیجے میں ہمیشہ بچے یتیم ہوتے رہتے ہیں۔ جنہیں نظر انداز کر دینا صرف انہیں خطرے میں ڈالتا ہے بلکہ معاشرے کو بھی خطرے سے دوچار کرنا ہے۔ کیونکہ اگر یتیم بچوں کی سرپرستی نہ کی جائے اور ان سے خاطر خواہ ہمدردی اور محبت کا سلوک نہ کیا جائے تو وہ بے ہودہ، خطرناک اور چور ڈاکو بن سکتے ہیں۔ بنا بریں یتیموں کے ساتھ نیکی معاشرے کے اپنے حق میں ہے۔

۵۔ والمساکین

اس کے بعد ضرورت مندوں کے حقوق کی یاد دہانی کروائی گئی ہے۔ کیونکہ ایک صحت مند عادلانہ معاشرہ میں بھی لاچار اور محتاج لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا تمام انسانی اصولوں کے خلاف ہے اور اگر اجتماعی اصول عدالت سے انحراف کی درج سے صحیح سالم لوگ فقر و فاقہ اور محرومیت میں مبتلا ہو جائیں، پھر بھی ایسے معاشرے کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

۶۔ والجاردی القربی

اس کے بعد نزدیک۔ کہہ سرائوں۔ کہہ ساتھ نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے۔ اس کے متعلق کر نزدیک کے ہمسائے کون ہیں مفسرین نے مختلف احتمالات پیش کیے ہیں۔ بعض نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ جو ہمسائے رشتہ دار بھی ہوں۔ لیکن یہ تفسیر اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ آیت میں رشتہ داروں کے حقوق کی طرف الگ سے اشارہ ہو چکا ہے، بعید دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ مراد وہی مکان کی نزدیکی ہے۔ کیونکہ جو ہمسائے زیادہ قریب ہیں ان کے حقوق اور احترام زیادہ ہے یا وہ ہمسائے مراد ہیں جو دین و مذہب کے لحاظ سے زیادہ قریب ہوں۔

۷۔ والجاردی الجنب

اس کے بعد دور کے پڑوسیوں کی سفارش کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں اس سے مکان کی دوری مراد ہے کیونکہ کئی ایک روایتوں کے مطابق چاروں طرف کے چالیس گھر پڑوسی گئے اور سب سے جاتے ہیں۔ اس طرح تمام شہر چھوٹے چھوٹے شہروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص کے گھر کو دائرے کا ایسا مرکز فرض کر لیں جس کا نصف قطر ہر طرف سے چالیس گھروں پر محیط ہو تو ایسے دائرے کی پیمائش ایک معمولی سے حساب سے واضح ہو جاتی ہے تقریباً پانچ ہزار مکانات اس حصے میں آئیں گے، یہ ظاہر ہے اور تسلیم شدہ ہے کہ ایک چھوٹے شہر میں اس سے زیادہ گھر نہیں ہوتے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآنی میں نزدیک کے ہمایوں کے ذکر کے علاوہ دور کے ہمایوں کے حق کی بھی تشریح اور وضاحت کی گئی ہے کیونکہ لفظ ہمایہ کا ایک تو محدود مفہوم ہے جو صرف نزدیک کے پڑوسیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اب اسلامی نظریہ کے مطابق اس مفہوم کو پھیلانے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ دور کے ہمایوں کا نام بھی صراحت کے ساتھ لیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دور کے ہمایوں سے مراد غیر مسلم ہوں۔ کیونکہ ہمایگی اسلام میں مسلمان پڑوسیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس مفہوم میں غیر مسلم بھی شامل ہیں مگر وہ جو مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں وہی اس میں آتے ہیں۔

اسلام میں حق ہمایگی اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیؑ کی مشہور وصیتوں میں ہے:

ما زال رسول اللہ پیغمبري بھم حتى ظننا انه سيورثهم؛

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں اس قدر سفارش فرمائی کہ ہمیں یہ گمان ہونے لگا

کہ شاید آپ یہ حکم فرمائیں کہ ہمارے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

یہ حدیث اہل سنت کی مشہور کتب میں بھی ہے چنانچہ تفسیر المنار اور تفسیر قرطبی میں بخاری سے یہی مضمون نقل کیا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے ایک دن تین مرتبہ فرمایا:

والله لا يثومن - - - -

ایسا شخص ایماندار نہیں ہے۔

کسی نے پوچھا کونسا شخص تو حضور نے فرمایا:

الذي لا يأمن جاره بوائقه

جس کا ہمایہ اس سے تکلیف میں ہو

ایک اور حدیث میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من كان يثومن بالله واليوم الآخر فليحسن الى جاره -

جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ نیکی کرے۔

۱۷ نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۰ -

۱۸ تفسیر قرطبی جلد سوم صفحہ ۱۷۵ -

۱۹ المنار جلد پنجم صفحہ ۹۲ طبع بیروت -





اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:  
حسن الجوار یعمّر الدیار و ینزید فی الاعمار۔

ہمسایوں کا ایک دوسرے سے نیکی کرنا گھروں کو آباد کرتا ہے اور عریں بڑھاتا ہے۔

اس سائنسی اور مشینی دور میں پڑوسی ایک دوسرے کے عام حالات بھی نہیں جانتے بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو ہمسائے ایک دوسرے کے ساتھ بیس بیس سال رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا نام بھی نہیں جانتے۔ یہ عظیم اسلامی حکم ایک خاص روشنی کا حامل ہے۔ اسلام انسانی معاشرے میں بہت زیادہ تعاون اور ہمدردی کا قائل ہے جب کہ مادی ترقی کے اس دور میں ہمدردی اور تعاون کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے اور بے اعتنائی و بے رحمی بڑھتی جا رہی ہے۔

۸۔ و الصاحب بالجنب

اس کے بعد ان لوگوں کو جو انصاف کا دم بھرتے ہیں، وصیت کرتا ہے۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ صاحب بالجنب کے معنی دوست اور رفیق سے زیادہ وسیع ہیں اور حقیقت میں یہ ہر اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی طرح ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو چلے پھرتا دوست ہو یا تنھوڑی دیر کا رفیق مثلاً وہ شخص جو سفر کرتے ہوئے انسان کا دوست بن جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ ”صاحب بالجنب“ سے مراد رفیق سفر (رفیقک فی السفر) ہے یا وہ شخص ہے جو نفع کی امید میں کسی کے ساتھ ہو (المنقطع الیک یرجو نفعک) اس سے مراد ان کی تخصیص نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور ایسے تمام لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ بنا بریں یہ آیت ایک جامع اور کلی حکم کی حامل ہے اور یہ ایسے سب افراد سے من سلوک کرنے کے لیے ہے جن سے انسان کا سابقہ پڑتا ہے۔ چاہے وہ پرحم دوست ہوں رفیق کارہوں، ہم سفر ہوں، اس کے پاس آنے جانے والے ہوں، شاگرد ہوں، مشورہ لینے والے ہوں یا خدمت گزار ہوں۔ کچھ روایات میں صاحب بالجنب کی تفسیر بیوی سے کی گئی ہے چنانچہ النار، روح المعانی اور قرطبی کے مؤلفین آیت کے ذیل میں حضرت علیؑ سے یہی معنی نقل کرتے ہیں لیکن کچھ بعید نہیں ہے کہ اس کا مقصد آیت کے ایک مصداق کا تذکرہ ہو۔

۹۔ و ابن السبیل

یہاں ایک اور گروہ کے بارے میں سفارش کی گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو باوجودیکہ اپنے وطن اور شہر میں صاحب حیثیت اور کھاتے پیتے ہوں لیکن عالم سفر میں، اجنبی شہر میں کسی وجہ سے محتاج ہو جائیں اور ”ابن سبیل“ کی عمدہ تفسیر (راستے کا بیٹا) بھی اسی وجہ سے ہے کہ ہم ان سے کسی قسم کی جان پہچان نہیں رکھتے کہ انہیں کسی قبیلے، کنبے یا شخص سے نسبت دے سکیں صرف اس حکم کی بنا پر کہ وہ حاجت مند مسافر ہیں انہیں مدد کا مستحق قرار دیں۔

۱۰۔ و ما ملکت ایمانکم

آخری مرحلے میں غلاموں سے نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے اور حقیقت میں آیت خدا کے حق سے شروع ہوتی ہے اور



غلاموں کے حقوق پر ختم ہوتی ہے کیونکہ یہ حقوق ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ صرف یہی آیت نہیں ہے جس میں غلاموں کے متعلق وصیت کی گئی ہے بلکہ دوسری آیتوں میں بھی اس سلسلے میں بحث کی گئی ہے۔ اسلام نے ضمنی طور پر غلاموں کی تدریجی آزادی کے لیے ایک اچھا پروگرام مرتب کیا ہے جو ان کی مطلق آزادی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ انشاء اللہ ہم اس سلسلے میں متعلقہ آیتوں کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

ان الله لا يوجب من كان مختالا فنجورا

خداوند عالم آیت کے آخر میں اس جملے کے ساتھ ”خدا تکبر کرنے والے اور گھمنڈ کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا“ خبردار کر رہا ہے کہ جو شخص خدا کے حکم سے روگردانی کرے اور تکبر کی وجہ سے رشتہ داروں، مال باپ، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور دوستوں کے حقوق کا خیال نہ رکھے۔ وہ محبوب خدا اور بندہ خدا نہیں ہو سکتا اور جو لطف و کرم الہی کا مستحق نہ ہو وہ ہر خیر و برکت خوش قسمتی اور نیکی سے محروم ہے۔ اس معنی کی گواہی وہ روایت دیتی ہے جو اس آیت کے ذیل میں بیان کی گئی ہے جو یہ ہے: ایک صحابی رسول کہتے ہیں میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اسی آیت کی تلاوت کی تو حضور نے تکبر کی برائیاں اور اس کے نتائج اتنے بیان فرمائے کہ میں رونے لگا۔ اس پر آپ نے فرمایا: کیوں رو رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرا لباس عمدہ اور خوبصورت ہو تو اب مجھے ڈر ہے کہ اس عمل کی وجہ سے میں تکبر کرنے والوں کی صف میں شامل نہ ہو جاؤں۔ فرمایا: نہیں تو اہل جنت میں سے ہے اور یہ تکبر کی علامت نہیں ہے، تکبر یہ ہے کہ انسان حق کے مقابلے میں عاجزی اور انکساری سے کام نہ لے، اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے بلند تر سمجھے اور ان کی تحقیر کرے (اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے روگردانی کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت کے آخری جملے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرک اور لوگوں کے حقوق کی پامالی ضرور و تکبر کا سرچشمہ ہیں۔ مندرجہ بالا حقوق اور خصوصاً غلاموں، یتیموں اور محتاجوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے انتہائی تواضع اور عاجزی کی ضرورت ہے:

۳۷۔ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا  
آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ط وَاعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا  
مُهِينًا

لے یاد رکھیے کہ مثال مادہ خیال سے اس معنی میں ہے کہ کوئی شخص بعض خیالات کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھے۔ گھوڑے کو اس وجہ سے ”خیل“ کہا جاتا ہے کہ وہ دوڑتے ہوئے تکبروں کی طرح قدم اٹھاتا ہے اور ”نور“ ”نفر“ کے مادے سے اس شخص کے معنی میں ہے جو فخر و گھمنڈ کرتا ہو۔ اسی بنا پر یہاں ان دونوں نظموں میں یہ فرق ہے کہ ایک کے معنی ایسے تکبر کے ہیں جن میں ذہن گھمنڈ سے بھرا ہوا ہو اور دوسرے کے معنی خارجی تکبر کے ہیں یعنی اعمال و کردار سے تکبر نکلتا ہو



۳۸۔ وَالَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا  
بِالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ  
قَرِينًا ۝

۳۹۔ وَمَا ذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ  
اللَّهُ ۖ وَكَانَ اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ۝

ترجمہ

۳۸۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو بخل کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو بھی بخل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور جو کچھ خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے انہیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں (حقیقت میں ان کے اس عمل کا سرچشمہ کفر ہے) اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۳۸۔ وہ ایسے لوگ ہیں۔ جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ شیطان ان کا دوست اور ساتھی ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہو اس نے بُرا ساتھی چنا ہوا ہے۔

۳۹۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لے آتے اور خداوند عالم نے جو روزی انہیں عطا فرمائی ہے (اس میں سے اس کی راہ میں) خرچ کرتے اور خدا تعالیٰ ان سے آگاہ ہے (اور انہیں پوری سزا دے گا)۔

تفسیر

دکھلاؤ اور رضاٹے الہی

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیتوں کا ضمیر ہے جو متکبر اور بندہ ہوا و ہوس افراد کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ ایسے گئے گزرے لوگ ہیں جو نہ صرف لوگوں سے نیکی میں بخل کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی بخل پر ابھارتے ہیں (الذین یبخلون یا مرن الناس بالبخل)۔ علاوہ ازیں وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے جو کچھ انہیں مرحمت فرمایا ہے اُسے چھپا کر رکھیں اور یکتعون ما اتاهم اللہ من فضله، اس کے بعد ان کے انجام اور نتیجہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ ہم نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے (ولعتدنا للكفرین عذابًا مہینًا)۔







بندوں کو دیتے اور اس طرح اپنے لیے دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرتے۔ اب وہ کیوں اپنے طریق کار پر نظر ثانی نہیں کرتے باوجود اس کے کہ یہ راستہ زیادہ صاف، روشن تر اور مفید ترین ہے اور جو راستہ انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ سوائے نقصان اور بدبختی کے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتا۔

وَكَانَ اللَّهُ بَلِغًا

ہر حالت میں خداوند عالم ان کی نیتوں اور اعمال سے باخبر ہے اور اس کے مطابق انہیں جزا یا سزا دیتا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گذشتہ آیت جس میں ریاکارانہ مصارف کے متعلق گفتگو تھی وہاں مال کی نسبت خرچ کرنے والوں کی طرف ہی گئی تھی اس آیت میں مال کی نسبت ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر کا فرق تین نکات کی طرف اشارہ کر رہا ہو،

پہلا یہ کہ دکھلاوے کے اخراجات میں مال کے حلال و حرام ہونے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ حالانکہ جو مال خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کا حلال ہونا اور ”مصارفہ اللہ“ کا مصداق ہونا ضروری ہے۔

دوسرا یہ کہ جو کچھ دکھلاوے کے لیے خرچ ہوتا ہے وہاں خرچ کرنے والے افراد چونکہ مال کا تعلق اپنی ذات سے سمجھتے ہیں تو وہ تکبر کرنے اور احسان جتانے سے گریز نہیں کرتے حالانکہ جو مال خدا کے لیے خرچ ہو وہاں چونکہ توجہ اس بات کی طرف ہوتی ہے کہ یہ مال خدا نے انہیں دیا ہے۔ اب اگر اس کا کچھ حصہ اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو احسان جتانے کا مقام نہیں۔ اس لیے ہر قسم کے تکبر اور احسان سے پرہیز کرتے ہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ دکھلاوے کے خرچ کا تعلق زیادہ تر مال سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ روحانی اور معنوی سرمایہ سے بے بہرہ ہوتے ہیں پھر ان میں سے خرچ کیسے کریں۔ لیکن جو خدا تعالیٰ کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اس کا دامن وسیع ہے۔ وہ تمام مادی، روحانی اور باطنی نعمات کو چاہے ان کا تعلق مال، علم، اجتماعی وجاہت اور حیثیت ہی سے کیوں نہ ہو محیط ہے۔

۴۰۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً يُّضَعِفْهَا وَيُؤْتِ

مِنْ لَدُنْهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ

۴۰۔ خداوند عالم کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر نیک کام ہو تو اسے کئی گنا کر دیتا ہے (اور اس کے بدلے) اجر عظیم دیتا ہے۔

تفسیر

ذَرَّةٌ لگی چیز ہے ذرّۃً اُنسُل میں بہت ہی چھوٹی چھوٹی کو کہتے ہیں جو بڑی شکل سے دکھائی دیتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں غبار

کے بہت چھوٹے چھوٹے اجزا (کے معنی میں ہے) جو فضا میں معلق ہیں اور تاریک جگہوں کے اندر سورج کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے سورجوں اور روشن دانوں سے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنا ہاتھ مٹی یا اسی قسم کی چیز پر رکھ دے اور پھر اپنے ہاتھ پر پھونک مارے تو جو مٹی کے اجزا فضا میں بکھر جائیں گے ان میں سے ہر ایک کو ذرہ کہتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ہر چھوٹی چیز کو ذرہ کہنے لگے اور آجکل ایٹم کو بھی جو جسم کا کم سے کم جزو ہے ذرہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر گذشتہ زمانے میں انہیں بنا کے ذرے کہتے تھے تو اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ وہ جسم کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے اجزا سمجھے جاتے تھے۔ لیکن آج کی دنیا میں ثابت ہو چکا ہے کہ ایک جسم مرکب کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا (MOLECULES) اور جسم بسیط کے سب سے چھوٹے اجزا ایٹم (ATOMS) ہیں۔ جو سالموں سے بہت ہی چھوٹے ہیں۔ علمی اصطلاح میں ایٹم سے کہتے ہیں جو نہ صرف آنکھوں سے نہ دیکھا جاسکتا ہو بلکہ قوی ترین برقی مائیکروسکوپ سے بھی قابل دید نہیں ہے یہ صرف علمی فارمولوں اور مخصوص فوٹوگرافیوں کے ذریعے دیکھے جاتے ہیں جو بہت ہی چھوٹی چیزوں کو دیکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

مشقال کے معنی وزن اور بھاری پن کے ہیں۔ تو "مشقال ذرہ" سے مراد جسم کا ایک چھوٹے سے چھوٹا مسلم اور محسوس ذرہ ہے اور بوجھ کے معنی میں ہے آیت مندرجہ بالا کہتی ہے کہ خدا ذرہ بھر وزن کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور نہ صرف یہ کہ ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر نیک کام انجام پائے تو اسے کئی گنا کر دیتا ہے۔ اور اپنی طرف سے اس کے بدلے میں اجر عظیم بھی دیتا ہے۔ یہ آیت حقیقت میں بے ایمان اور ذمہ نیک افراد سے جن کی حالت گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے کہتی ہے کہ یہ سزا میں جو تمہیں مل رہی ہیں یہ تو تمہارے اعمال کا نتیجہ ہیں لیکن خدا کی طرف سے تم پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا اور اس کے برعکس اگر تم نیک و کفر کی بہانے خدا کی راہ اختیار کر لیتے تو کئی گنا اجر عظیم کے مستحق قرار پاتے۔

ضعف تو جبر ہے کہ ضعف یا مضاعف کے معنی لغت عرب میں اس چیز کے ہیں جس کے برابر یا اس سے چند گنا بڑھایا جائے۔ اس لیے زیر نظر آیت اور دوسری آیتوں میں جو یہ ہے کہ خدا کے راستے میں خرچ کرنے والوں کی جزا کبھی دس گنی ہوتی ہے کبھی سات سو گنی یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں بلکہ ہر صورت میں بندوں پر خدا کا لطف و کرم ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ان کے گناہوں کی سزا لگا ہوں کی مقدار سے زیادہ نہیں دیتا لیکن ان کی نیکیوں کی جزا نیکیوں کی مقدار سے کئی گنا زیادہ دیتا ہے۔

باقی رہی اس بات کی دلیل کہ خدا ظلم کیوں نہیں کرتا تو وہ واضح ہے کیونکہ ظلم و ستم یا توجہات کی وجہ سے ہوتا ہے یا ضرورت انسانی کمزوریوں اور نقائص کے سبب سے، اب جو ذات تمام چیزوں اور سب لوگوں کے متعلق علم رکھتی ہے اور سب سے بے نیاز ہے اور کسی قسم کی کمی اور نقص اس کی ذات اقدس میں نہیں ہے، اس کے لیے ظلم کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ظلم نہیں کر سکتا اور نہ یہ کہ اس کے بارے میں ظلم و ستم کا تصور نہیں کیا جاسکتا (جیسا کہ گروہ اشاعرہ کا خیال ہے)۔ بلکہ وہ باوجود قدرت کے، علیم و حکیم ہونے کی بنا پر ظلم نہیں کرتا، ہر چیز کو اس وسیع و عریض دنیا میں اپنی جگہ برقرار رکھتا ہے اور ہر شخص کے ساتھ اس کی لیاقت اور اس کے اعمال و کردار کے مطابق سلوک کرتا ہے۔

۴۱۔ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ



## شَهِيدًا

۴۱۔ یَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ  
الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا

ترجمہ

۴۱ اس دن ان کی کیا حالت ہوگی۔ جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ ان کے اعمال پر لائیں گے اور تجھے ان کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

۴۲ اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے اور پیغمبر کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے یہ تمنا کریں گے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ (وہ مٹی ہوتے اور) ان کی خاک زمین کی سطح سے ملی ہوتی (اور وہ بالکل محو اور خاموش ہو جاتے اور اس دن (سب گواہوں کے ہوتے ہوئے) خدا سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

تفسیر

فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید

گذشتہ آیتوں کے بعد جو بڑوں اور نیکوں کی سزا و جزا کے بارے میں تئیں یہ آیات روز قیامت کے گواہوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں پہلی آیت میں ہے: اس دن ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی جب ہم ہر امت کے لیے ان کے اعمال کا گواہ لے آئیں گے اور تمہیں ان کا گواہ مقرر کریں گے۔ اسی طرح جسم انسانی کے اعضاء کی گواہی اس زمین کی گواہی جس پر وہ رہتے تھے اور اس کے اعمال پر خدا کے فرشتوں کی گواہی کے علاوہ ہر پیغمبر بھی اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو سب سے آخری اور سب سے عظیم پیغمبر خدا ہیں اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ برے لوگ ان سب گواہوں کے ہوتے ہوئے کس طرح حقیقت کا انکار کر سکیں گے اور کیسے اپنے تئیں اپنے اعمال کی سزا سے بچا سکیں گے۔ اسی قسم کا مضمون کلام مجید کی چند دوسری آیتوں میں بھی ہے مثلاً بقرہ ۱۴۳، نمل ۱۸۹ اور حج ۷۸۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی امت کے اعمال کے متعلق پیغمبروں کی گواہی کس قسم کی ہوگی۔ اگر لفظ ھو لاء کا اشارہ مسلمانوں کی طرف ہو جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں تحریر ہے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا۔ چونکہ ہر نبی جب تک اپنی امت کے درمیان رہے تو ان کے اعمال دیکھتا ہے اور اس کے بعد اس کے معصوم جانشین ان کے اعمال پر گواہ و ناظر ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ قیامت کے دن خداوند عالم کے سوال کے جواب



میں عرض کریں گے:

ماقلت لہم الاما امرتني بہ ان اسجدوا للہ ربی وربکم وکنت علیہم شہیداً ما دمت

فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم وانت علی کل شیء شہید (المائدہ: ۱۸)

اے پالنے والے! تو نے مجھے جو حکم دیا ہے میں نے انہیں اس کے سوا کچھ نہیں کہا میں نے ان سے کہا کہ اس خدا کی جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے عبادت کرو اور جب تک میں ان کے درمیان تھا ان کے اعمال کا گواہ تھا لیکن جب سے تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھایا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ لفظ "ہؤلاء" گذشتہ امتوں کے گواہوں کی طرف اشارہ ہے یعنی اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم تجھے تمام گواہوں اور گذشتہ انبیاء پر گواہ قرار دیں گے اور کئی ایک روایات میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہر پیغمبر حیات و وفات ہر صورت میں باطنی اور روحانی مشاہدے کے ذریعے اپنی تمام امت کے حالات کا شاہد ہوگا اور حضورؐ کی روح اقدس بھی اسی طریقہ سے تمام گذشتہ امتوں اور اپنی امت کے حالات کو دیکھنے والی اور ان کے اعمال پر گواہ ہے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے امت کے صلحاء اور پرہیزگاری میں اعلیٰ مقام کے حامل افراد بھی اس قسم کی استعداد رکھتے ہوں۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی روح اقدس خلقت حضرت آدمؑ سے پہلے موجود تھی کیونکہ شہود کے معنی آگاہی اور موجود ہونے کے ہیں لیکن یہ تفسیر اس آیت کے ساتھ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نقل کی گئی ہے کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ اپنی امت پر تاحیات گواہ تھے (غور فرمائیے گا)۔

اگر شہادت کو عملی شہادت کے معنی میں لیں یعنی نمونہ کے ایک فرد کے اعمال جو باقی لوگوں کے اعمال جانچنے کی میزان اور پیمانہ ہیں تو اس صورت میں مندرجہ بالا تفسیر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ یعنی ہر پیغمبر اپنی مخصوص مہفتوں کی بنا پر اپنی امت کے اعمال کی جانچ کے لیے میزان و مقیاس ہے اور امت کے اچھے برے لوگوں کو ان کے ساتھ مشابہت رکھنے یا نہ رکھنے سے پہچانا جاسکتا ہے اور چونکہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے نبیوں میں سے بزرگ ترین ہستی ہیں اس لیے حضورؐ کے اعمال و صفات تمام نبیوں کے درجات جانچنے کے لیے معیار ہوں گے۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا شہادت اسی معنی میں آئی ہے کہ نہیں لیکن اس طرف توجہ کرنے سے کہ نمونہ کے انسانوں کے افکار و اعمال بھی عملی طور پر گواہی دیتے ہیں کہ ایک انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس حد تک روحانی اور باطنی درجات حاصل کرے تو یہ معنی بعید دکھائی نہیں دیتے۔ (غور فرمائیے گا)۔

یومئذ یؤد الذین کفروا وعصوا الرسول.....

۱۰ تفسیر نور الثقلین، تفسیر ربان آیت مذکورہ کے ذیل میں۔

۱۱ اس آیت سے حضرت عیسیٰؑ کا کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک الگ مفہوم رکھتی ہے۔ (مترجم)



جس وقت کافر اور خداوند عالم کے بھیجے ہوئے نبیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے لوگ اس عدالت الہی میں ناقابل انکار شہود اور گواہ دیکھیں گے تو وہ اپنے کیے پر اتنے پشیمان ہوں گے کہ وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ خاک ہوتے اور زمین کی مٹی کے برابر ہو جاتے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: **لَوْ تَسْوَى بِهِنَّ الْاَرْضُ**۔ سورہ نباہ کے آخر میں بھی اس طرح ہے:

وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا

اس وقت کافر کہے گا اے کاش میں خاک ہوتا۔

لیکن "تسوی" کی تعبیر ایک اور مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ اس کے علاوہ کہ کافر یہ آرزو کریں گے کہ وہ خاک ہو جائیں، یہ بھی چاہیں گے کہ ان کی خاک اور قبریں بھی زمین میں دب جائیں اور اس پاس کی زمینوں کے برابر ہو جائیں تاکہ وہ بالکل محو ہو جائیں۔ مگر وہ اس موقع پر کسی حقیقت کو نہ چھپاسکیں گے (وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا)۔ کیونکہ اس شہود اور گواہوں کی موجودگی میں وہ ٹکا نہ کر سکیں گے۔ البتہ یہ گفتگو ان دوسری آیات کے منافی نہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ بعض کافر قیامت کے دن بھی حقائق چھپائیں گے اور جھوٹ بولیں گے۔ کیونکہ ان کا جھوٹ شہود اور گواہوں سے پہلے ہو گا لیکن اس کے بعد جب انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے گی تو وہ تمام حقائق کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

حضرت امیر المومنین نے ایک خطبہ میں فرمایا:

خدا قیامت کے دن کچھ لوگوں کے لبوں پر مہر خاموشی مثبت کر دے گا تاکہ وہ بات نہ کر سکیں۔ تو ایسے میں ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے اور جسم کی کھال اپنے اعمال بیان کرے گی۔ غرض اس وقت کوئی شخص حقیقت کا انکار نہ کر سکے گا۔

بعض مفسرین نے اس کے یہ معنی بھی لکھے ہیں کہ لَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا سے مراد یہ ہے کہ وہ تمنا کریں گے کہ اے کاش جب وہ دنیا میں تھے تو پیغمبر اسلام کے بارے میں حقائق کو نہ چھپاتے۔ اس بنا پر یہ مذکورہ جملہ "لَوْ تَسْوَى بِهِنَّ الْاَرْضُ" پر عطف ہو گا۔ لیکن یہ تفسیر لَا يَكْتُمُونَ کے ظہور کے ساتھ جو فعل مضارع ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اگر یہ معنی مراد ہوتے تو پھر یوں کہا جاتا: **وَلَمْ يَكْتُمُوا**۔

۳۳۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا وَإِن كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ**

۱۸ سورۃ انعام کی آیت ۴۲ اور ۴۳ اور سورۃ مائدہ کی آیت ۱۸

۱۹ نور الثقلین جلد اول صفحہ ۲۸۲ منقول از تفسیر میاشی۔



الْغَائِطِ أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا  
صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوْهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللَّهَ  
كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ○

ترجمہ

۴۳ اے ایمان والو جب تم نشے میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ جب تک تم پر نہ سمجھ سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور اسی طرح جب تم جنابت کی حالت میں ہو جب تک غسل نہ کر لو مگر یہ کہ عالم مسافرت میں ہو، اب اگر تم بیمار یا مسافر ہو یا قضاے حاجت کی ہے اور یا عورتوں سے مباشرت کی ہے اور اس حالت میں تمہیں (وضو یا غسل کے لیے) پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔ اس طرح سے کہ اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اس سے مسح کرو خدا بخشنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

تفسیر

چند فقہی احکام

مذکورہ بالا آیت سے چند اسلامی احکام معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ نشے کی حالت میں نماز کی حرمت یعنی جو لوگ مست ہوں وہ نماز ادا نہیں کر سکتے اور ان کی نماز اس حالت میں باطل ہے۔ اس کا فلسفہ بھی واضح ہے کیونکہ نماز بندے کی خدا کے ساتھ گفتگو اور راز و نیاز ہے۔ اسے انتہائی توجہ اور ہوش مندی کے ساتھ انجام پانا چاہیے اور مست لوگ اس منزل سے دور اور بے خبر ہوتے ہیں یا ایبھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سكارى حتى تعلموا ما تقولون)۔

مکن ہے اس موقع پر کچھ لوگ یہ سوال کریں کہ کیا آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مشروبات اکمل کا پینا صرف اس صورت میں منع ہے جبکہ اس کی مستی نماز کی حالت تک باقی رہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ باقی حالات میں ان کا پینا جائز ہے۔ اس سوال کا مفصل جواب تو انشاء اللہ سورۃ مائدہ کی آیت ۹۰ کی تفسیر میں آئے گا۔ البتہ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام اپنے بہت سے احکامات کو عملی صورت دینے میں تدریجی طریقہ اختیار کرتا ہے مثلاً یہی مشروبات اکمل کا مسکو چند مرحلوں میں آیا ہے۔ پہلے پہل اس کا پینا ناپسندیدہ اور ذوقاً حسنا (نمل ۶۷) کے برعکس قرار دیا گیا بعد ازیں نشے کی حالت میں نماز سے منع فرمایا۔ اس کے بعد اس کے نفع اور نقصان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا کہ اس کے نقصانات فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں پھر آخری مرحلے میں اس سے قطعی اور صریحی نجات کی گئی ہے (مائدہ ۹۰)۔

اصولی طور پر ایک اجتماعی اور اخلاقی فساد کی جڑ کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جس سے ماحول بری طرح سے متاثر ہو رہا ہو، اس سے بہتر اور روشن تر اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ افراد کو آہستہ آہستہ اسے چھوڑنے پر آمادہ کیا جائے اور پھر آخری حکم دیا جائے۔

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ یہ آیت کسی طرح بھی شراب نوشی کے جواز پر دلالت نہیں کرتی بلکہ وہ صرف حالت نماز میں مستی کے بارے میں گھٹکو کر رہی ہے۔ نماز کی حالت کے علاوہ کے لیے خاموش ہے، یہاں تک کہ آخری حکم آجائے۔ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ نماز پنجگانہ کے اوقات خصوصاً اس زمانے میں جب کہ نماز عام طور پر پانچ وقتوں میں پڑھی جاتی تھی کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اب نماز بحالت جوش و حواس پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اوقات کے درمیانی فاصلے میں ایسی مشروبات سے جو نشہ آور ہیں کلی طور پر پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ اکثر اوقات شراب کا نشہ نماز کے وقت تک باقی رہتا ہے اور جوش و حواس برقرار نہیں رہتے۔ اس بنا پر زیر بحث آیت ایک طرح سے دائمی اور مسلسل تحریم کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ بہت سی روایتیں جو شیخہ سنی کتب میں آئی ہیں ان میں مندرجہ بالا آیت کے معنی نیند کی مستی کے لیے گئے ہیں۔ یعنی جب تک اچھی طرح نہ جاگ جاؤ نماز شروع نہ کرو جب تک تمہیں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کہہ رہے ہو یہ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کے لیے "حتیٰ تغلبوا ما نقلولون" کے مفہوم سے فائدہ اٹھایا گیا ہے "سکاری" سے نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہاں تک کہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اس حالت میں نماز پڑھنا جس میں انسان کے جوش و حواس پورے طور پر بجائے ہوں ممنوع ہے، چاہے وہ مستی کی حالت ہو یا اونگھ اور نیند کے خمار کے عالم میں۔ اس جملے سے ضمنی طور پر یہ استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ بہتر ہے کہ انسان سستی اور کم توجہ کی حالت میں بھی نماز نہ پڑھے کیونکہ اس حالت میں کمزوری سی پائی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر سے منقول ہے:

جب تم کسالت و سستی میں ہو یا اونگھ رہے ہو اور یا طبیعت بوجھل ہو تو ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو کیونکہ خداوند عالم

نے مومنین کو سستی کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔

۲۔ حالت جنابت میں نماز کا باطل ہونا۔ جس کی طرف "ولا جنباً" سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس حکم سے استنہاک ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: الا عابری سبیل (مگر یہ کہ مسافرت میں ہوں)۔ اگر مسافرت میں پانی نہ ملے تو پھر تیمم سے نماز پڑھو (اس کی تفصیل آگے آئے گی) لیکن اخبار و روایات میں اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی درج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آیت میں لفظ صلوٰۃ سے مراد نماز پڑھنے کی جگہ اور مسجد ہے۔ یعنی حالت جنابت میں مساجد میں داخل نہ ہوں۔ اس کے بعد ان لوگوں کو سستی قرار دیا ہے جو حالت جنابت میں مسجد سے گزریں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور اصحاب نبی کی ایک جماعت نے مسجد نبوی کے اطراف میں ایسے گھر بنائے

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۳ و تفسیر قرطبی جلد سوم صفحہ ۱۷۷۔

۲۔ نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۳ اس مضمون کے مشابہ صحیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے۔

۳۔ رسائل جلد اول صفحہ ۴۸۶۔

ہوئے تھے جن کے دروازے مسجد نبوی میں کھلتے تھے اور انہیں اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ جنابت کی حالت میں مسجد سے بلا توقف گزر جائیں۔

لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس تفسیر کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آیت میں لفظ صلوٰۃ دو معنی میں استعمال ہوا ہے ایک نماز اور دوسرا "محل نماز" کیونکہ زیر نظر آیت میں دو حکم بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ حالت نشہ میں نماز نہ پڑھی جائے اور دوسرا حالت جنابت میں نماز میں داخل نہ ہوں۔

جیسا کہ اصول میں ہم کہہ چکے ہیں ایک لفظ کا دو معنی میں استعمال شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن خلاف ظاہر ضرور ہے اور قرینہ کے بغیر جائز بھی نہیں ہے۔ البتہ روایات مندرجہ بالا اس کا قرینہ قرار دی جاسکتی ہیں۔

۳۔ غسل کر چکنے کے بعد نماز پڑھنے یا مسجد سے گزرنے کے جواز کو "حتی تغتسلوا" سے بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ اس کے بعد جو پانی نہ ملے یا کسی اور وجہ سے معذور ہوں ان کے لیے تیمم کا حکم بیان کیا گیا ہے؛ وان كنته مرضی او علی سفر یعنی اگر بیمار ہو جاؤ یا سفر میں ہو۔ درحقیقت اس مختصر عبارت میں تشریح تیمم کے تمام مواقع جمع ہیں۔ پہلا مقام وہ ہے جہاں پانی جسم کے لیے ضرور رسال ہو اور دوسرا مقام وہ ہے جہاں انسان کو پانی نہ ملے یا اس کے استعمال کی طاقت نہ ہو۔

پھر فرمایا: اوجاء احد منکم من الغائط ولاہتم النساء اس جملے سے تیمم کی ضرورت کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب قضائے حاجت سے فارغ ہو یا عورتوں سے ہم بستری کرو۔ فلم تجعدوا ماء۔ اور تمہیں پانی نہ ملے۔ فتیمموا صعباً کظیباً تو اس موقع پر پاکیزہ مٹی سے تیمم کرو۔ اس کے بعد تیمم کا طریقہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: فامسحوا بوجہکم وایدیکم اس کے بعد اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ حکم تمہارے لیے ایک قسم کی سہولت اور آسانی ہے۔ چونکہ خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

## چند اہم نکات

۱۔ فلم تجعدوا ماء کا جملہ جو اصطلاح کے مطابق فاء تفریع سے شروع ہوتا ہے اور "اوصلی سفر" سے مربوط ہے یعنی جس وقت تم سفر میں ہو تو ممکن ہے کہ پانی نہ مل سکے اور تمہیں تیمم کی ضرورت پڑے۔ کیونکہ انسان جب بستی میں ہو پھر تو ایسا بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جو بات صاحب المنار جیسے مفسرین نے لکھی ہے کہ "فقط مسافت ہی وضو کی بجائے تیمم کرنے کے لیے کافی ہے" بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ فاء تفرعی "فلم تجعدوا" میں اس بات کو باطل کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سفر میں کبھی پانی نہیں ملتا تو ایسے موقع پر تیمم کر لینا چاہیے نہ یہ کہ حالت سفر ہی میں تیمم جائز ہے۔ تعجب ہے کہ مولف مذکور اس سلسلے میں فقہاء پر تنقید کرتا ہے جبکہ مذکورہ تنقید کا یہاں کوئی مقام نہیں ہے۔

۲۔ لفظ "او" اوجاء احد منکم من الغائط کے جملوں میں "واق" کے معنی میں ہے کیونکہ بیماری یا مسافت تیمم کا سبب نہیں ہیں بلکہ ایسی حالت میں اگر اسباب وضو یا غسل حاصل نہ ہوں تو اس وقت تیمم واجب ہے۔

۳۔ اس آیت میں قرآن کے بیان کی نفاست و پاکیزگی دوسری بہت سی آیتوں کی طرح مکمل طور پر دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ جب





چاہتا ہے کہ فضائے حاجت کے متعلق گفتگو کرے تو ایسی تعبیر کو چنتا ہے جو مطلب سجادے اور نامناسب لفظ بھی استعمال نہ ہونے پائے اس لیے فرماتا ہے:

اوجاء احد منكم من الغائط اس کی وضاحت یوں ہے کہ غائط "بمخلاف اس مفہوم کے جو آجکل اس سے کہا جاتا ہے۔ اصل میں ایسی نشیبی زمین کے لیے بولا جاتا ہے جو انسان کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپانے اور اس زمانے میں بیا بانوں میں پھرنے والے اور مسافر لوگ فضائے حاجت کے لیے ایسی جگہوں پر جاتے تھے تاکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ بنا بریں اس جگہ کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص نشیبی جگہ سے آیا ہو جو عام طور پر فضائے حاجت کی طرف کنایہ ہے اور قابل توجہ و بے جا ہے کہ تم کی بجائے تم میں سے کوئی کا لفظ استعمال ہوا ہے تاکہ بیان کی نفاست بڑھ جائے (مخبر فرماتیے گا)۔

اسی طرح مباشرت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو "اولا مستمر النساء" یا عورتوں سے لمس کیا ہو کی تعبیر سے بھائی گیا ہے اور لفظ "لمس" ہم بستری کے لیے عمدہ کنایہ ہے۔

۴۔ تیمم کی باقی خصوصیات کے بارے میں منجملہ "صحیٰہ اطیبیاء" انشاء اللہ سورۃ مائدہ کی آیت ۶ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

### تیمم کا فلسفہ

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ زمین پر ہاتھ مارنے اور پھر انہیں پیشانی اور ہاتھوں کی پشت پر پھیرنے میں کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سی مٹی گندی بھی ہوتی ہے اور اس سے جراثیم بھی منتقل ہوتے ہیں۔ اس اعتراض کے جواب کے لیے دو نکتوں کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

الف۔ اخلاقی فائدہ۔ تیمم ایک عبادت ہے۔ اور عبادت کی روح اس میں اپنے حقیقی معنی میں ملبوہ گر ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان اپنی پیشانی کو جو بدن کا محترم ترین عضو ہے اس ہاتھ سے جو مٹی پر مارا گیا ہے مس کرتا ہے۔ تاکہ اس کی بارگاہ میں اپنی عاجزی و انکساری ظاہر کرے یعنی میری پیشانی اور ہاتھ تیرے سامنے انتہائی خشوع و خضوع کے لیے حاضر ہیں۔ اس کے بعد انسان نما زیادہ دوسری عبادتوں کو انتہائی خلوص اور عاجزی سے ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے جن میں وضو یا غسل کی شرط ہے۔ اسی طرح انکساری، عبودیت اور شکر گزاری کے جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے یہ عمل بہت مؤثر اور کارگر ہے۔

ب۔ حفظانِ صحت کا فائدہ؛ آج کی دنیا میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مٹی اپنے بہت سے جراثیموں (BACTERIAS) کی وجہ سے گندگیوں کو دور کر سکتی ہے۔ یہ جراثیم جن کا کام آلودہ کرنے والے مواد کا تجزیہ اور طرح طرح کی بدبو کو دور کرنا ہے زیادہ تر زمین کی سطح پر معمولی سی گہرائی میں جہاں سے ہوا اور سورج کی روشنی سے بخوبی فائدہ اٹھا سکیں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب مردہ جانور یا لاشیں زمین میں دفن کر دی جائیں اور اسی طرح سے دوسری چیزیں جو گندگی سے بھری ہوئی زمین پر پڑی ہوں، تھوڑے ہی

۷ غائط کا لفظ آجکل عمرنا انسانی فضلہ کے لیے بولا جاتا ہے۔

عرسے میں ان کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور جراثیموں کی وجہ سے وہ بدبو کا مرکز بن سکتے ہیں اور وہ بو کر رہ جاتا ہے۔  
 یہ مسلم ہے کہ اگر زمین میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو کرۂ زمین مدت قلیل میں بدبو کے ڈھیروں میں بدل جاتا۔ اسولی طور پر مٹی اینٹی  
 بائیوٹک (ANTIBIOTIC) اثر رکھتی ہے جو بہترین جراثیم کش ہے۔ اس بنا پر نہ صرف یہ کہ پاکیزہ مٹی گندی چیز نہیں بلکہ وہ گندگی کو  
 دور کرنے والی ہے اور اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حد تک پانی کی ہائشیٹی کرے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پانی حلال ہے یعنی  
 وہ جراثیم کو حل کر کے بہا لے جاتا ہے۔ لیکن مٹی انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔  
 البتہ تو جبر ہے کہ تیم کی مٹی مکمل طور پر پاک و پاکیزہ ہو۔ جیسا کہ قرآن اس کی عجیب و غریب تعبیر لفظ "طیباً" سے کرتا ہے۔  
 یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس سے وہ "صعید" مراد ہے جو مادہ "صعود" سے لیا گیا ہے۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ اس کام کے لیے  
 وہ مٹی چنی جائے جو سطح زمین پر سورج کی تپش اور اس کی روشنی کی زد میں ہو اور جو اور جراثیم مارنے والے جراثیموں سے بھری ہوئی  
 ہو۔ اگر اس قسم کی مٹی پاک و پاکیزہ بھی ہو تو اس سے تیم مندرجہ بالا اثرات رکھتا ہے (سورۃ مائدہ کی آیت ۶ کی ذیل میں اس  
 سلسلہ میں مزید بحث کی جائے گی)۔

۴۳۔ اَلْمُرْتَالِی الذِّیْنَ اَوْتُوا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتَابِ یَشْتَرُونَ الضَّلَالَۃَ  
 وَیُرِیْدُونَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ ۝  
 ۴۵۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَابِكُمْ ۗ وَكَفٰی بِاللّٰهِ وَٰلِیًّا ۗ وَكَفٰی بِاللّٰهِ  
 نَصِیْرًا ۝

ترجمہ

۴۳ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (خدا کی) کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا (اس کی بجائے کہ وہ اس سے اپنی  
 اور دوسروں کی ہدایت کریں) اس سے اپنے لیے گمراہی خریدتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔  
 ۴۵ خدا تمہارے دشمنوں سے آگاہ ہے (وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے) کافی ہے کہ خدا تمہارا ولی ہو اور کافی ہے  
 کہ وہ تمہارا ناصر و مددگار ہو۔

تفسیر

المرتالی الذین اوتوا نصیباً من الكتاب یشترون الضلالۃ ویریدون ان تضلوا السبیل۔  
 خداوند عالم اس آیت میں تعجب آمیز عبارت سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرماتا ہے فرماتا ہے: اس

گروہ کی حالت حیران کن ہے جو کتاب آسمانی کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے اور دوسروں کے لیے ہدایت و سعادت حاصل کرتے، گمراہی کا راستہ اپناتے ہیں اور تمہارے لیے بھی چاہتے ہیں کہ گمراہ ہو جاؤ۔ اس طریقے سے وہ چیز جو خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ تھی، ان کی بڑی نیتوں کی وجہ سے گمراہی اور وسیلہ گمراہی میں بدل گئی ہے کیونکہ وہ کبھی حقیقت کی تلاش میں کوشاں نہیں تھے۔ بلکہ ہر چیز کو نفاق، حسد اور مادیت کی سیاہ بینک سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے، اے لوگ! اگرچہ دوستی کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن یہ دراصل تمہارے جانی دشمن ہیں اور خدا ان سے آگاہ ہے (واللہ اعلم)۔ یا بعد انکم۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دشمنی ہوگی کہ وہ کبھی خیر خواہی کے لیے میں اور کبھی بدگوئی کی زبان میں تمہاری ہدایت اور سعادت کی مخالفت کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے برے مقاصد کی تکمیل کے درپے ہیں لیکن تم ان کی دشمنی سے رنگہراؤ۔ تم اکیلے نہیں ہو۔ یہی کافی ہے کہ خدا تمہارا رہبر ولی اور مددگار ہے۔ کو کفی باللہ مولیٰ و کفی باللہ نصیر (کیونکہ وہ کچھ نہ کر سکیں گے۔ اگر تم ان کی باتوں کو پاؤں کے نیچے روند ڈالو تو کسی قسم کا ڈر نہیں ہے۔

ضمناً "اور تو انصیبہا من لکتاب" (کتاب کا کچھ حصہ انہیں دیا گیا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ مکمل آسمانی کتاب "تورات" نہ تھی بلکہ اس کا کچھ حصہ تھا اور یہ بات تسلیم شدہ تاریخی حقائق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ تورات کے بہت سے اصلی حصے یا تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے یا وہ بالکل نیست و نابود کر دیئے گئے تھے۔

۳۶۔ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا وَيَحْرِفُونَ الكلمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَسْمَعُ غَيْرَ مَسْمُوعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِالسِّنْتِهِمْ وَطَعْنَا فِي الدِّينِ ۗ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأَسْمَعُ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمًا ۗ وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝

ترجمہ

۳۶۔ بعض یہودی تورات کے کچھ فقروں کو ان کے مقام سے بدل دیتے تھے اور (بجائے اس کے یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی) یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مخالفت کی اور نیز کہتے کہ سنو کہ ہرگز نہ سنو اور (بطور طنز کہتے "واعنا" یعنی) ہمیں بے وقوف بناؤ یہ اس لیے ہے تاکہ وہ اپنی زبان سے حقائق کو بدل ڈالیں اور دین خدا پر طعن و تشنیع کریں لیکن اگر وہ (اس ہٹ دھرمی اور اصرار کی بجائے) یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور ہماری بات کو سنو اور ہمیں مہلت دو تاکہ ہم حقائق کی ترمیم سیکھیں، تو یہ بات ان کے نفع میں تھی اور حقیقت کے ساتھ سازگار تھی۔ لیکن خدا نے انہیں ان



کے کفر کی وجہ سے اپنی رحمت سے محروم کر دیا۔ اس لیے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

یہودیوں کے کردار کا ایک اور رخ

یہ آیت گذشتہ آیتوں کے بعد بعض دشمنانِ اسلام کی کچھ اور صفیوں کی تشریح کرتی ہے اور ان کے بعض اعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پہلے یہ بتاتی ہے کہ ان کا کام حقائق کی تحریف اور احکامِ خدا کے چہرے کو مسخ کرنا تھا (من الذین ہادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ)۔ یہودیوں کا ایک گروہ کلماتِ خدا کو ان کی جگہ سے تبدیل کر دیتا تھا یہ تحریف نہ معلوم لفظی تھی کہ معنوی لیکن بعد کے جملے بتاتے ہیں کہ یہاں تحریف سے مراد تحریفِ لفظی اور تفسیرِ عبارت ہے کیونکہ اس جملے کے بعد فرماتا ہے (ویقولون سمعنا و عصینا) ہم نے سنا اور نافرمانی کی یعنی بجائے اس کے کہ سمعنا و اطعنا یعنی ہم نے سنا اور اطاعت کی کہیں کہتے ہیں ہم نے سن کر مخالفت کی اور یہ بالکل ان لوگوں کی طرح ہے جو بعض اوقات بطور استہزا کہتے ہیں: "آپ کا کہنا اور ہمارا بات پر کان نہ دھرنا" آیت کے دوسرے جملے بھی اسی مطلب کی گواہی دیتے ہیں۔

اس کے بعد ان کی عداوت آمیز جہارت اور بے ادبی کی گنگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ کہتے ہیں: و اسمع غیر مسمع "سنو کہی نہ سنو" اور اس طرح وہ ایک نادان اور جاہل گروہ بن کر حقائق کو بدلنے اور کتبِ آسمانی میں خیانت کرنے میں مصروف ہیں حالانکہ یہ کتابِ آسمانی فرعون جیسے ظالم و جابر کے چنگل سے ان کی نجات کا ماہصل ہے۔ انہوں نے استہزا اور مسخرہ پن جیسے نامرزاں حربے اختیار کر رکھے ہیں یہ حربے ہٹ دھرم اور غرور کرنے والوں کا ہتھیار ہیں مدہ کبھی ان باتوں کے علاوہ پاک دل مسلمانوں کے بعض جملوں سے جو وہ حضرت رسالت مآب کی خدمتِ اقدس میں عرض کرتے تھے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان جملوں کو دوسرے مطالب و معانی کا لباس پہنا کر استہزا اور مسخرہ کے طور پر استعمال کرتے تھے مثلاً "راعنا" جس کے معنی ہیں ہم سب سے رعایت کیجئے اور ہمیں ہدایت دیجئے"۔ سچے مسلمان دعوتِ اسلام کی ابتداء میں اس بنا پر کہ زیادہ اچھے اور بہتر طریقے سے آپ کی باتوں کو سنیں اور دل میں جگہ دیں حضرت رسول اکرم کے سامنے ایسے جملے عرض کرتے لیکن یہودیوں کا یہ گروہ اسے بگاڑ کر حضور کے سامنے اُسے دھرتا تھا۔ اس لفظ سے ان کی مراد اس کا عبرانی معنی تھا اور وہ یہ کہ "سنو کہی نہ سنو" یا پھر دوسرے عربی معنی یعنی ہمیں بے ہوش بناؤ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ظاہر کریں کہ خاکمِ بدنِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام لوگوں کو اُتو بنانا اور بے خبر رکھنا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے تھے تاکہ اپنی زبان سے حقائق کو اصلی صورت سے ہٹا دیں اور دینِ حق پر زبانِ اعتراض دراز کریں۔

۱۔ "راعنا" اگر "رعی" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی ہے "ہم سے مراعات کیجئے اور ہمیں ہدایت دیجئے" اور اگر "رعوت" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی ہے "ہمیں بے وقوف بنائیے"۔ یاد رہے کہ پہلی صورت میں "راعنا" میں نونِ شمش کے بغیر جوگا اور دوسری صورت میں شد کے ساتھ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی خاص طور پر نون پر شد دیتے تھے اور آخر پر اُسے کیسچ کر پڑھتے تھے۔

(لِيَأْتِيَ الْمُسْتَهْجَمَ وَطَعًا فِي الدِّينِ) جی (بروزن جی) کے معنی طناب وغیرہ کو لپیٹنا ہیں اور یہاں اول بدل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔  
 ولوا نلهم قالوا سمعنا واطعنا واسمع وانظرنا لكان خيرا لهم واطعوا  
 لیکن اگر وہ اس ہٹ دھرمی، اصرار، حق دشمنی اور بے ادبی کی بجائے سیدھی راہ اپناتے اور یہ کہتے کہ ہم نے خدا کا کام سنا  
 اور ہم نے اطاعت کی آپ ہماری گذارشات سنئے اور ہم سے رعایت کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے کہ ہم حقائق کو سمجھ سکیں تو یہ ان  
 کے فائدے میں ہوتا اور عدل منطلق اور ادب کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا۔  
 ولكن لعنهم الله بغير حساب فلا يؤمنون الا قليلا۔

لیکن وہ کفر، سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے رحمتِ خدا سے دور ہو گئے ہیں اور ان کے دل اس قدر مردہ ہو چکے ہیں کہ وہ جلدی  
 زندہ اور بیدار نہیں ہو سکتے۔ ان میں صرف تھوڑے سے لوگ پاک دل ہیں جو حقائق قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور حق کی باتوں  
 کو سنتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں۔

بعض لوگ اس جملے کو قرآن کی فیسی خبروں میں سے قرار دیتے ہیں کیونکہ جس طرح قرآن اس جملے میں خبر دیتا ہے اسلام کی  
 طویل تاریخ میں یہودیوں میں سے بہت ہی کم لوگ ایمان لائے اور اسلام سے وابستہ ہوئے باقی اُس دن سے آج تک اسلام  
 سے برسوں بیکار ہیں۔

۴۷- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آوَتْوَا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ  
 مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهَ فَنَرَدَهَا عَلَىٰ آدْبَارِهَا أَوْنَلْعَنَهُمْ كَمَا  
 لَعْنَا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۗ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ۝

۴۷ اے وہ لوگو کہ جنہیں اللہ کی کتاب دی گئی ہے! جو کچھ ہم نے (اپنے رسول پر) نازل کیا ہے اور جو ان نشانیوں سے  
 ہم آہنگ بھی ہے جو تمہارے پاس ہیں ایمان لے آؤ، اس سے پہلے کہ چہروں کو مسخ کر دیں اور پھر انہیں پشت  
 کی طرف پھیر دیں یا انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیں جیسا کہ ہم نے اصحابِ سبت کو دور کر دیا تھا اور خدا کا فرمان ہر  
 حالت میں روبرو عمل ہو کے رہتا ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرم افراد کی سرنوشت

يا ايها الذين آوتوا الكتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معكم

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں اہل کتاب کے بارے میں تھی یہاں انہی کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے وہ لوگو جنہیں آسمانی کتاب دی جا چکی ہے، قرآن مجید کی کیتوں پر ایمان لے آؤ جو کہ ان نشانیوں سے ہم آہنگ ہیں جو اس کے بارے میں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں اور مسلم ہے کہ ان نشانیوں کی موجودگی میں تم دوسرے لوگوں کی نسبت اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہو کہ اس پاک دین کے ماننے والے بن جاؤ۔

اس کے بعد انہیں دھمکی دیتا ہے کہ اس سے پہلے کہ تم دوسراؤں میں سے کسی ایک میں گرفتار ہو جاؤ حق کے سامنے تسلیم نہ کرو۔ پہلی سزا یہ کہ تمہارے چہروں کو کھلی طور پر نیست و نابود کر دیا جائے اور ان تمام اعضاء کو جن کے ذریعے تم حقائق کو دیکھتے، سنتے اور سمجھتے ہو مٹا دیں اور اس کے بعد تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں (من قبل ان نظمس وجوہا فتردها علی اذہارہا)۔ شاید یہ دوانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس جملہ سے مراد عقل و ہوش، آنکھ اور کان کا حقائق و واقعات زندگی کو نہ سمجھنے اور صراطِ مستقیم سے روگردانی کے لحاظ سے بیکار ہو جانا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

اس سے مراد ان کے چہروں کا راہِ راست و ہدایت محو کرنا ہے اور ان کو پشت کی طرف پھرنے سے مراد گمراہی ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ اہل کتاب خصوصاً یہودیوں نے ان تمام واضح نشانیوں کے باوجود حق کے سامنے سر نہ جھکایا اور جان بوجھ کر ضد اور دشمنی کے لیے آمادہ ہو گئے اور مختلف مقامات پر دانستہ طور پر خلاف بیانی اور مخالفت کی تکرار کی اور آہستہ آہستہ یہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی، گویا ان کے اندکار کھلی طور پر مسخ اور ان کی آنکھیں اور کان اندھے بہرے ہو گئے۔ اس قسم کے لوگ زندگی کی راہ میں ترقی کرنے کی بجائے پھیلے پاؤں پلٹ جاتے ہیں اور جو جان بوجھ کر حق کا انکار کرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے۔

حقیقت میں یہ سورہ بقرہ کی آیت ۶ کے مشابہ ہے۔ اس بنا پر ”طمس“ اور پشت کی طرف لوٹنے سے مراد فکری اور روحانی اور معنوی طور پر پشت کی طرف پلٹنا ہے۔

باقی رہی دوسری سزا جس کی انہیں دھمکی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اصحابِ سبت کی طرح اپنی رحمت سے دور کرنے کا (او فلنظہرکما لعنا اصحاب السبت)۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ ان دونوں دھمکیوں میں کیا فرق ہے لفظ ”اد“ کے ساتھ جس کے معنی ”یا“ ہیں یعنی ان میں سے ایک یا پھر یہ دوسرے پر عطف ہے۔

”طمس“ کے اصل معنی ہیں کسی چیز کے آثار کو مٹا دینا مثلاً اگر کسی عمارت کو ویران کر دیں اور اس کی جگہ بالکل صاف کر دیں اور سابقہ عمارت کے آثار کو ختم کر دیں۔ لیکن کنایہ کے طور پر اس چیز کو بھی کہا جاتا ہے جس کا اثر اور خاصیت ختم ہو جائے۔

مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۵۵۵ آیت مذکورہ کے ذیل میں ہے۔ اصحابِ سبت کے بارے میں تفصیل سورہ اعراف بیت ۱۶۲ تا ۱۶۷ کے ذیل میں آئے گی۔ یہ یہودیوں کا ایک گروہ تھا جسے حکم دیا گیا تھا کہ ہفتہ کے روز کام کاج نہ کرے لیکن ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کے فرمان کی مخالفت کی اور ماہی گیری کرتے رہے اور طغیان و سرکشی میں آخری حد تک جا پہنچے اور آخر کار دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔



بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ پہلی دھمکی سنوی پہلو رکھتی ہے اور دوسری دھمکی ظاہری اور سخی جسمانی کا پہلو رکھتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے: جس طرح ہم نے اصحابِ بہت کو اپنی رحمت سے دور کیا تھا ان کو بھی اپنی رحمت سے دور کر دیں گے۔ ہم جانتے ہیں (جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ سورۃ اعراف میں آئے گا) کہ اصحابِ بہت ظاہری طور پر سخی ہوئے تھے۔

بعض دوسرے لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہ لعنت اور خدا کی رحمت سے دوری بھی اس فرق کے ساتھ معنوی پہلو رکھتی ہے کہ پہلی دھمکی انحراف، گمراہی اور پشت کی طرف پلٹنے کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسری دھمکی کے معنی ہلاکت اور نیست و نابود ہونا ہیں کیونکہ لعنت کے ایک معنی ہلاکت بھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اہل کتاب اصرار اور مخالفتِ حق پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے شکست کھائیں گے یا نیست و نابود ہو جائیں گے۔ ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا ان کے بارے میں یہ دھمکی عمل میں لائی گئی کہ نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی دھمکی ان میں سے بہت سول کے بارے میں اور دوسری بعض کے بارے میں عمل میں آچکی ہے۔ اسلامی جنگوں میں ان کی بہت بڑی جماعت تباہ و برباد ہو گئی اور ان کی طاقت ختم ہو گئی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اس کے بعد بھی مختلف ملکوں میں بہت سخت تنگی اور مشکلات سے دوچار ہوئے اور ان کے بہت سے لوگ مارے گئے اور وہ اس وقت بھی بہت ہی بُرے اور خطرناک حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان دھمکیوں کی تاکید کے طور پر فرماتا ہے: فرمانِ خدا ہر حال میں رو بہ عمل ہو گا اور اُسے کوئی طاقت بھی نہ روک سکے گی (وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا)۔

۴۸۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ  
وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ افْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۴۸۔ خدا کبھی مشرک کو نہیں بخشے گا اور اس سے نیچے جو کچھ ہے وہ جسے چاہے (بشرطیکہ وہ اہمیت رکھتا ہو) بخش دے گا اور جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے وہ عظیم گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔

تفسیر

امید سے معمور آیت

مندرجہ بالا آیت صراحت سے بتاتی ہے کہ سب گناہ بخشے جاسکتے ہیں لیکن شرک کسی صورت میں نہ بخشا جائے گا مگر یہ کہتے چھوڑ دیں تو توبہ کر لیں اور موصد بن جائیں۔ دوسرے لفظوں میں کوئی گناہ بھی ایمان کو ختم نہیں کر سکتا جس طرح کہ کوئی نیک عمل بھی شرک

کی موجودگی میں انسان کو نجات نہیں دلوں گے (ان اللہ لا یغفر ان یشرک بملہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء)۔

اس آیت کا ربط گذشتہ آیات کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک، ایک طرح سے مشرک تھے۔ قرآن اس آیت کے ذریعے خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ وہ اس عقیدے کو ترک کر دیں کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جو بخشا نہیں جاسکتا۔ اس کے بعد آیت کے آخر میں اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: جو شخص خداوند عالم کے لیے شریک قرار دے اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے (و من یشرک باللہ فقد افترى اثماً عظیماً)۔

یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جو موصدین کو پروردگار عالم کے لطف و کرم سے اطمینان اور امید دلاتی ہیں کیونکہ اس آیت میں خدا نے شرک کے علاوہ باقی گناہوں کی بخشش کا امکان بیان کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق جو طبری مرحوم نے مجمع البیان میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے نقل کی ہے یہ آیت آیات قرآن میں سب سے زیادہ امید افزا ہے:

ما فی القرآن آیۃ ارجی عندی من ہذہ الایۃ

اور ابن عباس کے بقول یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو اہل ایمان کے لیے ہر اس چیز سے عزیز تر ہے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بڑے بڑے گناہ کر بیٹھتے ہیں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں اور وہ اسی بنا پر اپنی بقایا زندگی میں بخشش سے ناامید ہو کر گناہوں کی دلیل میں پھنس جاتے ہیں۔ خدا کی بخشش اور غنودہ و درگزر کی امید ہی وہ موخر ذریعہ ہے جو انہیں گناہ اور سرکشی سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس لیے یہ آیت حقیقت میں ہماری راہنمائی ایک تربیتی مسئلے کی طرف کرتی ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مغضربین اور متعدد روایات کے مطابق جو اس آیت کی ذیل میں نقل کی گئی ہیں، جرائم پیشہ اور وحشی افراد مثلاً اسلام کے رشید سپہ سالار حضرت حمزہ بن حضرت عبدالمطلب، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کا قاتل تک اس آیت کے نازل ہونے پر ایمان لے آتا ہے اور جرائم سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے، تو دوسرے گناہگاروں کے لیے بھی یہ امید پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اور جو گناہ وہ کر چکے ہیں اپنے آپ کو اس سے زیادہ آلودہ گناہ نہ کریں۔

اس موقع پر شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ آیت گناہوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کیونکہ اس میں شرک کے علاوہ باقی سب گناہوں کی بخشش کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس میں شرک نہیں کہ اس کی بخشش کے وعدے کا مقصد ایسا وعدہ نہیں ہے جس میں کوئی شرط اور پابندی نہ ہو بلکہ یہ ان افراد کے لیے ہے جو بخشش کی قابلیت اور اہلیت ظاہر کریں جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے مشیت اور خدا کی بخشش کا ذکر اس آیت میں اور دوسری آیتوں میں ہوا ہے حکمت الہی کے معنی میں ہے۔ کیونکہ خدا کی مشیت اور مشاکبھی حکمت سے جدا نہیں ہوتی اور یہ مسلم ہے کہ اس کی حکمت کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ لیاقت اور استعداد کے بغیر کسی کو غنودہ و بخشش کا مستحق قرار دے۔ اس بنا پر اس آیت کا تربیتی اور اصلاحی پہلو اس سے غلط فائدہ اٹھانے کی نسبت گنتی گناہ ہے۔

ملہ غنودہ و غفری سے ہے (بروزن فرد) قطع کرنے کے معنی میں ہے۔ اب اگر کسی سالم چیز کا کچھ حصہ کاٹ دیں تو وہ خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے بڑے کام مثلاً شرک اور جھوٹ کو بھی افراتہتے ہیں۔



## گناہوں کی بخشش کے اسباب

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت مسئلہ توبہ سے ربط نہیں رکھتی۔ کیونکہ توبہ اور ترک گناہ تو شرک سمیت تمام گناہوں کو دھو ڈالتا ہے، بلکہ اس سے مراد ایسے لوگوں کے لیے امکانِ عفو الہی ہے جنہیں توبہ کی توفیق نہیں ہوئی۔ یعنی اس سے پہلے کہ وہ اپنے کیے ہوئے گناہوں پر پشیمان ہوں یا پشیمانی کے بعد اپنے بُرے اعمال کی تلافی سے پہلے دنیا سے اٹھ جائیں۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کی بخشش کے کئی ایک ذریعے ہیں جن کا خلاصہ پانچ موضوعات میں کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ توبہ: گذشتہ گناہوں پر پشیمانی اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کے بخیر ارادے کے ساتھ صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا اور بُرے اعمال کی نیک اعمال کے ذریعے عملی طور پر تلافی کرنا۔ جو آیات اس معنی پر دلالت کرتی ہیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ

وہ خدا وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ (شوریٰ - ۲۵)

۲۔ بہت زیادہ نیک کام کرنا۔ یہ بھی بُرے اعمال کی بخشش کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

ان الحسنات يذھبن السيئات

نیک کام کچھ گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ (ہود - ۱۱۴)

۳۔ شفاعت: اس کی تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد اول میں آچکی ہے۔

۴۔ گناہانِ کبیرہ سے پرہیز کرنا، یہ بھی گناہانِ صغیرہ کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی تشریح اسی سورہ کی

آیت ۳۱ اور ۳۲ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

۵۔ عفو خداوندی۔ یہ بھی بعض صاحب استعداد افراد کو میسر آتی ہے جیسا کہ ہم اسی آیت کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

اب ہم دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ عفو الہی اس کی مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ کوئی معمولی اور بلا قید و شرط مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی مشیت اور ارادہ صرف ایسے افراد کے بارے میں ہے جو عملی طور پر کسی نہ کسی طریقے سے اپنی قابلیت اور اہلیت ظاہر کرتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ شرک کیوں قابلِ عفو و بخشش نہیں ہے۔ کیونکہ شرک اپنا رابطہ خداوند عالم سے بالکل توڑ دیتا ہے اور ایسے بُرے فعل کا مرتکب ہوتا ہے جو تمام ادیان اور فطرت کے قوانین کی بنیاد کے خلاف ہے۔

۴۹۔ اَلْمُتَرَاتِلِ الَّذِيْنَ يَزْكُوْنَ اَنْفُسَهُمْۙ بَلِ اللّٰهُ يَزِكِيْ مَنْ يَّشَاءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝



۵۔ اَنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلٰى اللّٰهِ الْكُذِبَ وَ كَفٰى بِهٖ  
اِثْمًا مُّبِيْنًا

ترجمہ

۴۹ کیا تو نے انہیں نہیں دیکھا جو اپنی تعریفیں کرتے ہیں (ان خود ستائیوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے)۔ لیکن خدا جس کی چاہتا ہے تعریف کرتا ہے اور ان پر تھوڑا سا بھی ظلم نہیں ہوگا۔  
۵۰ دیکھئے وہ کس طرح خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یہی واضح گناہ (ان کی سزا کے لیے) کافی ہے۔

شان نزول

بہت سی اسلامی تفاسیر میں اس آیت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے لیے کچھ خصوصیات اور امتیازات کے قائل تھے۔ چنانچہ آیات قرآنی میں ہے کہ کبھی وہ کہتے ہم خدا کے بیٹے ہیں، کبھی کہتے: ہمارے لیے بہشت مخصوص ہے اور ہمارے سوا کوئی وہاں نہیں جاسکتا (مائدہ ۱۸، بقرہ ۱۱۱) یہ آیتیں نازل ہوئیں اور ان کے باطل خیالات کا جواب دیا گیا۔

تفسیر

خود ستائی

المرء الى الذین ینزکون انفسہم

اس آیت میں ایک مذموم صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں بہت سے لوگ اور قومیں مبتلا ہیں اور وہ ہے خود ستائی۔ اپنے آپ کو نیک پاک ظاہر کرنا اور اپنے لیے فضیلتیں گھڑنا۔ آیت میں ہے: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی تعریفیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے: خدا جس کی چاہتا ہے تعریف کرتا ہے (بل اللہ ینزکی من یشاء)۔ صرف وہی ذات اقدس ہے جو حکمت و مشیت بالغہ کی رو سے کسی کی اور زیادتی کے بغیر بعض افراد کی ان کی قابلیت، لیاقت اور استعداد کے مطابق مدح کرتی ہے اور کبھی کسی شخص پر سوئی کی نوک کے برابر بھی ظلم نہیں کرتی: وَلَا یظلمون حتیلاً۔ حقیقت میں فضیلت وہی ہے جسے خداوند عالم

۱۷ یرزقون مادہ تزکیہ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں پاک سمھنا اور پاکیزگی سے پہنچانا بعض اوقات پاک کرنے، تربیت دینے اور رشد و ہدایت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ پاک کرنے کے معنی میں ہے۔ اگر یہ کام علی پہلو رکھتا ہو تو پسندیدہ ہے اور اگر صرف زبانی جمع خرچ ہو تو مذموم ہے۔

۱۸ فقیل لغت میں اس بہت ہی باریک اچھا لگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ بہت ہی چھوٹی چیزوں کے لیے کنیر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور دراصل یہ مادہ "فقل" سے ہے جس کے معنی ہیں "بٹا ہوا"۔

فضیلت قرار دے نہ کہ وہ جسے خود ستائی کرنے والے خود مرضی کی وجہ سے اپنے ساتھ چپال کر لیں اور یوں اپنے پروردگہ و رسول پر ظلم کریں۔ اگرچہ روئے سخن قوم یہود و نصاریٰ کی طرف ہے جو بغیر کسی دلیل کے غلط طور پر اپنے حق میں بعض امتیازات و خصوصیات کے قائل تھے اور اپنا تعارف معزز قوم و ملت کی حیثیت سے کراتے تھے۔ کبھی کہتے:

لن تمسنا النار الا ایاماً معدودة  
یعنی چند دنوں کے سوا جہنم کی آگ ہمیں ہرگز نہیں چھو سکتی۔ (بقرہ - ۸۰)  
کبھی کہتے:

نحن ابناء الله و احبائه

ہم خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں۔ (مائدہ - ۱۸)

لیکن یہ بات کسی قوم اور گروہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تمام افراد اور قومیں اس میں شامل ہیں جن میں یہ بُری عادت پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید سورہ نجم آیہ ۳۲ میں صراحت کے ساتھ سب مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

فلا تزكوا انفسكم هو اعلم بامن انتمی

خود ستائی نہ کرو، خدا پر ہیزگاروں کو خوب پہچانتا ہے۔

اس کا سرچشمہ وہی خود بینی، غرور اور گھمنڈ ہے جو آہستہ آہستہ خود ستائی کا روپ دھار لیتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ بری عادت بہت سی قوموں، بطبقوں اور افراد میں پائی جاتی ہے اور بہت سی معاشرتی بدعالیوں، لڑائی جھگڑوں اور تفریق طلبیوں کا سرچشمہ یہی بیماری ہے۔ گذشتہ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی بعض قومیں اسی جھوٹے احساس برتری کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسری قوموں سے بالاتر سمجھتی تھیں اور اسی سبب سے خود کو اس امر کا حقدار جانتی تھیں کہ انہیں اپنا غلام بنالیں۔ زمانہ جاہلیت کے عرب ہر قسم کی پس ماندگی اور فقر و فاقہ کے باوجود اپنے کو اعلیٰ نسل شمار کرتے تھے اور ان کے قبیلوں میں سے ہر ایک قبیلہ اپنے کو سب سے بڑھ چڑھ کر سمجھتا تھا موجودہ دور میں جرمن قوم یا نسل اسرائیل کی تفریق طلبی اور اپنی بڑائی کا احساس علاقائی اور عالمگیر جنگوں کا سرچشمہ بنی ہے۔ یہود و نصاریٰ صدر اسلام میں بھی دوسروں کی نسبت اسی قسم کے وہم میں گرفتار تھے۔ اسی لیے وہ حقائق اسلام کے سامنے بڑی مشکل سے سر جھکانے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ اسی بنا پر زیر نظر آیت میں قرآن شدت سے اس قسم کے توہمات اور برتری کی خواہشات کی سرکوبی کرتا ہے اور اسے افتر، خدا پر جھوٹ باندھنا اور بڑا گناہ شمار کرتا ہے، اور فرماتا ہے: وانظر کیف یفترون علیٰ الذکذب و کفی بہ اشعامہینا یعنی دیکھیے یہ گروہ کس طرح جھوٹے فضائل بنانے اور ان کو خدا کی طرف منسوب کرنے کے ذریعے خدا پر جھوٹ باندھتا ہے۔ اگر انہوں نے اس گناہ کے علاوہ اور کوئی گناہ نہ بھی کیا ہو تو یہی ان کی سزا کے لیے کافی ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علیؑ اپنے مشہور خطبہ صحام میں پرہیزگاروں کی ممتاز اور مخصوص صفوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

لا یرضون من اعمالہم القلیل ولا یتکثرون اکثرہم لکن یرضون من اعمالہم المستہمون ومن اعمالہم

مشفقون اذ اذکی احد منهم خاف معایقال له فیقول انا اعلم بنفسی من غیرمی وربی اعلم  
بی من نفسی اللهم لا تقواخذنی بما یقولون و جعلنی افضل مما یظنون و اغفر لی ما لا یعلمون .

وہ کبھی اپنے تھوڑے عمل پر راضی نہیں ہوتے اور کبھی اپنے زیادہ عمل کو بڑا نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے آپ کو بہر  
مالت میں فرائض کے انہماقی میں کوتاہ گردانتے ہیں اور اپنے اعمال سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ جب کوئی ان کی  
تعریف کرتا ہے تو جو کچھ وہ ان کے بارے میں کہتا ہے اسے سن کر انہیں دقت ہونے لگتی ہے کہ میں اپنی حالت  
کو دوسروں کی نسبت بہتر جانتا ہوں اور خدا مجھے مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ پالنے والے اس تعریف کے بدلے میں  
جو تعریف کرنے والے میرے بارے میں کرتے ہیں میری جواب طلبی نہ کرنا اور مجھے اس سے بھی زیادہ جویرگمان  
کرتے ہیں بلند و بالا اور برتر قرار دے اور میری وہ خطائیں جو ان کے علم میں نہیں ہیں بخش دے۔

۵۱۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اَوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْحَبِیْتِ  
وَ الطَّاغُوْتِ وَ یَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا هٰؤُلَاءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ  
اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ۝

۵۲۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ مَنْ یَلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِیْرًا ۝

ترجمہ  
۵۱ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں خدا کی کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے کہ وہ (اس کے باوجود) جبت و طاغوت  
ابت اور بت پرستوں پر ایمان رکھتے ہیں اور مشرکین سے کہتے ہیں کہ ہم ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں زیادہ  
ہدایت یافتہ ہیں۔

۵۲ وہ ایسے لوگ ہیں خداوند عالم نے جنہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور جسے خدا اپنی رحمت سے دور کر دے  
اس کا تجھے کوئی بھی مددگار نہیں ملے گا۔

### شان نزول

اکثر مفسرین مندرجہ بالا آیتوں کی شان نزول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جنگ احد کے واقعے کے بعد یہودیوں کے بزرگوں  
میں سے ایک شخص جس کا نام کعب بن اشرف تھا ستر آدمیوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ آیا تاکہ رسول اکرم کے خلاف اہل مکہ سے عہد و  
پیمان کرے اور جو معاہدہ حضور کے ساتھ تھا اسے توڑ دے۔ کعب ابوسفیان کے گھر گیا۔ ابوسفیان نے اس کا بڑا احترام کیا۔





باقی یہودی قریش کے مختلف گھروں میں الگ الگ مہمان رہے اہل مکہ میں سے کسی نے کعب سے کہا کہ تم بھی اہل کتاب ہو اور محمدؐ بھی صاحب کتاب ہیں تحقیقت یہ ہے کہ ہمیں ریشک ہے کہ یہ ایک سازش ہے جو ہمیں ختم کرنے کے لیے کی جا رہی ہے، اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ہم آپس میں عہد و پیمان کریں تو پہلی شرط یہ ہے کہ ان دو بتوں (دو بڑے بتوں کی طرف اشارہ کیا) کو سجدہ کرو اور ان پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد کعب نے اہل مکہ سے یہ پیش کش کی کہ تم میں سے اور تم میں سے اور تم میں سے ہم میں سے غار کعبہ کے پاس جائیں اور اپنے شکم غار کعبہ کی دیوار سے لگا کر کعبہ کے پروردگار سے عہد کریں کہ ہم محمدؐ سے جنگ کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ عرضیں یہ پروگرام طے پایا گیا۔ آخر میں ابوسفیان نے کعب کی طرف رخ کر کے کہا: تو ایک پڑھا لکھا آدمی ہے اور ہم جاہل اور ان پڑھ ہیں، تیرے خیال میں "ہم" اور "محمدؐ" میں سے کون حق سے زیادہ نزدیک ہے۔

کعب نے کہا: اپنا دین میرے سامنے تفصیل سے بیان کرو۔

ابوسفیان نے کہا: ہم ماجیوں کے لیے بڑے بڑے اونٹوں کی قربانی کرتے ہیں انہیں پانی پلاتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں، قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ اپنے پروردگار کے گھر کو آباد کرتے ہیں۔ اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور ہم سرزمین مکہ میں اللہ کے اہل ہیں۔ لیکن محمدؐ اپنے بزرگوں کے دین سے دست بردار ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے رشتہ داروں سے قطع رحمی کی ہے۔ خدا اور قدیمی دین سے نکل گیا ہے اور محمدؐ کا دین نیا اور نوخیز ہے۔

اس پر کعب نے کہا: خدا کی تمہارا دین محمدؐ کے دین سے بہتر ہے۔

اس وقت مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان باتوں کا جواب دیا گیا۔

## تفسیر سازشی لوگ

پہلی آیت اس شان نزول کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے یہودیوں کی ایک اور ناپسندیدہ صفت کی تصویر کشی کرتی ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر گروہ کے ساتھ سازشیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے بت پرستوں کو خوش کرنے کے لیے بتوں کے سامنے سجدہ بھی کر لیا اور جو کچھ انہوں نے عظمت اسلام اور صفات پیغمبرؐ دیکھی اور پڑھی تھیں انہیں نظر انداز کر دیا۔ یہاں تک کہ بت پرستوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے بے ہودہ اور برائیوں سے معمور مذہب کو اسلام سے بہتر قرار دے دیا باوجودیکہ وہ اہل کتاب تھے اور بت پرستوں کی نسبت اسلام سے ان کے مشترک مسائل کہیں زیادہ تھے۔ اسی لیے آیت بطور تعجب بیان کرتی ہے: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کتاب خدا کا کچھ حصہ رکھنے کے باوجود بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور باغیوں اور سرکشوں کے ساتھ اظہار ایمان کرتے ہیں! العتر الی الذین اوتوا نصیباً من الکتاب یؤمنون بالحبیب والظالمون)۔

اس پر بھی قناعت نہیں کی بلکہ انہوں نے کافروں سے کہا کہ تمہارا راستہ مسلمانوں کی نسبت ہدایت سے زیادہ قریب

ہے (ویقولون للذین کفروا هؤلاء اهدیٰ من الذین آمنوا سبیلاً)۔



## جبت و طاغوت

لفظ "جبت" قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں استعمال ہوا ہے۔ یہ اسم جامد ہے اس کے مشتقات نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ دراصل یہ حبشی زبان کا ایک لفظ ہے جو "جادو" یا "جادو گر" یا شیطان کے معنی میں ہے۔ پھر عربی زبان میں آکر اس معنی میں یا "بت" نیز "خدا" کے علاوہ ہر جہود کے لیے استعمال ہونے لگا کہا جاتا ہے کہ یہ اصل میں "ببس" تھا اس کے بعد اس کی "بس" "ت" سے بدل گئی۔ لفظ "طاغوت" قرآن میں آٹھ مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اس کی تفسیر پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۶ کی ذیل میں آچکی ہے کہ یہ طغیان کے مادہ سے مبالغہ کا صیغہ صداد و سرحد سے تجاوز کرنے کے معنی میں آتا ہے اور اس کے مفہوم میں ہر ایسی چیز شامل ہے جو حد سے تجاوز کرنے کا سبب بنے جن میں سے بت بھی ہیں۔ اس لیے بتوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اس بنا پر شیطان، بت، جابر و متکبر حاکم، خدا کے علاوہ ہر جہود اور ہر وہ راستہ جو غیر حق تک پہنچانے طاغوت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ زیر بحث آیت میں ان دونوں لفظوں سے کیا مراد ہے تو اس بارے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ دو بتوں کے نام ہیں جن کے سامنے مذکورہ داستان میں یہودیوں کے ایک گروہ نے سجدہ کیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ جبت کے معنی بت کے ہیں اور طاغوت کے معنی ہیں بت پرست یا بت کا مددگار جو بتوں سے باتیں کرنے کے نام پر کچھ چیزیں اور باتیں بتوں کی طرف سے نقل کرتے اور جھوٹ موٹ ان کی طرف نسبت دیتے تھے تاکہ لوگوں کو دھوکا دے سکیں۔ جو کچھ شانِ نازل اور تفسیر میں لکھا گیا ہے یہی مفہوم اس سے مناسبت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے بتوں کے سامنے سجدہ کیا اور بت پرستوں کے آگے بھی تسلیم غم کیا۔

اس کے بعد کی آیت میں اس قسم کی سازشیں کرنے والوں کا انجام بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خداوند عالم نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور جسے خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے دور کر دے اس کا تہمیں یا رو مددگار کہیں نہیں ملے گا (اولئک الذین لعنہم اللہ ومن یلعن اللہ فلن تجد لہ نصیراً)۔ آیت کے اعلان کے مطابق یہودی اپنی سنگین سازشوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے، آخر کار ناکام ہو کر شکست کھائی اور ان کے بارے میں قرآن کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

مندرجہ بالا آیتیں اگرچہ ایک خاص گروہ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن یہ تسلیم ہے کہ وہ انہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ ایسے تمام لوگوں کے لیے ہیں جو اپنے گھٹیا مقاصد حاصل کرنے کے لیے اپنی حیثیت و شخصیت بلکہ ایمان و اعتقاد کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اس قسم کی سازشیں کرنے والے دنیا اور آخرت میں رحمتِ خدا سے دور ہیں اور اکثر و بیشتر انہیں شکست سے دور چار ہونا پڑتا ہے۔

۱۔ تفسیر المنار جلد سوم، صفحہ ۳۵ اور بعض کے نزدیک یہ مصدر ہے، لیکن صفت اور صیغہ مبالغہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

۲۔ تفسیر تبیان اور تفسیر روح المعانی۔



یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا ناپسندیدہ جذبہ اس قوم میں ابھی تک شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے جس حالت میں بھی ہوں مکاری، فریب کاری اور دھوکا بازی سے سزا نہیں کھرتے۔ اسی وجہ سے وہ گذشتہ طویل تاریخ میں اور آج بھی شکست پر شکست کھا رہے ہیں۔

۵۳۔ اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذَا الْاَيُّوْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝

۵۴۔ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمْ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَا اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝

۵۵۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَعَتْهُ ۗ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝

ترجمہ

۵۳ کیا ان یہودیوں کا حکومت میں کوئی حصہ ہے (جو وہ چاہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ کریں) حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگوں کو ان کا کوئی حق نہ دیتے (اور تمام چیزیں اپنے ہی دائرہ اختیار میں رکھتے)۔

۵۴ یا یہ کہ وہ لوگوں کے ساتھ (پیغمبر اور ان کے اہل بیت سے) اس کے بدلے میں جو خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے انہیں مرحمت فرمایا ہے حسد کرتے ہیں۔ (وہ کیوں حسد کرتے ہیں) حالانکہ ہم نے آل ابراہیم کو (کہ یہودی بھی اسی خاندان سے ہیں) کتاب و حکمت عطا کی اور انہیں ایک عظیم حکومت عطا کی۔

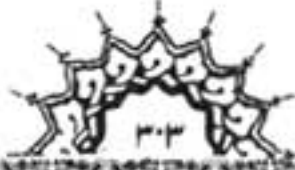
۵۵ ان میں سے ایک جماعت تو اس پر ایمان لے آئی لیکن ایک گروہ نے اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر دی اور جہنم کی آگ کا بھڑکتا شعلہ ان کے لیے کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ دو آیتوں کی تفسیر میں لکھا جا چکا ہے کہ یہودیوں نے مکہ کے بت پرستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہ گواہی دی کہ قریش کی بت پرستی مسلمانوں کی خدا پرستی سے بہتر ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود بتوں کے آگے ماتھا رکھا کہ اس آیت میں اس نکتہ کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ وہودیوں کی وجہ سے ان کا فیصلہ کوئی حیثیت اور قیمت نہیں رکھتا۔

۱۔ وہ معاشرے میں ایسی حیثیت، مرتبہ اور قدر و قیمت نہیں رکھتے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکیں۔ اس نے کبھی حکومت یا





انصاف کی خدمت انہیں نہیں سونپی کہ وہ اس کام کی طرف قدم بڑھا سکیں ۱ امر لہم نصیب من الملك)۔ اس کے علاوہ وہ کوئی مادی، روحانی، معنوی اور باطنی طور پر لوگوں پر حکومت کرنے کی یاقوت و قابلیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان میں دوسروں پر سبزو سر کرنے کی روح ہی نہیں۔ اگر انہیں یہ حیثیت مل بھی جائے تو وہ کسی شخص کو کوئی حق دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے بلکہ تمام اختیارات اور ضمانتیں اپنے ساتھ مخصوص کر لیں گے (فان لا یؤتوہ الناس نفیراً)۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہودیوں کا جذبہ انصاف ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ یا تو اپنے حق میں فیصلہ دیتے ہیں یا پھر ان کے حق میں جو ان کی راہ پر گامزن ہوں، اس لیے مسلمان کبھی اس قسم کی باتوں سے پریشان نہ ہوں۔

۲۔ اس قسم کے غلط فیصلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے حسد کی بنا پر ہیں۔ اس وجہ سے ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ وہ کفرانِ نعمت اور ظلم و ستم کی وجہ سے مقام نبوت و حکومت اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں۔ اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ یہ الہی منصب کسی کے سپرد کیا جائے۔ اس لیے وہ پیغمبر اسلام اور ان کے خاندان سے جنہیں اس نعمت الہی سے نوازا گیا ہے حسد کرتے ہیں اور اس قسم کے بے بنیاد فیصلوں سے اپنی حسد کی آگ پر پانی پھٹرکتے ہیں (امر یحسدون الناس علی ما ائتھم اللہ من فضلہ)۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور خاندان بنی ہاشم کو یہ منصب ملنے پر کیوں تعجب کرتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں اور حسد کرتے ہیں جبکہ خداوند عالم نے آل ابراہیم کو آسمانی کتاب، حکمت و دانش اور وسیع حکومت (حضرت موسیٰ، سلیمان اور داؤد کی دی۔ لیکن افسوس کہ تم ناخلف لوگوں نے وہ قیمتی معنوی اور مادی سرمائے شرارت اور قسوت و بے رحمی کے ہاتھوں ضائع کر دیئے (فقد آتینا آل ابراہیم الكتاب والحکمة واتیناھم مدینا عظیمیاً)۔

جو کچھ ہم تحریر کر چکے ہیں اس سے واضح ہو گیا ہے کہ "امر یحسدون الناس" میں "ناس" سے مراد پیغمبر اکرم اور ان کا خاندان ہے۔ کیونکہ ناس کے معنی ہیں "لوگوں کی ایک جماعت" اور اس کا اطلاق صرف ایک شخص (پیغمبر اسلام) پر جب تک کوئی قرینہ موجود نہ ہو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ "ناس" اسم جمع ہے اور جمع کی ضمیر جو اس آیت میں اس لفظ کی طرف پلٹ رہی ہے وہ بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ آل ابراہیم (ابراہیم کا خاندان) دوسرا قرینہ ہے کہ "ناس" سے مراد حضرت رسول اکرم اور آپ کے اہل بیت ہیں۔ کیونکہ قرینہ مقابل سے یہی تمیز نکلتا ہے کہ اگر ہم نے خاندان بنی ہاشم کو اس قسم کی عظمت و برتری دی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہم حضرت ابراہیم کے خاندان کو اس کی یاقوت کی بنا پر معنوی اور مادی مرتبہ اور حیثیت بخش چکے ہیں۔ بہت سی روایتیں جو اہل سنت اور شیعہ کتب میں آئی ہیں ان میں یہ وضاحت موجود ہے کہ "ناس" سے مراد خاندانِ پیغمبر ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے ذیل میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان میں رسول، انبیاء اور پیشوا بنائے ہیں (اس کے بعد خداوند عالم یہودیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے) تم اس کا تو اعتراف کرتے ہو لیکن آل محمد کے بارے میں انکار

۱۔ فقیرانہ فقر (بروزن فقر) سے ہے اس کا مطلب ہے کسی چیز کو اس قدر کمنا کہ آخر کار اس میں گدھا اور سوراخ ہو جائے اور منقار (چونچ) کو بھی اسی لیے منقاد کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فقیر بہت چھوٹا سا گودا ہوتا ہے جو کھجور کی پشت پر کھائی دیتا ہے اور زیادہ تر بہت ہی چھوٹی چیزوں کے لیے کنایہ ہے۔



کہتے ہوئے

دوسری حدیث میں ہے کہ اس آیت کے بارے میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

نحن المحسودون

ہم ہیں کہ جن پر دشمنوں نے حسد کیا ہے

تفسیر درمنثور نے ابن منذر سے اور طبرانی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ وہ اس آیت کے بارے میں کہتے تھے:

اس آیت میں "ناس" سے مراد ہم ہیں نہ کہ اور لوگ۔

اس کے بعد قرآن الگی آیت میں فرماتا ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کا ایک گروہ اس آسمانی کتاب پر ایمان لایا جو حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہوئی تھی اور کچھ لوگ نہ صرف یہ کہ وہ ایمان نہیں لائے بلکہ وہ اس کی تبلیغ اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ ان کے لیے جہنم کی آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ کافی ہے (فمنہم من امن بالہ ومنہم من صد عنہ وکنیٰ یحییٰ منہم سعینا۔ اسی طرح اس کتاب آسمانی سے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ بھی اسی عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

حاسدانہ جرائم

حسد جے فارسی زبان میں رشک کہتے ہیں اس کے معنی دوسروں کی نعمت کا زوال ہے، چاہے وہ نعمت حسد کرنے والے کو ملے نہ ملے۔ اس بنا پر حاسد کی آرزو اور خواہش کامرکز ویران کرنا اور ویران ہونا ہی ہے نہ یہ کہ وہ سرمایہ یا نعمت اُسے مل جائے۔

۱۔ حاسد اپنی تمام یا زیادہ تر بدنی و فکری طاقتوں کو جنہیں اجتماعی اور معاشرتی مقاصد اور اغراض میں صرف ہونا چاہیے جو کچھ موجود ہے اسے نابود اور ویران کرنے کے لیے خرچ کر دیتا ہے۔ اس طرح اپنے وجود اور معاشرے کو تباہ و برباد کرتا ہے۔

۲۔ حسد دنیا کے بہت سے فسادات کی جڑ ہے۔ اگر قتل پوری، ظلم و ستم اور زیادتیوں کے اصلی اسباب و وجوہات کا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے ایک بڑے حصے کی علت اور بنیاد حسد ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُسے آگ کی چنگاری سے تشبیہ دی گئی ہے جو حسد کرنے والے کے وجود یا اس معاشرے کو جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے خطرے میں ڈال دے۔ ایک عالم کا قول ہے کہ حسد اور بدخواہی سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے اُسے سعادت اور نیک نیتی کا بدترین دشمن سمجھنا چاہیے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ایسے درس اور ادارے جن کی بنیاد حاسد اور متعصب لوگ رکھتے ہیں وہ پس ماندہ ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حاسد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو چھپے دھکیل دے اور یہ چیز روح ترقی و کمال کے خلاف ہے۔

۳۔ ان سب باتوں کے علاوہ حسد جسم انسانی پر مضر اثرات ڈالتا ہے۔ عام طور پر حسد کرنے والے رنجیدہ دل اور اعصاب اور دوسرے مختلف اعضائے جسم کے لحاظ سے زیادہ تر دکھ درد اور بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کیونکہ آج یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ جسمانی بیماریوں کے اکثر نفسیاتی اسباب و عوامل ہوتے ہیں اور دور حاضر کی ڈاکٹری میں تفصیلی مباحث روح جسمانی کی بیماریوں

۱۔ ورنہ تفسیر برہان بلد اول صفحہ ۳۷۶ اور تفسیر روح المعانی میں بھی اسی مضمون کی ایک حدیث منقول ہے، (روح المعانی جلد پنجم صفحہ ۵۲)۔



کے عنوان سے نظر آتی ہیں جو اس قسم کی بیماریوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ رہبرانِ اسلام سے مروی روایات میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ ایک روایت میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

صحة الجسد من قلة الحسد

تندرستی جسد کی کمی کی وجہ سے ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

العجب لغفلة الحساد عن سلامة الاجساد.

تعجب ہے کہ حسد کرنے والے اپنے جسم کی سلامتی سے بالکل غافل ہیں۔

یہاں تک کہ بعض احادیث میں ہے کہ حسدِ مسود کو نقصان پہنچانے سے پہلے حاسد کو نقصان پہنچاتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے

مار ڈالتا ہے۔

۴۔ حسدِ باطنی اور روحانی طور پر وسعتِ قلب و فکر کی کمی، نادانی، ایمان کی کمزوری، کوتاہ فکری اور نقص کی نشانی ہے۔ یہ کچھ حاسد

دراصل اپنے آپ کو مسود کے مرتبہ تک پہنچنے سے عاجز پاتا ہے۔ اس لیے وہ مسود کو پیچھے دھکیلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اس

کے علاوہ وہ عملی طور پر خداوندِ عالم کی حکمت پر جو ان نعمتوں کا اصل سرچشمہ ہے، اعتراض کرتا ہے اور خداوندِ عالم کی طرف سے نعمتیں پانے والوں

پر انگلیاں اٹھاتا ہے۔ اسی لیے حضرت امام جعفر صادقؑ علیہ السلام فرماتے ہیں:

الحسد اصله من عمى القلب والجحود لفضل الله تعالى وهما جناحان للكفر وبالْحسد

ووقع ابن آدم في حسرة الابد وهلك مهلكا لا ينجو منه ابداً

حسد اور بدخواہی دل کی تاریکی اور اندھا پن ہے اور اس کا سرچشمہ خدا کی نعمتوں کا انکار ہے اور یہ دونوں (دل

کا اندھا پن اور خدا کی بخشش پر اعتراض) کفر کے دو پیر ہیں۔ حسد کے سبب سے فرزند آدم ہمیشہ کی حسرت میں ڈوب

گی اور ایسی ہلاکت میں گرا ہے جس سے ہرگز رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔

خداوندِ عالم قرآن میں فرماتا ہے:

سب سے پہلا قتل جو روئے زمین پر ہوا اس کا سبب حسد تھا۔

حضرت امیر المومنین علیؑ سے نبی البلاغہ میں منقول ہے:

ان الحسد يأكل الايمان كما تأكل النار الحطب

حسد ایمان کو آہستہ آہستہ اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ دھیرے دھیرے لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

۱۔ مستدک الوسائل جلد ۲ صفحہ ۳۲۷۔

۲۔ مانند - ۲۷۔

۳۔ نبی البلاغہ خطبہ ۸۶۔





کیونکہ حسد کرنے والے کی خدا کی حکمت اور عدالت سے بدگمانی آہستہ آہستہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہی بدگمانی ہے جو اسے ایمان کی وادی سے نکال کر جہنم کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ حسد کے بہت سے روحانی، مادی، انفرادی اور اجتماعی نقصانات ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے یہ دراصل ان کی ایک فہرست ہے۔

۵۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيٰتِنَا سَوْفَ نُصَلِّيْهِمْ نَارًا ط كَلِمًا نُّضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بِهَا لَنْهُمْ جُلُوْدٌ اٰخَرٰهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

۵۷۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ط لَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيْهَا مُّطَهَّرَةٌ ۝

ترجمہ

۵۶ وہ لوگ جو ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں عنقریب ہم انہیں آگ میں ڈال دیں گے۔ جب ان کی جلد جل جائے گی ہم انہیں دوسری جلد دیں گے تاکہ وہ سزا کا مزہ چکھتے رہیں۔ خدا تو انہما کو در اور حکیم ہے (وہ گناہوں کے مطابق سزا دے گا)۔

۵۷ اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ عنقریب باغات بہشت میں داخل ہوں گے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور انہیں ایسے گھنے سایوں میں لے جائیں گے جو منقطع نہ ہوں گے۔

تفسیر

گذشتہ آیتوں کے بعد ان دو آیتوں میں ایماندار اور بے ایمان کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ پہلی آیت اعلان کرتی ہے کہ ہم کافروں کو آگ میں ڈالیں گے اور جس وقت ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو دوسری کھال آگادیں گے تاکہ وہ خداوند عالم کی سزا کا دیر تک مزہ چکھیں (ان الذین کفروا بآیاتنا سوف نصلیہم نارا کلمنا نضجت جلودہم بہا لہم جلودا غیرہا لیدو قوا العذاب ۝)۔

ن نصلیہم صلی کے مادہ سے آگ میں ڈالنے اور آگ میں جلنے یا آگ سے گرم ہونے کے معنی میں ہے۔ "نضجت" نضج کے مادہ سے جھن جانے کے معنی میں ہے۔



کھال کے تبدیل ہونے کا سبب بظاہر یہ ہے کہ ممکن ہے جلد کے جل جانے کے بعد دردمحسوس ہو۔ مگر اس وجہ سے تاکہ سزا میں تخفیف نہ ہو بلکہ وہ پورے زور پر ہے اس کے جسم پر نئی جلد چڑھا دی جائے گی۔ یہ حق عدالت کو پافول تلے روندنے اور خدا کے حکم سے من موڑنے پر اصرار کا نتیجہ ہے۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خدا اس قسم کی سزا دینے پر قادر و توانا ہے اور صاحب حکمت بھی ہے وہ سزا کے مطابق سزا دیتا ہے (ان اللہ کان عزیزاً حکیمًا)۔

اس کے بعد میں آنے والی آیت میں ان افراد کو جو ایمان اور عمل صالح رکھتے وائے ہیں وعدہ کرتے ہیں کہ وہ انہیں بہت جلد جنت کے ان باغوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں داخل کرے گے جہاں ایک ابدی اور جاودانی زندگی ہوگی۔ اس کے علاوہ انہیں پاک بیویاں دی جائیں گی جو ان کی روح اور جسم کی تسکین اور آرام کا سبب ہوں گی اور وہ ایسے درختوں کے سائے میں زندگی بسر کریں گے جو اس دنیا کی دھستی پھاؤں کے خلاف ہمیشہ رہنے والے سائے ہوں گے۔ وہاں کبھی گرمی کی بو اور سردی کی بو کا گزر نہ ہوگا

والذین آمنوا وعملوا الصالحات سندخلہم جنات تجري من تحتها الانهار ينخالون فيها ابداً لم يفتأوا فيها ولا يحزنون ولا يظلمون فيها شيء

یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ ان دونوں آیتوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ اور موازنہ کرنے سے رحمت الہی کی وسعت اور اس کی رحمت کا اس کے غضب سے بڑھ چڑھ کر ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلی آیت میں کفار کو سزا دینے کا وعدہ کرنے کے لیے لفظ "سوف" کا ذکر فرمایا ہے جبکہ دوسری آیت میں ایماندار افراد کے لیے "س" کے لفظ سے (سندخلہم) جزا کا وعدہ کیا ہے۔ عربی ادب میں ہے کہ "سوف" عام طور پر مستقبل بعید کے لیے اور "س" مستقبل قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ دونوں آیتیں قیامت کے دن سے متعلق ہیں اور اس دنیا میں بدکاروں کی سزا اور نیکیوں کی جزا ہماری نسبت فاصلہ زمانی کے لحاظ سے یکساں ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ خدا کی رحمت کی سرعت و وسعت اور غضب کی دوری اور اس کی حد بندی کی طرف اشارہ ہو جائے اور یہ اس کی مانند ہے جیسے ہم دعاؤں میں پڑھتے ہیں:

یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ ذات اقدس جس کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

مکن ہے کہ کچھ لوگ یہ اعتراض کریں کہ آیات مندرجہ بالا کہتی ہیں کہ جس وقت بدکاروں کی جلد جلے گی تو ہم اس کی جگہ دوسری جلد دے دیں گے تاکہ وہ سزائے الہی میں گرفتار نہ رہیں۔ گنہگار جلد کی بجائے بے گناہ نئی جلد کو سزا دینا عدالت خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔

مشہور و معروف مادہ پرست ابن ابی العوجاء نے جو حضرت امام جعفر صادق کا ہم عصر تھا بالکل یہی سوال آپ سے کیا تھا اور

انہیں لفظ "نخل" سے سایہ کے معنی میں ہے اور یہاں تاکید کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ نخل ظلیل گنے سائے کے معنی دیتا ہے اور یہ کن یہ ہے ہمیشہ رہنے والے خوشگوار گنے سائے کے لیے۔



آیت مندرجہ بالا پڑھ کر کہا تھا:

ما ذنب الغیر

نئی جلد اور کھال کا کیا قصور ہے۔

حضرت امام صادقؑ نے اسے مختصر لیکن پر معانی جواب دیا فرمایا:

ہی ہو ہی غیرہا

یعنی نئی جلد وہی پرانی جلد ہے باوجود اس کے کہ اس کی بجائے ہے۔

ابن ابی العوجاء جانتا تھا کہ اس مختصر سی عبارت میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ اس لیے کہنے لگا۔

مثل لی فی ذلک شیئا من امر الدنیا

اس سلسلے میں میرے لیے کوئی مثال دیکھئے۔

امام نے فرمایا:

اربعیت لوان رجلا اخذ بسنۃ فکسرھا بشعر وھا فی ملبنھا فھی ہی ہو ہی غیرہا

یہ اس طرح ہے کہ ایک شخص اینٹ کو توڑتا ہے اور ریزہ ریزہ کر کے دوبارہ سانچے میں ڈال دیتا ہے اور نئی اینٹ

بناتا ہے۔ تو یہ دوسری اینٹ وہی پہلی اینٹ ہے باوجود اس کے کہ نئی اینٹ بھی ہے اس کا اصلی مادہ محفوظ ہے

صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔

اس روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نئی جلد اسی پرانی جلد سے تیار ہوگی۔ ضمناً یاد رکھیے کہ حقیقت میں سزا و جزا انسان کی روح

اور قوتِ ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔ جسم تو صرف سزا و جزا کو روح کی طرف منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

۵۸۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَتَّقُوا وَالْاٰمَنَاتِ اِلٰى اٰهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ

النّٰسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۵۸ خداوند عالم تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل

کے مطابق فیصلہ کرو۔ خدا تمہیں اچھی نصیحت اور وعظ کرتا ہے۔ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

عہ عباسی شیخ و احتجاج طبرسی۔



## شان نزول

تفسیر مجمع البیان اور دوسری اسلامی تفسیروں میں ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت پیغمبر اکرم ﷺ فتح مہین کے ساتھ شہر مکہ میں داخل ہوئے اور عثمان بن طلحہ کو جو خانہ کعبہ کا کلید بردار تھا طلب فرمایا اور اس سے چابی لی تاکہ خانہ خدا کو بتوں سے پاک و صاف کریں۔ حضرت عباس نے جو حضرت رسول اکرم ﷺ کے چچا تھے، اس کام سے فراغت پانے کے بعد تقاضا کیا کہ خدا کے گھر کی چابی انہیں دے کر بیت اللہ کی کلید برداری کا منصب ان کے سپرد کر دیں۔ یہ منصب عربوں میں ایک بلند و بالا مرتبہ تھا اور گویا عباس چاہتے تھے کہ اپنے بھتیجے کے اجتماعی اور سیاسی اثر و رسوخ سے ذاتی نفع حاصل کریں لیکن پیغمبر اکرم ﷺ نے اس تقاضا کے خلاف خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کرنے کے بعد کعبہ کا دروازہ بند کر کے یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے: ان الله يأمر بالعرفہ و النہی عن المنکر و الاعداء الی اہلہا چابی عثمان بن طلحہ ہی کو دے دی۔

تفسیر

## دواہم اسلامی قانون

زیر نظر آیت اگرچہ بہت سی دوسری آیتوں کی طرح خاص موقع اور محل پر نازل ہوئی ہے لیکن واضح ہے کہ اس سے ایک عام حکم کا پتہ چلتا ہے آیت تفصیل سے بتاتی ہے کہ خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو دے دو۔ واضح ہے کہ یہاں امانت کا لفظ ایک وسیع معنی میں ہے اور وہ ہر قسم کی مادی اور روحانی چیزوں اور امور پر محیط ہے ہر مسلمان اس آیت کے مطابق ذمہ دار ہے کہ کسی کی امانت میں کسی استثناء کے بغیر خیانت نہ کرے۔ صاحب امانت مسلمان ہو کہ غیر مسلم اور یہ حقیقت میں اسلام میں حقوق انسانی کا مسلمان ہے جس میں تمام انسان برابر ہیں۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا شان نزول میں امانت صرف ایک مادی امانت نہیں تھی اور دوسرا فریق مشرک تھا۔

آیت کے دوسرے حصے میں ایک اور اہم قانون کی طرف اشارہ ہے اور وہ ہے حکومت اور قضاوت میں عدالت آیت خبردار کرتی ہے کہ خدا نے تمہیں یہ بھی حکم دیا ہے کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدالت کے مطابق حکم دو (واذا حکمت بین الناس ان تحکمو بالعدل لہم کے بعد ان دونوں احکام کی تاکید کے طور پر فرماتا ہے: خدا تمہیں بہترین وعظ و نصیحت کرتا ہے وان الله نعمما یعظکم بہ) پھر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہر حالت میں خدا تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔ وہ تمہاری باتوں کو بھی سنتا ہے اور تمہارے کاموں کو بھی دیکھتا ہے (ان الله کان مسمیعا بصیرا) یہ قانون بھی کلی اور عمومی ہے اور

کے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی اس لیے وہ مندرجہ بالا شان نزول کو صحیح نہیں مانتے تاہم چاہے یہ شان نزول درست ہو یا نہ ہو اس اہم قانون پر جو آیت سے نکلتا ہے کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔



ہر قسم کی قضاوت اور فیصلہ پر حاوی ہے۔ چاہے وہ بڑے امور سے تعلق رکھتا ہو یا چھوٹوں سے۔ یہاں تک اسلامی احادیث میں مرقوم ہے کہ ایک دن دو چھوٹے چھوٹے بچوں نے تحریر لکھی تھی اور وہ دونوں اپنا فیصلہ کرانے کے لیے حضرت امام سنی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت علیؑ نے جو اس معاملے کو دیکھ رہے تھے اپنے فرزند ارجمند سے فرمایا:

يا بنی النظر کیف تحکم فان هذا حکم واللہ سألک عنہ یوم القیامۃ

میرے نور نظر خوب خوب غور کرو کہ کیا فیصلہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی قضاوت ہے اور خدا قیامت کے دن تجھ سے اس کے بارے میں سوال کرے گا کیلئے

یہ دونوں اہم اسلامی قانون یعنی حفظِ امانت اور قضاوت میں عدالت ایک پاکیزہ انسانی معاشرے کا سنگ میل ہیں۔ کوئی معاشرہ چاہے وہ مادی ہو کہ روحانی ان ہر دو اصولوں پر عمل پیرا ہوئے بغیر منظم نہیں ہو سکتا۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اموال ثروت، دوفاخر کی ذمہ داریاں، انسانی سرمائے، ثقافتی اور تاریخی دستاویزات، میراث اور ترکہ سب خدائی امانتیں ہیں۔ جو معاشرے کے مختلف افراد کے سپرد ہوتی ہیں اور سب کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اپنی امانتوں کی حفاظت کریں۔ انہیں ان کے اصلی مالکوں کو دینے کی کوشش کریں اور ان میں کسی طرح خیانت نہ کریں۔

دوسرا یہ کہ ہمیشہ معاشرہ میں اختلاف، تضاد اور خواہشات کا ٹکڑا تو پایا جاتا ہے عا دلانہ قضاوت کے ذریعے اس کا حل اور فیصلہ کرنا چاہیے تاکہ سوسائٹی اور سماج سے گروہ بندی، بے جا امتیازات اور ظلم و ستم ختم ہو جائے۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں امانت صرف ان اموال تک محدود نہیں جن کو لوگ ایک دوسرے کے سپرد کرتے ہیں۔ بلکہ علماء اور دانشمند بھی معاشرے کے امانتدار ہیں۔ جن کا یہ فریضہ ہے کہ وہ حقائق کو نہ چھپائیں۔ یہاں تک کہ اولاد بھی انسان کے پاس خدا کی امانت ہے۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی کی جائے تو یہ بھی امانت میں خیانت ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا اپنا وجود اور ہستی اور وہ متعلق اور قابلیتیں جو خدا نے اُسے مرحمت فرمائی ہیں سب خداوند عالم کی امانتیں ہیں، جن کے بارے میں انسان ذمہ دار ہے کہ ان کی حفاظت کی کوشش کرے۔ جسم و روح کی استعداد، جوانی کی طاقت اور فکری صلاحیت کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کرنا چاہیے اسی لیے تو انسان خود کوشی تو کیا اپنے آپ کو کسی قسم کا ضرر بھی نہیں پہنچا سکتا۔ یہاں تک کہ بعض اسلامی احادیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سرکارِ علوم اور امانت کی امانتیں جنہیں ہر امام آنے والے امام کے سپرد کرتا ہے، وہ بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں یعنی

یہ بات لائق توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں امانت کی ادائیگی کو عدالت پر مقدم رکھا گیا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ مسئلہ عدالت ہمیشہ فیصلہ میں خیانت کے موقع پر ضروری ہوتا ہے کیونکہ اصل اور بنیاد یہ ہے کہ سب لوگ امین ہوں لیکن اگر ایک فرد یا کئی افراد اس سے روگردانی کریں تو عدالت کی نوبت آتی ہے کہ انہیں ان کے فریضہ سے آشنا کیا جائے۔



## اسلام میں امانت اور عدالت کی اہمیت

اسلامی کتب اور مصادر میں امانت اور عدالت کے بارے میں اتنی تاکید کی گئی ہے جو باقی احکام میں بہت کم نظر آتی ہے ذیل کی چند حدیثیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔

۱۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

لا تنتظروا الی طول رکوع الرجل و مسجوده فان ذلك شیء اعتاده فلو ترکہ استوحش و لکن انظروا الی صدق حدیثہ و اداء امانتہ

کسی شخص کے صرف طویل رکوع و سجود کو نہ دیکھو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ اس کا عادی ہو چکا ہو اور اب اُسے چھوڑنے سے اُسے وحشت ہوتی ہو البتہ بات میں اس کی سچائی اور اس کی امانت کی ادائیگی کی طرف دیکھو۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ ہی سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

حضرت امیر المؤمنین علیؑ نے جو مرتبہ اور مقام پیغمبر اسلامؐ کے ہاں پایادہ بات میں سچائی اور امانت کی ادائیگی کی وجہ سے تھا۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک ماننے والے سے فرمایا:

ان ضارب علی بالسیف قاتلوا نتمعنی واستنصحنی واستشارنی ثم قبلت ذلك منه لادیت الیہ الامانۃ۔

اگر حضرت امیر المؤمنین علیؑ کا قاتل میرے پاس کوئی امانت رکھتا یا مجھ سے نصیحت طلب کرتا یا مجھ سے مشورہ دیتا اور میں ان امور کے لیے تیار ہو جاتا، تو میں یقیناً حق امانت ادا کرتا۔

۴۔ جو روایات شیعوں کی کتب میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہیں ان میں آپؐ کا یہ روشن اور عظیم فرمان بھی ہے:

أیة المنافق ثلاث اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف و اذا ائتمن خان

منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

۵۔ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

جب لڑائی جھگڑے کے طرفین تمہارے پاس آئیں تو ان کی طرف دیکھو اور ان سے گفتگو کی مقدار اور کیفیت میں مساوات اور عدالت کو پیش نظر رکھو۔

حدیث کی عربی عبارت یوں ہے: سو بین الخصمین فی لحظک و لفظک

۱۔ اے، ۲۔ نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

۳۔ صحیح ترمذی و نسائی، بحوالہ المنار۔ یہی مضمون سفینۃ البحار میں ہے۔

۴۔ مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۴۔





۵۹- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ  
مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ  
تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ  
تَأْوِيلًا

ترجمہ

۵۹ اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو اور جب کسی چیز میں جھگڑو تو اگر  
خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے خدا اور پیغمبر کی طرف لوٹا دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام واقعتاً  
بہت اچھا ہے۔

تفسیر

یہ آیت اور بعد کی چند آیتیں ایک اہم ترین اسلامی مسئلے یعنی مسئلہ رہبری کے بارے میں بحث کر رہی ہیں اور مسلمانوں کے  
مختلف دینی اور اجتماعی مسائل میں حقیقی مراجع (جن کی طرف رجوع کیا جائے) کو شخص اور متعین کرتی ہیں سب سے پہلے ایمانداروں  
کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خداوند عالم کی اطاعت کریں اور یہ بات روشن ہے کہ ایک ایماندار شخص پر واجب ہے کہ اس کی تمام  
اطاعتوں کی انتہا خداوند عالم کی اطاعت پر ہو اور اس کے حکم کے مطابق ہر قسم کی رہبری کا سرچشمہ اس کی ذات گرامی ہو۔ کیونکہ  
جہاں ہستی کا مالک تکوینی اور حاکم اعلیٰ وہی ہے۔ اس لیے ہر قسم کی حاکمیت، مالکیت اسی کے فرمان کے مطابق ہونا چاہیے  
(یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ)۔

دوسرے مرحلے میں پیغمبر اکرم کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ رسول جو معصوم ہے اور کبھی ہوا و ہوس سے بات نہیں کرتا۔  
پیغمبر جو لوگوں میں خدائی نمائندہ ہے جس کی بات خدا کی بات ہے، اُسے یہ مرتبہ بلند مقام خداوند عالم نے مرحمت فرمایا ہے  
اس وجہ سے کہ خدا کی اطاعت تو اس کی ذات کی خالقیت و حاکمیت کی بنا پر ہے لیکن حضور کی اطاعت فرمان پروردگار کی وجہ سے  
ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا بالذات واجب اطاعت ہے اور پیغمبر بالغیر واجب اطاعت ہیں۔ شاید آیت میں اطیعوا کا  
تکرار اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دونوں اطاعتوں میں یہ فرق ہے (واطیعوا الرسول)۔

تیسرے مرحلے میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے جو اسلامی معاشرے میں سے ہو اور لوگوں کے دین و دنیا کی حفاظت کے  
اولوالامر کون ہیں؟

اس بارے میں مفسرین اسلام میں بہت اختلاف ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے:

۱ - اہل سنت کے کچھ مفسرین کا نظریہ ہے کہ اولوالا امر سے مراد ہر زمانے اور ہر ماحول سے تعلق رکھنے والے بادشاہ اور صاحبان اقتدار ہیں۔ وہ اس میں کسی استثناء کے قائل نہیں ہیں۔ اس نظریے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر حکومت کی چاہے وہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو پیروی کریں۔ چاہے وہ تاتاریوں کی حکومت کیوں نہ ہو۔

۲ - بعض دوسرے مفسرین مثلاً صاحب تفسیر المنار و صاحب تفسیر فلال القرآن وغیرہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اولوالا امر سے مراد عام طبقات کے نمائندے، سربراہ، حکام، علماء اور کوائف زندگی کے تمام عہدہ دار ہیں لیکن مطلق طور پر نہیں اور کسی شرط، قید اور پابندی کے بغیر نہیں بلکہ ان کی اطاعت کے لیے یہ پابندی اور شرط ہے کہ ان کے احکام اسلام کے مقرر کردہ احکام کے خلاف نہ ہوں۔

۳ - بعض دوسرے مفسرین کا اعتقاد ہے کہ اولوالا امر سے مراد وہ معنوی اور فکری رہنما یعنی علماء ہیں جو عادل ہوں اور کتاب و سنت سے مکمل آگاہی رکھتے ہوں۔

۴ - بعض اہل سنت کے مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اس لفظ سے مراد پہلے چار خلفاء ہیں اور یہ لفظ انہی تک محدود ہے اس وجہ سے دوسرے زمانوں میں اولوالا امر نہ ہوگا۔

۵ - بعض مفسرین اولوالا امر سے مراد اصحابِ پیغمبر لیتے ہیں۔

۶ - اولوالا امر کی تفسیر میں ایک اور احتمال یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اسلامی لشکروں کے سپہ سالار ہیں۔

۷ - تمام شیعہ مفسرین اس سلسلے میں ایک متفق نظریہ رکھتے ہیں کہ اولوالا امر سے مراد ائمہ معصومین ہیں۔ جن کو تمام امور زندگی میں اسلامی معاشرے کی مادی اور روحانی رہنمائی خدا اور پیغمبر کی طرف سے سپرد کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہ لفظ کسی پروردگار پر نہیں آتا۔ البتہ ایسے لوگ جو ان کی طرف سے کسی مرتبے یا عہدے کے لیے مقرر کیے جائیں اور اسلامی معاشرے کے کسی عہدہ پر فائز ہوں تو معینہ شرائط کے ساتھ ان کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ اولوالا امر ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اولوالا امر کے نمائندے ہیں۔ اب مندرجہ بالا تفسیر کی تحقیق اور مطالعہ کے لیے پوری توجہ دہی سے توجہ دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پہلی تفسیر کسی طرح بھی مفہوم آیت اور تعلیمات اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتی لیکن نہیں ہے ہر حکومت کی اطاعت و پیروی کسی قید و شرط کے بغیر خدا و رسول کی اطاعت کے ساتھ ملا دی جائے۔ اسی بنا پر شیعہ مفسرین کے علاوہ اہل سنت کے بڑے بڑے مفسرین نے بھی اس کی نفی کی ہے۔

دوسری تفسیر بھی آیت کے معانی و مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں کیونکہ آیت اولوالا امر کی اطاعت کو بغیر کسی قید و شرط کے لازم اور واجب قرار دیتی ہے۔

تیسری تفسیر یعنی اولوالا امر کی تفسیر کتاب و سنت سے آگاہ علماء عادل کے ساتھ کرنا بھی آیت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ علماء کی اطاعت بھی کچھ شرائط سے مشروط ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی بات کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ اس وجہ سے اگر وہ اشتباہ میں پڑ جائیں (چونکہ وہ معصوم نہیں ہیں اس لیے انہیں اشتباہ ہو سکتا ہے) یا اور کسی وجہ سے حق سے منہ موڑ لیں تو

اس صورت میں ان کی اطاعت ضروری نہیں ہوگی جبکہ آیت اولوالامر کی اطاعت مطلق اطاعت پیغمبر کی طرح لازم قرار دے رہی ہے علاوہ ازیں علماء کی اطاعت تو ان احکام میں ہے جن کا وہ کتاب و سنت سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی اطاعت خدا تعالیٰ اور پیغمبر کی اطاعت کے علاوہ اور کچھ نہیں اس لیے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

چوتھی تفسیر اولوالامر (کو پہلے چار خلفاء تک محدود کر دینا) تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام میں لفظ اولوالامر کا کوئی مصداق نہیں ہے علاوہ ازیں اس شخص سے جس کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

پانچویں اور چھٹی تفسیر میں اس کو صحابہ یا افسران لشکر کے ساتھ مخصوص کرنا، اس پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اہل سنت کے بعض مفسرین جیسے مصر کے مشہور عالم محمد عبدہ اور معروف مفسر فخر الدین کی بعض باتوں کے مطابق اولوالامر کے معنی ہیں جنہیں دوسرے نمبر پر بیان کیا گیا ہے۔ ان کی نظر میں اس کے مجموعی مفہوم میں اسلامی معاشرے کے مختلف طبقوں کے نمائندے وہ عالم ہوں یا حاکم اور دوسرے طبقوں کے نمائندے شامل ہیں۔ وہ انہیں کچھ شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ اولوالامر مانتے ہیں اور ان شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ جیسا کہ ”منکم“ سے معلوم ہوتا ہے، ان کا حکم کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو، وہ اپنے اختیار سے حکم دیں نہ کہ مجبوری سے، وہ مسلمانوں کے مصالح کے مطابق حکم دیں اور صرف انہی مسائل کا حکم دے سکتے ہیں جن میں وفات کا انہیں حق ہے نہ کہ عبادات اور ان چیزوں کا جو کہ اسلام نے مقرر اور زمین کر دی ہیں۔ وہ اس مسئلہ کا حکم دینے کا حق رکھتے ہیں جس کے بارے میں نص شرعی نہ ہو ان سب چیزوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سب متفقہ طور پر اپنا نظریہ پیش کریں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تمام امت یا ان کے سب نمائندے مل کر غلطی نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ امت اجتماعی طور پر معصوم ہے۔ ان شرطوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قسم کے حکم کی اطاعت مطلق طور پر ہر قسم کی پابندی کے بغیر رسول اکرم کی اطاعت کی طرح واجب ہوگی (اس گفتگو کا نچوڑ یہ ہے کہ اجماع امت حجت ہے) لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر میں بھی کئی مشکلات موجود ہیں۔ کیونکہ اول تو اجتماعی مسائل میں فکر و نظر کا اتفاق بہت ہی کم مواقع پر ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے زیادہ تر معاملات و واقعات میں ہمیشہ بے چینی اور بے اطمینانی رہے گی۔ اگر وہ اکثریت کے نظریہ کو قبول بھی کرنا چاہیں تو پھر یہ مشکل سامنے آئے گا کہ اکثریت کبھی معصوم نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی اطاعت مطلق ہونے کی حیثیت سے لازمی نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ علم اصول میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ امام معصوم کو نکال کر تمام امت کے معصوم ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس تفسیر کے طرفداروں نے ایک شرط کا ذکر کیا ہے جو یہ ہے کہ ان کا حکم کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بات کی تشخیص کہ یہ حکم کتاب و سنت کے مطابق ہے کہ مخالف، کون کرے گا یقیناً مجتہدین اور کتاب و سنت سے آگاہ علماء ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ تو اس تحریر کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مجتہدین اور علماء کی اجازت کے بغیر اولوالامر کی اطاعت جائز نہیں کیونکہ اہل علم کی اطاعت تو اولوالامر کی اطاعت سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے اور یہ مفہوم ظاہر بظاہر آیت شریفینہ کے مطابق نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے علماء کو بھی اولوالامر کا جزو قرار دیا ہے لیکن حقیقت میں اس تفسیر کے مطابق اہل علم باقی طبقاتی نمائندوں کی نسبت مرجع عالی تر اور ناظر کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ دوسرے کیونکہ علماء اور دانشمندانہ دو سروں کی نسبت یہ بہتر جانتے ہیں کہ کوئی چیز



کتاب و سنت کی نظر سے درست ہے یا نہیں۔ اس بنا پر وہ مرجع اعلیٰ ہوں گے۔ اور یہ مندرجہ بالا تفسیر کے ساتھ موافق نہیں ہے اس بنا پر مذکور تفسیر کئی پہلوؤں سے اشکالات کا سامنا ہے واحد تفسیر جو مذکورہ اعتراضات کی زد میں نہیں آسکتی وہ ساتویں تفسیر ہی ہے یعنی اولوالامر سے مراد معصوم رہبر اور ائمہ ہیں (کیونکہ یہ تفسیر اس وجوب اطاعت کے اطلاق کے ساتھ ہے جس کا مندرجہ بالا آیت سے پتہ چلتا ہے۔ اور یہ اس کے ساتھ سو فی صد موافقت رکھتی ہے کیونکہ مقام "عصمت" ایسے امام کے ہر خطا گناہ اور اشتباہ سے محفوظ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ اس لیے اس کا ہر حکم فرمانِ بغیر کی طرح کسی قید و شرط کے بغیر واجب اطاعت ہے اور یہ اس امر کی استدلال رکھتا ہے کہ رسول کی اطاعت کا ہم ردیٹ اور ہم پلہ قرار پائے۔ یہاں تک کہ "اطیعوا" کی تکرار کے بغیر اس کا عطف رسول پر ہو۔

## ایک قابل توجہ بات

بعض مشہور علمائے اہل سنت نے بھی جن میں سے مشہور و معروف مفسر غزالی رازی بھی ہیں اس آیت کے بارے میں اپنی تحریر کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں خداوند عالم جس شخص کی اطاعت کو قطعی طور پر بے چون و چرا لازم قرار دے یقیناً اسے معصوم ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ معصوم عن الخطا نہ ہوگا تو وہ خطا کرے گا اور خدا تعالیٰ نے اس کی اطاعت لازم قرار دی ہے اور اس کی پیروی خطا کے باوجود ضروری بھی ہے تو اس سے خود حکم خداوند عالم میں تضاد پیدا ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف تو اس عمل کا کرنا حرام ہے اور دوسری طرف اولوالامر کی اطاعت واجب ہے۔ اس طرح یہ حکم خداوندی کے اجتماع کا سبب بن جاتا ہے اس لیے کہ ایک طرف تو خداوند عالم نے اولوالامر کے حکم کی اطاعت کسی شرط اور پابندی کے بغیر واجب قرار دی ہے۔ دوسری طرف اگر اولوالامر معصوم نہ ہو تو اس قسم کا حکم از روئے عقل سلیم صحیح نہیں ہے۔ اس مقدمہ اور تہید سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں جن اولوالامر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے انہیں یقیناً معصوم ہونا چاہیے۔

غزالی رازی اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ معصوم یا تو تمام امت ہے یا اس میں سے چند لوگ۔ یہ دوسرے معنی بھی قابل قبول نہیں ہیں کیونکہ ضروری ہے کہ ہم ان چند لوگوں کو پہچانیں اور ان تک پہنچ سکتے ہوں جب کہ ایسا نہیں ہے۔ جب یہ احتمال یا شک دور ہو جاتا ہے تو پہلا احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ تمام امت معصوم ہے اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اجماع و اتفاق امت حجت اور قابل قبول ہے اور یہ معتبر اور قابل اعتماد دلائل میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ باوجود اس کے کہ غزالی علیٰ سائل میں اشکال تراشی کے لیے مشہور ہیں لیکن انہوں نے اس آیت کی اس دلالت کو کہ امام معصوم ہونا چاہیے، بسر و چشم قبول کیا ہے۔ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ وہی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہ مکتب اہل بیت اور اس کے معصوم اماموں اور رہبروں سے ناواقف تھے اس لیے انہوں نے اس بات کو قبول نہیں کیا کہ اولوالامر خدا کے مقرر کیے ہوئے افراد ہونے چاہئیں بلکہ وہ مجبور ہو گئے کہ اولوالامر تمام امت یا مسلمانوں کے تمام طبقات کے نمائندوں کو قرار دیں حالانکہ یہ معنی کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں کہ اولوالامر تو وہ ہوگا جو اسلامی معاشرے کا رہبر ہو



تاکر اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی گونا گوں مشکلات اس کے ناخن تدبیر سے حل ہوتی رہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تمام آرام کا حکومت یہاں تک کہ اس کے نائنندوں کا بھی عملی طور پر اتفاق نہیں ہو سکتا کیونکہ مختلف اجتماعی، سیاسی، ثقافتی، اخلاقی اور اقتصادی مسائل جن سے مسلمانوں کو سابقہ پڑتا ہے ان میں اکثر اوقات تمام امت کا یا ان کے نائنندوں کے اتفاق رائے کا حصول ممکن نہیں ہے اور اکثریت کی پیروی اولوالا امر کی پیروی نہیں سمجھی جاسکتی۔ اس بنا پر فخر رازی اور ہمارے معاصر علماء جو اس کے عقیدے کے پیرو ہیں ان کی گفتگو کا عملی مقصد یہ ہے کہ اولوالا امر کی اطاعت عملاً معطل رہے یا ایک استثنائی حیثیت سے باقی رہے۔ ہم مندرجہ بالا تمام بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ صرف اور صرف معصوم پیشواؤں کی رہبری ثابت کرتی ہے جو امت کی چند خاصہ ہستیوں پر مشتمل ہیں (غور فرمائیے گا)۔

### چند سوالات کا جواب

اس موقع پر مندرجہ بالا تفسیر پر کچھ اعتراض ہوئے ہیں۔ بحث میں غیر جانبداری کا خیال رکھتے ہوئے انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اگر اولوالا امر سے مراد معصوم امام ہیں تو یہ مفہوم لفظ "اولیٰ" کے ساتھ جو جمع ہے، کوئی مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ اس مفہوم کی صورت میں ہر زمانے میں ایک سے زیادہ معصوم امام نہ ہوگا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ہر زمانے میں ایک سے زیادہ معصوم امام نہیں ہوتا لیکن وہ تمام زمانوں میں بہت سے افراد کی تشکیل سیرت اور تعمیر کردار کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ یہ آیت ایک زمانے کی ذمہ داری کا تعین نہیں کر رہی ہے۔

۲۔ اولوالا امر اس معنی کے مطابق تو پیغمبر کے زمانے میں موجود نہیں تھا تو اس صورت میں اس کی اطاعت کا حکم کس طرح دیا گیا ہے۔ اس کا جواب بھی گذشتہ جواب سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ آیت کسی معین زمانے کے لیے محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام

مسلمانوں کے فرائض کو ہر زمانے کے لیے واضح کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں حضور خود اولوالا امر تھے کیونکہ حضرت رسول اکرم دو منصب رکھتے تھے ایک منصب رسالت اور تبلیغ احکام جو آیت میں اطيعوا الرسول کے

عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور دوسرا منصب امت اسلامی کی رہبری اور سربراہی جس کا ذکر قرآن نے اولوالا امر کے نام سے کیا ہے۔ اس لیے پیغمبر کے زمانے میں خود پیغمبر معصوم رہبر و پیشوا تھے اور شاید لفظ "اطيعوا" کا عدم تکرار رسول اور اولوالا امر کے درمیان اسی معنی کی طرف اشارے سے خالی نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں منصب رسالت اور منصب اولوالا امر مختلف منصب ہیں۔ جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود میں ایک جگہ جمع ہیں لیکن یہ امام میں جا کر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور امام صرف دوسرا (اولوالا امر کا) منصب رکھتے ہیں۔

۳۔ اگر واقعی اولوالا امر سے مراد معصوم امام اور رہبر ہیں تو پھر کیوں مسلمانوں کے اختلاف اور جھگڑے کو بیان کرتے ہوئے

کہتا ہے:

فان تنازعتم في شئ فردوه الى الله والرسول ان كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير واحسن تاويلا

اگر کسی چیز میں اختلاف پڑ جائے تو اُسے خدا اور رسول کی طرف پٹا دو۔ اگر تم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت ہی اچھا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اولوالامر کا ذکر نہیں ہے اور اختلاف کو دور کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ خدا کی کتاب اور حضرت رسول اکرم کی سنت ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض صرف شیعوں کی تفسیر پر نہیں ہے بلکہ اہل تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دوسری تفسیر پر بھی اس کی زد پڑتی ہے یعنی یہ اعتراض اہل سنت کی تفسیر پر بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا جملے میں اختلاف و تنازع سے مراد احکام میں اختلاف ہے نہ کہ ان مسائل سے جن کا تعلق حکومت و رہبری کی جزئیات سے ہے کیونکہ ان مسائل میں تو لازماً اولوالامر کی اطاعت کرنا ہوگی جیسا کہ آیت کے پہلے جملے میں وضاحت ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اس اختلاف سے مراد اسلام کے احکام اور قوانین کی اختلاف ہے جن کی تشریح خدا اور پیغمبر سے متعلق ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امام تو احکام جاری کرنے والے ہیں نہ کہ قانون وضع کرنے اور منسوخ کرنے والے۔ امام تو ہمیشہ خدا کے احکام اور سنت رسول کے اجرا کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اسی لیے احادیث اہل بیت میں ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص کوئی بات کتاب خدا اور حدیث پیغمبر کے خلاف نقل کرے تو اُسے ہرگز قبول نہ کرو کیونکہ یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم کتاب خدا اور سنت پیغمبر کے خلاف کچھ کہیں۔ اسی لیے احکام و قوانین اسلامی میں لوگوں کے اختلافات دور کرنے کا پہلا مرجع خدا اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن پر وحی خدا نازل ہوتی ہے۔ اب اگر ائمہ معصومین احکام بیان کرتے ہیں تو وہ خود ان کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ وہ کتاب خدا یا اس علم سے ہیں جو حضرت رسالت مآب کی طرف سے ان تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوالامر کا لفظ اختلافی احکام و مسائل کے حل کرنے والوں میں شامل نہیں ہے بلکہ

### احادیث کی گواہی

اسلامی کتب اور مصادر میں کچھ احادیث موجود ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتی ہے کہ لفظ اولوالامر سے مراد ائمہ اہل بیت ہی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ مشہور اسلامی مفسر ابو جیان اندلسی مغربی (متوفی ۷۵۶ھ) تفسیر بحرالمیظ میں لکھتا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ اور ائمہ اہل بیت کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

۲۔ عالم اہل سنت ابو بکر بن مومن شیرازی رسالہ اعتقاد میں (مناقب کا شی کے مطابق) ابن عباس سے نقل کرتا ہے کہ آیت مندرجہ بالا

۱۷ اگر اس سورہ کی آیت ۸۳ میں بعض مشکلات کو حل کرنے کے لیے اولوالامر کو مرجع قرار دیا گیا ہے تو اس سے مراد شریعت کے کلی احکام و قوانین کا اختلاف نہیں ہے بلکہ جیسا کہ آیت مذکورہ کی تفسیر میں آئے گا یہ ان مسائل کے بارے میں ہے جو احکام جاری کرنے کے طریقہ سے متعلق رکھتے ہیں۔

۱۸ بحرالمیظ جلد سوم طبع مصر صفحہ ۲۷۸





حضرت علیؑ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اسلامؐ نے انہیں جنگ تبوک کے موقع پر اپنی جگہ مدینہ منورہ میں چھوڑا تھا اور حضرت علیؑ نے عرض کیا تھا کہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں کی طرح شہر میں چھوڑے جاتے ہیں تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا:

”اعلترضی ان تکون منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ حین قال اخلفنی فی قومی واصلح فقال عزوجل اولی الامر منکم“

”کیا تم پسند نہیں کرتے کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ (برادر موسیٰؑ) کو موسیٰؑ سے تھی جبکہ موسیٰؑ نے ان سے کہا تھا کہ تم بنی اسرائیل میں میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کرو۔ اس کے بعد خداوند عالم نے فرمایا: واولی الامر منکم علیؑ

شیخ سلیمان خفنی قندوزی جو اہل سنت کے مشہور عالم ہیں، ینابیع المودۃ میں کتاب مناقب میں سلیم بن قیس ہلالی سے نقل کرتے ہیں:

ایک دن ایک شخص حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا: کم از کم وہ کونسی چیز ہے جس کے ذریعے انسان مومنین کی صف میں شامل ہو سکتا ہے اور کم از کم وہ کونسی چیز ہے جس سے انسان کافروں یا گمراہ لوگوں میں شمار ہو جاتا ہے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: کم از کم وہ چیز جس کی وجہ سے انسان گمراہوں میں شامل ہو جاتا ہے یہ ہے کہ وہ خدا کی محبت اور نمائندے اور اس کے شاہد و گواہ کو جس کی اطاعت و ولایت ضروری ہے نہ پہچانے۔ اس شخص نے کہا: اے امیر المومنین! مجھے ان کا تعارف کرائیے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: وہ وہی ہیں جنہیں خدا نے اپنے پیغمبر کے برابر قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے:

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

اس شخص نے عرض کیا: میں آپ کے قربان جاؤں عزیز و ضاحت فرمائیے۔ امیر المومنین نے ارشاد فرمایا: جن کا رسول اللہ نے مختلف موقعوں پر اور اپنی زندگی کے آخری دن کے خطبہ میں تذکرہ کیا اور فرمایا:

انی توکت فیکم امرین لن تضلوا بعدی ان تمسکتہم بہما کتاب اللہ وعترتی اہل بیتی

میں تمہارے درمیان دو چیزیں بطور یادگار چھوڑ رہا ہوں اگر تم ان سے تمسک کرو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے خدا کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں علیؑ

۴۔ نیز یہی عالم کتاب ”ینابیع المودۃ“ میں لکھتے ہیں کہ صاحب کتاب مناقب نے تفسیر مجاہد سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت

حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی علیؑ

۵۔ شیخ کتب کی متعدد روایات جو کافی تفسیر عیاشی کتب صدوق وغیرہ میں منقول ہیں، سب کی سب یہ گواہی دیتی ہیں کہ وہ

۱۔ استقاق الحق جلد سوم صفحہ ۴۷۸۔

۲۔ ینابیع المودۃ طبع استنبول صفحہ ۱۱۶۔

۳۔ ینابیع المودۃ طبع استنبول صفحہ ۱۱۴۔

سے مراد ائمہ معصومین ہیں۔ یہاں تک کہ بعض میں تو ہر ایک امام کا نام صراحت کے ساتھ مذکور ہے لیکن

۶۔ اَلْمُتَرَاتِلِ الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنْهُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ وَمَا اَنْزَلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اٰمَرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۝ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝

ترجمہ

۶۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان (کتابِ آسمانی) پر جو تم پر اور تم سے پہلے نازل ہوئی ہیں ایمان لے آئے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت اور حکام باطل سے فیصلہ کرائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں برسی طرح گمراہ کر دے اور (انہیں گمراہی کے دور دراز راستوں میں پھینک دے)۔

شان نزول

مدینہ منورہ کے ایک یہودی کو ایک منافق سے کسی چیز میں اختلاف تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک شخص کو قاضی کے طور پر چن لیں۔ یہودی چونکہ پیغمبر اسلام کی عدالت اور غیر جانبداری پر مطمئن تھا اس لیے اس نے کہا کہ میں تمہارے پیغمبر کے فیصلہ پر رضامند ہوں لیکن منافق نے یہودیوں کے ایک بڑے آدمی کعب بن اشرف کو چنا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رشوت دے کر اس کی رائے کو اپنی طرف پھیرے گا۔ عرض اس نے اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کرنے کی مخالفت کی اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی جس میں ایسے افراد کی شدید مذمت کی گئی ہے

بعض مفسرین نے اس آیت کی دوسری شان نزول بھی نقل کی ہے اور وہ یہ کہ بعض نو مسلم زمانہ جاہلیت کی عادت کے مطابق اسلام کی ابتدا میں اپنے مقدمے یہودی علماء یا کاہنوں کے پاس لے جاتے تھے۔ اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں سنتی سے منع کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر ربان جلد اول آیت مذکورہ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ تفسیر مجمع البیان اور اکثر مفسرین نے بھی یہی شان نزول نقل کی ہے۔

۳۔ المنار جلد ۵ صفحہ ۲۲۲۔



## تفسیر

## طاغوت کا فیصلہ

زیر نظر آیت درحقیقت گدشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے۔ کیونکہ گذشتہ آیت مومنین کو خدا تعالیٰ پیغمبر اور اولوالامر کی اطاعت اور کتاب و سنت سے فیصلہ کرانے کی دعوت دیتی ہے اور یہ آیت طاغوت کی اطاعت، پیروی اور اس سے فیصلہ کرانے سے منع کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ طاغوت "طغیان" کے مادہ سے ہے اور یہ لفظ اپنے تمام مشتقات کے ساتھ سرکشی، حدود و قیود توڑنے یا ہر اس چیز کے معنی میں جو بغاوت اور سرکشی کا سبب بنے استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جو باطل کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں وہ طاغوت ہیں، کیونکہ انہوں نے حق و عدالت کی فدائی حدود کو توڑ ڈالا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

الطاغوت کل من یتحاکم الیہ ممن یحکم بغیر الحق

یعنی جو شخص حق کے خلاف فیصلہ کرے اور لوگ اس کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے جائیں وہ طاغوت ہے۔

مندرجہ بالا آیت ان مسلمانوں کو جو اپنے فیصلے کرانے کے لیے ایسے حکام کے پاس جاتے تھے ملامت کرتے ہوئے کہتی ہے: اے رسول! کیا آپ ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمام کتابوں پر جو آپ پر اور آپ سے پہلے نبیوں پر نازل ہوئی ہیں ایمان لے آئے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے جھگڑوں کا فیصلہ طاغوت سے کرواتے ہیں جبکہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سرگز طاغوت کا حکم نہ مانیں (العرالی الذین ینزعون انہم آمنوا بعا انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت فقد امر وان یکفر و ابہ مما س کے بعد قرآن مزید اعلان کرتا ہے کہ طاغوت کی طرف توجہ ایک ایسا شیطانی جال ہے جو چاہتا ہے کہ لوگوں کو سیدھی راہ سے ہٹا کر دور دراز کے گمراہی کے راستوں میں پھینک دے (و یرید الشیطان ان ینزلہم ضللاً بعبدا)۔

واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیت دوسری قرآنی آیتوں کی طرح تمام مسلمانوں کو سب زمانوں کے لیے خبردار کرتی ہے کہ حکام باطل کی طرف نہ جاؤ اور طاغوت سے فیصلہ کروانا خدا اور کتب آسمانی پر ایمان لانے کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھے راستوں پر ڈال دیتا ہے جو حق کے راستے سے بہت دور ہیں۔ ایسے فیصلوں کی برائیاں اور خرابیاں انسانوں کے اجتماعی معاملات کو تباہ و برباد کرنے کے لحاظ سے کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ معاشرہ کی پس ماندگی کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے۔

۶۱۔ وَإِذْ أَقِيلَ لَهُم تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ سَآئِتِ  
الْمُنْفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا



۶۲۔ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ  
يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۝  
أُولَئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ  
عِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ۝

ترجمہ

۶۱۔ جب ان سے کہا جائے کہ جو خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور پیغمبر کی جانب آؤ تو تم دیکھو گے کہ منافق تمہاری دعوت قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔

۶۲۔ جب وہ اپنے اعمالوں کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو پھر کیوں تمہارے پاس آکر قسم کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد (دوسروں کے پاس فیصلے جانے سے) نیکی کرنے (اور طرفین نزاع میں) موافقت کروانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

۶۳۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے خدا اُسے جانتا ہے۔ انہیں (سزا دینے سے) نظر انداز کرو اور انہیں وعظ و نصیحت کرو اور عمدہ بیان کے ساتھ ان کے اعمال ان کے گوش گزار کرو۔

تفسیر

طاغوت کے فیصلے کا نتیجہ

طاغوت اور ظالم و جابر فیصلہ کرنے والوں کی طرف جانے سے منع کرنے کے بعد جس کا ذکر گذشتہ آیت میں آچکا ہے اب ان تین آیتوں میں اسی طرح کے فیصلوں کے نتیجے اور وہ جیلے جن سے منافق سہارا لیتے تھے، ان پر تحقیق اور بحث کی گئی ہے چنانچہ خداوند عالم پہلی آیت میں فرماتا ہے: اس قسم کے مسلمان نما لوگ نہ صرف یہ کہ اپنا فیصلہ کروانے کے لیے طاغوت کے پاس جاتے ہیں بلکہ جب انہیں یاد دہانی کرواتا جاتی ہے کہ حکم خدا کی طرف پلٹ آؤ اور پیغمبر کا فیصلہ قبول کر لو تو وہ پیغمبر کی دعوت سے ڈرت کر روگردانی کرتے ہیں اور اس کام کو کرنے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ حقیقت میں ان کا طاغوت کی طرف لوٹنا وقتی اور ہنگامی نہیں تھا کہ اس کی یاد دہانی سے اصلاح ہو جاتی بلکہ ان

کا مخالفت کرنا اور اس کام میں ڈٹ جانا ان میں روح نفاق کی کار فرمائی اور ایمان کی کمزوری پر روشنی ڈالتا ہے ورنہ وہ پیغمبر کی دعوت سے بیدار ہو جاتے اور اپنی غلطی مان لیتے۔ اذ اقبل لہم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنک صدو ذال۔ اس کے بعد کی آیت میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہی منافق افراد جب اپنے اعمال کے نتیجے میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تو پھر بادل ناخواستہ آپ کے پاس آتے ہیں (فلکیف اذا اصابتہم مصیبتہ بما قدمت ایدیکم ثم جاؤ لک)۔

پھر اس موقع پر تمہیں کھاتے ہیں کہ ہمارا دوسروں کے پاس مقدمہ لے جانے سے مقصد نیکی کے سوا اور دعویٰ کرنے والوں کے درمیان موافقت اور صلح کروانے کے کچھ نہیں تھا (یحلفون باللہ ان اردنا الا احسانا و توفیقاً)۔ یہاں دو نکتوں کی طرف توجہ رکھنا چاہیے۔

پہلا یہ کہ اس مصیبت سے کیا مراد ہے جو انہیں دامن گیر تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ اس سے مراد پریشانیوں، بدبختیاں اور عام مصیبتیں ہوں جو طائفوں سے فیصلہ کروانے کے نتیجے میں انہیں پیش آتی تھیں کیونکہ اس میں شک نہیں کہ اگر کب سے اور ظالم لوگوں کے فیصلہ سے کوئی فائدہ طریق میں سے کسی کو ہو جائے تو زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ اس قسم کے فیصلوں کی بقا ظلم اور فساد پھیلنے کا سبب بن جاتی ہے اور اس وجہ سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ غرض اس سے لوگ بہت جلد اپنے کاموں کے نتیجوں کو دیکھ لیتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ مصیبت سے مراد لوگوں میں منافقوں کی رسوائی اور ذلت ہے یا وہ مصائب ہیں جو خدا کے حکم سے آتے ہیں (مثلاً رنج و غم اور غیر متوقع نقصانات)۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا احسان اور نیکی کرنے سے منافقین کا مقصد طریق دعویٰ کے ساتھ نیکی اور احسان ہے یا پیغمبر اکرم کے ساتھ حسن سلوک ممکن ہے کہ ان کی مراد یہ دونوں باتیں ہوں۔

انہوں نے غیروں کے پاس مقدمہ لے جانے کے مشکوک فیز بہانے بنا رکھے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ پیغمبر کے پاس مقدمہ لے جانا آنحضرت کی شان کے خلاف ہے کیونکہ اکثر طریقین دعویٰ شور و غل مچاتے ہیں اور یہ چیز مقام پیغمبر کے سراسر خلاف ہے علاوہ ازیں فیصلہ ہمیشہ ایک طرف کے نقصان پر ہوتا ہے اور یہ فطری طور پر لوگوں کو دشمن بنانے کے مترادف ہے گویا وہ یہ میلے بہانے کر کے اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا مقصد تو صرف اور صرف پیغمبر اکرم کی اور طریقین دعویٰ کی خدمت تھی یا یہ کہ اصولی طور پر ہمارا نظریہ قضاوت نہ تھا بلکہ ہماری نظر تو طریقین نزاع میں صلح و صفائی پر تھی۔

لیکن خدا میسری آیت میں ان کے چہروں سے نقاب اٹھا دیتا ہے اور اس قسم کے جھوٹے بہانوں کو باطل قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے دل کے بھیدوں کو خدا خوب جانتا ہے (اولئک الذین یعد اللہ ما فی قلوبہم منہم ذمہ)۔ اس کے باوجود پیغمبر اکرم کو حکم دیتا ہے کہ انہیں سزا دینے سے چشم پوشی فرمائیے (فاعرض عنہم ما سی لہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے پر جہاں تک ممکن تھا زامی فرماتے تھے کیونکہ آپ ظاہر پر مامور تھے اور انہیں غیر معمولی جرم کے سوا سزا نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی صفوں میں دکھائی دیتے تھے اور ممکن تھا



کہ ان کو سزا ایک قسم کا انتقام سمجھی جائے۔ اس کے بعد حکم دیتا ہے کہ انہیں وعظ و نصیحت کیجئے اور عمدہ بیان سے ان کے دلوں پر اثر ڈالیے اور ان کے اچھے اعمال کے خوشگوار نتائج ان کو بتائیے (وَعظَّمُوهُمْ وَقَدَّ لَهُمْ فِي الْفَسْهَةِ قَوْلًا بَلِيغًا)۔

۶۴۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنْتُمْ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ جَاءُوكُمْ فَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ فَاَسْتَغْفَرَ اللَّهُ لَهُمُ الرَّسُولَ لَوْجَدُوا  
اللَّهُ تَوَّابًا رَحِيمًا ۝

ترجمہ

۶۴ ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ حکم خدا سے اس کی اطاعت کی جائے اگر یہ مخالفت کرنے والے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں (خدا کے حکم کو پاؤں تلے روندتے ہیں) آپ کے پاس آتے اور خدا سے مغفرت مانگتے اور پیغمبر بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو وہ خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

تفسیر

قرآن نے گذشتہ آیات میں ظالم حکام اور قاضیوں کی طرف جانے کی مذمت کی ہے۔ اس آیت میں تاکید کے طور پر فرمایا ہے کہ جن پیغمبروں کو ہم بھیجتے ہیں وہ سب کے سب اس لیے ہیں تاکہ حکم خدا سے ان کی اطاعت کی جائے اور ان کی کسی قسم کی مخالفت نہ ہونے پائے (وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ) کیونکہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تھے اور حکومت الہیہ کے رئیس بھی تھے اس لیے لوگوں کا فرض تھا کہ وہ خدا کے احکام کے بیان اور ان کی تعمیل میں ان کی پیروی کریں اور صرف ایمان کا دعویٰ کرنے پر قناعت نہ کریں، اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کو بھیجے کا مقصد یہ ہے کہ سب لوگ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ اگر بعض لوگوں نے اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اطاعت نہیں کی تو یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے۔

بنا بریں مندرجہ بالا آیت جبروں کے اس عقیدے کی نفی کرتی ہے کہ کچھ لوگ شروع سے ہی اطاعت پر اور بعض عساکر نافرمانی پر مامور تھے۔

ضمنی طور پر باذن اللہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ خدا کے پیغمبروں کے پاس تھا وہ خداوند عالم کی طرف سے تھا یعنی ان کی اطاعت کا وجوب بالذات نہیں ہے بلکہ وہ خداوند عالم کے فرمان سے اور اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد آیت کے آخر میں گناہگاروں اور ان لوگوں کے لیے جو طغوت کی طرف آتے جاتے ہیں یا اور کسی صورت میں گناہ کر چکے ہیں، واپسی کی راہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے: جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا اگر وہ آپ کے پاس آجاتے اور خدائے متعالیٰ سے توبہ طلب کرتے اور پیغمبر بھی ان



کے لیے طلبِ مغفرت کرتے تو خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے دلو انہم اذ ظلموا انفسہم جاءواک فاستغفروا اللہ واستغفر لہم الرسول لوجود واللہ تو بارحیما۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ بجائے اس کے کہ قرآن کہتا کہ انہوں نے خدا کی نافرمانی کی ہے اور ظالم حاکموں کی طرف گئے ہیں فرماتا ہے: اذ ظلموا انفسہم۔ یعنی جب انہوں نے اپنے پر ظلم کیا۔ مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم اور پیغمبر کی اطاعت میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے اور ان کی مخالفت اپنے آپ پر ہی ظلم ہے کیونکہ یہ تمہاری مادی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے اور حقیقت میں معنوی ہلو پر تمہاری پس ماندگی کا سبب ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کے لیے بھی واضح جواب ہے جو پیغمبر اور امام کے وسیلے کو ایک قسم کا شرک جانتے ہیں کیونکہ یہ آیت صریحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ بارگاہِ پیغمبر میں آنا اور انہیں بارگاہِ رب العزت میں شفیع قرار دینا اور ان کے وسیلہ اور ان کی جانب سے دعائے مغفرت توبہ کی قبولیت اور رحمت الہی کا ذریعہ ہیں۔ اگر پیغمبر کا واسطہ، دعا، استغفار اور شفاعت شرک ہوتے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ خدا گناہگاروں کو اس طرح کا حکم دیتا۔ البتہ گناہگاروں کو چاہیے کہ وہ پہلے توبہ کریں اور گناہوں کو ترک کر دیں اس کے بعد اپنی توبہ کی قبولیت کے لیے رسول اکرم سے فیض حاصل کریں۔

واضح ہے کہ پیغمبر خود گناہ معاف نہیں کرتے بلکہ وہ صرف خدا سے مغفرت طلب فرماتے ہیں اور یہ آیت ان لوگوں کے اعتراض کا دندان شکن جواب ہے جو اس قسم کی وساطت اور وسیلے کا انکار کرتے ہیں انہیں فرمائیے گا، یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں فرماتا کہ تم ان کے لیے طلبِ مغفرت کرو بلکہ کہتا ہے کہ رسول ان کے لیے استغفار کریں۔ گویا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسول اکرم اپنے مقام اور مرتبہ سے انہیں فائدہ پہنچائیں اور توبہ کرنے والے گناہگاروں کے لیے طلبِ مغفرت فرمائیں۔ یہ معنی (یعنی پیغمبر کی طلبِ مغفرت کا مومنین کے لیے کارگر ہونا) قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے مثلاً سورہ محمد کی آیت ۱۱۹، سورہ منافقون کی آیت ۱۵ اور سورہ توبہ کی آیت ۱۱۴۔

حضرت ابراہیم کے اپنے چچا کے لیے استغفار کرنے کے متعلق اور دیگر آیات جو مشرکوں کے لیے استغفار سے منع کرتی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ مومنین کے لیے استغفار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نیز بعض آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض گناہگار مومنین کے لیے فرشتے بھی بارگاہِ رب العزت میں طلبِ مغفرت کرتے ہیں مثلاً سورہ غافر آیت ۷ اور سورہ شوریٰ آیت ۵۔

غرضیکہ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس مفہوم و معانی کا تذکرہ کرتی ہیں کہ پیغمبر فرشتے یا پاکدل مومن بعض گناہگاروں کے لیے استغفار کرتے ہیں اور ان کی دعا بارگاہِ خدا میں اثر رکھتی ہے۔ یہ بات پیغمبر، ملائکہ اور پاک دل مومنین کی طرف سے گناہگاروں کی شفاعت کا معنی بھی دیتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں ایسی شفاعت کے لیے خطا کاروں میں خود بھی قابلیت اور استعداد ہونا چاہیے۔

تعب کی بات یہ ہے کہ کچھ مفسرین کے بعض اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ آیت مندرجہ بالا میں پیغمبر اکرم کے استغفار کو آپ کی ذات تک محدود رکھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظلم و ستم کیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ ان کی رضامندی حاصل کریں۔ تاکہ خدا تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دے۔ لیکن واضح ہے کہ پیغمبر کے غیر سے فیصلہ کرانا

صرف پیغمبر پر ظلم نہیں ہے بلکہ اس کے خاص منصب کی مخالفت بھی ہے یا دوسرے لفظوں میں خدا کے فرمان کی مخالفت ہے اگر یہ فرض کر لیں کہ یہ ذات پیغمبر پر ظلم تھا تب بھی قرآن نے اس کا سہارا نہیں لیا بلکہ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ ان کا طرز عمل فرمان خدا کے خلاف تھا۔

علاوہ ازیں اگر ہم کسی پر ظلم کریں تو اس کا رضاء مند ہو جانا کافی ہے اور بارگاہ خداوندی میں استغفار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہا فرض اگر آیت کی یہ تفسیر کریں تو باقی ان سب آیتوں کے بارے میں جو پیغمبروں فرشتوں اور مومنین کے استغفار کو گناہگاروں کے حق میں موثر قرار دیتی ہیں کیا کہیں گے۔ کیا وہاں بھی شخصی حقوق تھے۔

۶۵۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ  
شَوْءًا لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا  
تَسْلِيمًا ۝

ترجمہ

۶۵ تیرے پروردگار کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ کو حکم اور فیصلہ کرنے والا مانیں اور پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی ناراضگی محسوس نہ کریں بلکہ اسے مکمل طور پر تسلیم کر لیں۔

شان نزول

زبیر بن عوام جو ہاجرین میں سے تھے ان کا ایک انصاری کے ساتھ (جو مدینہ کے مسلمانوں میں سے تھا) ان باغوں کے سیراب کرنے کے متعلق جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے اختلاف ہو گیا۔ دونوں حضرات اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروانے کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ زبیر کا باغ نہر کے بلند حصہ کی طرف تھا اور انصاری کا باغ نشیب میں تھا۔ اس لیے حضرت رسول اکرمؐ نے زبیر کو حکم دیا کہ پہلے تم اپنے باغ کو پانی دے لو اور اس کے بعد یہ انصاری مسلمان پانی دے (یہ اس رواج کے مطابق تھا۔ جو ایک دوسرے کے قریب باغوں کے بارے میں تھا) لیکن وہ انصاری جو بظاہر مسلمان تھا پیغمبر اکرمؐ کے عادلانہ فیصلے سے ناراض ہو کر کہنے لگا: کیا آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ زبیر آپ کی چھوچی کا بیٹا ہے؟ حضورؐ کو اس کی اس گفتگو سے تکلیف پہنی یہاں تک کہ آپ کے چہرے کا رنگ دگرگوں ہو گیا۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس میں ایسے مسلمانوں کو تیسیر کی گئی۔ بعض دوسری اسلامی تفسیروں میں اس کے علاوہ اور شان نزول کا بھی ذکر ہے۔ جو بیان کی گئی شان نزول سے تھوڑے بہت ملتے جلتے ہیں۔



اگر ایک گروہ خدا کی عبادت کرنے نماز پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے لیکن ان کاموں کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیے ہیں بڑا سبھے یا یوں کہے کہ اگر فلاں کام نہ کیا ہوتا تو بہتر ہوتا، دو دراصل حقیقی مومن نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

تم پر لازم ہے کہ خدا اور حق کے سامنے تسلیم خم کرو۔

آیت مندرجہ بالا سے ضمنی طور پر دو اہم مطلب معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ یہ آیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام احکامات کی گفتار و کردار میں مطلق اور کامل طور پر پذیرائی یہاں تک کر دلی طور پر ان کے آگے جبکہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو احکام خداوندی اور اپنے فیصلوں میں نہ کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور نہ آپ جان بوجھ کر خلاف حق کہتے یا کرتے ہیں۔ لہذا آپ خطا سے معصوم ہیں اور گنہ سے بھی۔

۲۔ آیت مندرجہ بالا نص پیغمبر کے مقابلہ میں اجتہاد اور ایسے مسائل میں جن کے بارے میں خدا و رسول کی طرف سے حکم صریح موجود ہو اظہار رائے اور اظہار عقیدہ کی نفی کرتی ہے۔ لہذا اگر تاریخ اسلام ہمیں یہ بتائے کہ بعض لوگ خدا و پیغمبر کے حکم کے مقابلے میں اجتہاد اظہار رائے اور اظہار عقیدہ کیا کرتے تھے مثلاً یہ کہتے تھے کہ پیغمبر نے اس طرح کہا ہے اور میں یہ کہتا ہوں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان کا عمل مندرجہ بالا آیت کی صراحت کے بالکل خلاف ہے۔

۶۶۔ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنْ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ

دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ

بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ ثَبَاتًا ۝

۶۷۔ وَإِذَا لَاتَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ۝

۶۸۔ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝

ترجمہ

۶۶ (ہم نے کوئی مشکل فرض ان کے کا نہ حوالہ نہیں ڈالا) اگر (بعض گزشتہ امتوں کی طرح) انہیں بھی ہم حکم دیتے کہ ایک

دوسرے کو قتل کریں یا اپنے وطن سے نکل جائیں تو بہت تھوڑے لوگ اس پر عمل کرتے اور اگر وہ ان نصیحتوں پر چلتے

تو ان کے فائدہ میں تھا کیونکہ ایسا کرنا ان کے ایمان کی تقویت کا سبب بنتا۔



۶۷ اور اس صورت میں ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑی جزا اور ثواب عطا فرماتے۔

۶۸ اور انہیں صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتے۔

تفسیر

یہاں گذشتہ بحث کی تکمیل کی گئی ہے جو ان لوگوں کے متعلق تھی جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عادلانہ فیصلوں پر چیں بربچیں ہوتے تھے۔ گذشتہ امتوں کے تکلیف دہ اور سخت احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے کوئی مشکل فرض ان کے کندھوں پر نہیں رکھا۔ اگر ہم گذشتہ امتوں کی طرح (مثلاً یہودی کہ نہیں ان کی بت پرستی اور گوسالہ پرستی کے بعد یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس عظیم گناہ کے کفارہ میں ایک دوسرے کو قتل کریں یا اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر کہیں باہر چلے جائیں، انہیں بھی اس قسم کا سخت حکم دیتے تو اس کو کس طرح بجالاتے یہ تو ایک باغ کی آبیاری کے بارے میں بھی پیغمبر کے سامنے تسلیمِ غم نہیں کرتے تو پھر یہ دوسری آزمائشوں پر کس طرح پورا اتر سکتے ہیں مسلم ہے کہ اگر انہیں اس قسم کا حکم دیتے کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں یا وطن چھوڑ دیں تو بہت کم لوگ اس پر عمل کرتے (ولو کتبنا علیہم ان اقتلوا انفسکم و اخرجوا من ديارکم ما فعلوه الا قلیل منهم)۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ قتل کے لیے آمادگی اور وطن سے نکلنے کی تیاری کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے ملنے ملتے ہیں کیونکہ بدنِ انسانی روح کا وطن ہے اور ایک اہمیت کا حامل ہے۔ اس طرح وہ ملک جس میں ہم رہتے ہیں جسمِ انسانی کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے خیم کے وطن کو چھوڑنا انسان کے لیے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ انسان کی پیدائش اور رہنے کی جگہ ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: اگر وہ خدا و رسول کے بند و نصح قبول کر لیں تو اس میں خود ان کا بھی فائدہ ہے اور ان کے ایمان کی تقویت کا سبب بھی ہے (ولو انہم فعلوا ما یوعظون بہ لکان خیرا و اشد تثبیتا)۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہاں خداوند عالم کے احکام کو دغظ و نصیحت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ احکام ایسے نہیں ہیں جن سے حکم دینے والے (خداوند عالم) کو ذرہ بھر فائدہ پہنچے۔ بلکہ حقیقت میں وہ ایسی نصیحتیں ہیں جو خود تمہارے نفع میں ہیں اس لیے بلا فاصلہ فرماتا ہے: ان کی اطاعت بھی تمہارے لیے منفعت بخش ہے اور تمہارے ایمان کی تقویت کا موجب بھی ہے۔ اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ آیت کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ جس قدر انسان خدا کے حکم کی اطاعت کی راہ میں قدم بڑھائے اس قدر اس میں اثبات اور استقامت پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت میں خدا کے فرمان کی اطاعت ایک روحانی ورزش ہے جس کا دگ تار عملِ جسمانی ورزش کی طرح روز بروز قوت، قدرت، رشادت اور استحکام میں اضافہ کرتا رہتا ہے اس طرح آہستہ آہستہ انسان ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ کوئی طاقت اس کے ایمان کی قوت پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتی اور نہ اسے دھوکا دے سکتی ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں خدا کے سامنے تسلیم و اطاعت کا تیسرا فائدہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: اس وقت (علاوہ اس کے جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے) انہیں عظیم اجر و ثواب بھی دیں گے (و اذا لاتیناہم من لدنا اجزا عظیمًا)۔

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں جو تھے فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم انہیں سیدھی راہ کی ہدایت

کریں گے (لہدینا ہر صراطا مستقیما)۔

واضح ہے کہ اس ہدایت سے مراد اصل دین و آئین کی ہدایت نہیں ہے بلکہ نئے الطافِ الہی میں جو خداوند عالم کی طرف سے ہدایت ثانی کی صورت میں اور اجر و ثواب کے طور پر ایسے اہل افراد کو دیئے جائیں گے یہ اس طرح ہے جیسے سورہ مائدہ کی آیت، میں اشارہ کیا گیا ہے:

“والذین اہتدوا زادہم ہدیٰ”

جو ہدایت کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں خداوند عالم ان کی زیادہ ہدایت کرتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب آیت ولو انما کتبنا علیہم ان اقتلوا انفسکم نازل ہوئی تو ایک مومن نے کہا: خدا کی قسم اگر اس قسم کے سخت حکم نہیں دیئے جاتے تو ہم یقیناً ان کی تمہیل کرتے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس قسم کے احکام سے اس نے معاف رکھا۔ جب یہ گنگو پتنبیر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

“ان من امتی لرجال الا یمن ان اشدت فی قلوبہم من الجبال الرواسی”

میری امت کے بعض لوگ ایسے ہیں کہ جن کے دلوں میں ایمان مستحکم و مضبوط پہاڑوں سے زیادہ راسخ ہے۔

۶۹۔ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ  
مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ  
أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝

۷۰۔ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ۝

ترجمہ  
۶۹ جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (قیامت کے دن) ایسے لوگوں کا ساتھی ہو گا جن پر خدا نے اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء میں سے ہیں اور وہ بہترین رفیق ہیں۔

۷۰ یہ خداوند عالم کا فضل و کرم ہے اور یہ بات کافی ہے کہ وہ (بندوں کے حالات، نیتوں اور اعمال سے) آگاہ ہے۔

شان نزول

تو بان رسول اللہ کا ایک صحابی بتاؤ حضور سے بہت الفت و محبت رکھتا تھا۔ ایک دن نہایت پریشانی کے عالم میں آپ



کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے پریشانی کا سبب دریافت فرمایا تو اس نے عرض کیا کہ جب میں آپ سے جدا ہوتا ہوں اور آپ کو نہیں دیکھتا تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ آج میں اس فکر میں غوطہ زن تھا کہ کل قیامت کے دن اگر میں اہل بہشت میں سے ہوا تو یہ مسلم ہے کہ میں آپ کے درجے میں تو نہیں ہوں گا اس وجہ سے آپ کو تو کبھی نہ دیکھ سکوں گا اور اگر اہل جنت میں سے نہ ہوا تو پھر بھی زیارت سے محروم رہوں گا بنا بریں ہر دو صورت میں آپ کی حضوری کے شرف سے مشرف نہ ہو سکوں گا۔ پھر ان حالات میں میں کیسے پریشان نہ ہوں۔ اس وقت مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ایسے لوگوں کو بشارت دی گئی کہ مطیع اور فرمانبردار افراد جنت میں بھی انبیاء اور بزرگان دین کے ساتھی ہوں گے۔ اس کے بعد حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ خدا کی قسم کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ مجھے اپنی ذات، مال باپ اور تمام رشتہ داروں سے زیادہ دوست نہ رکھے اور میری بات کے سامنے تسلیم خم نہ کرے۔

تفسیر

جنت کے ساتھی

اس آیت میں ان لوگوں کا ایک اور امتیاز و اعزاز بیان کیا گیا ہے جو خداوند عالم اور اس کے رسول کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور حقیقت میں ان خصوصیات و امتیازات کی تکمیل کرتا ہے جن کا ذکر گذشتہ آیتوں میں ہو چکا ہے۔

(وَمَنْ يَطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ .....)

جیسا کہ سورۃ الحمد کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ جو لوگ اس نعمت کے حامل ہیں وہ ہمیشہ صراط مستقیم پر گامزن رہتے ہیں اور کم سے کم گمراہی اور رد و گردانی بھی نہیں کرتے۔ اس کے بعد خداوند عالم نے اس جملہ کی وضاحت اور ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل فرمائی ہے چار قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حقیقتاً اس موضوع کے چار رکن ہیں۔

۱۔ خدا کے مخصوص بھیجے ہوئے انبیاء جو لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے صراط مستقیم کی طرف سب سے پہلے اپنا قدم بڑھاتے ہیں (من التبیین)۔

۲۔ "پہچ بولنے والے" وہ لوگ جو بات کے سچے ہوتے ہیں اور اپنے عمل اور کردار سے اپنی بات کی سچائی کو ثابت بھی کرتے ہیں اور اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ ایمان کے دعویٰ دار ہی نہیں ہیں بلکہ واقعی خدا کے احکام پر ایمان بھی رکھتے ہیں (والصديقين)۔ اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ مقام نبوت کے بعد صدق و راست گوئی سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں ہے صرف گفتار کی سچائی نہیں بلکہ عمل و کردار کی پاکبازی بھی جس میں امانت و اخلاص بھی شامل ہیں کیونکہ امانت دراصل عمل میں صداقت کا دوسرا نام ہے جیسا کہ راست گوئی گفتار میں امانت ہے اسی طرح کوئی برائی کفر کے بعد جھوٹ، نفاق اور سخن و عمل میں خیانت سے بدتر نہیں ہے (یاد رکھیے کہ صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں سراپا راستی اور درستی)۔ بعض روایتوں میں صدیق سے حضرت امیر المومنین اور ائمہ اہل بیتؑ مراد لیے گئے ہیں جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ اس قسم کی تفسیر آیات کے روشن اور عالی مصادیق



بیان کرتی ہے نہ کہ آیت کا مفہوم اس میں منحصر ہے۔

۳ - "شہدا" پاکیزہ الہی عقیدہ اور مقصد کی راہ میں قتل ہونے والے یا منتخب نیک لوگ جو قیامت کے دن انسانوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے (والشہداء)۔

۴ "صالحین" علم و عمل کے لحاظ سے لائق اور شائستہ افراد جو مثبت اسلامی اور مفید کام کرنے کی وجہ سے اور انبیاء کے احکام کی پیروی کر کے بلند مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں (والصالحین)۔

اسی بنا پر شیعہ روایات میں لفظ صالحین کی تفسیر ائمہ معصومین کے برگزیدہ اصحاب کے ساتھ کی گئی ہے اور یہ بھی جیسا کہ "صدیقین" کے بارے میں گزر چکا ہے نیک اور لائق افراد کی ایک مثال ہیں۔ جس نکتے کو اس مقام پر یاد دلانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو سکتا ہے کہ ان چاروں مرحلوں کا ذکر اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ایک صحیح و سالم اور شائستہ انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے سب سے پہلے رہبران حق اور انبیاء و میدان عمل میں آئیں اور ان کے پیچھے سے مبلغ جن کا قول و عمل ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اپنے مقاصد کی ہر بگڑش و اشاعت کریں۔ اس فکری اصلاح کے دور کے بعد ایک گروہ برے لوگوں خصوصاً ان لوگوں کے مقابلے کے لیے نکلے جو خدا کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ گروہ راہ حق میں قربانی دے اور شہادت پیش کرے۔ انہی کی کوششوں اور جدوجہد کے نتیجے میں صالحین اور پاک و شائستہ افراد پر مشتمل معاشرہ پیدا ہوتا ہے۔ واضح ہے کہ صالحین بھی آئندہ نسلوں کے لیے مشعل حق روشن رکھنے کے لیے یہ تیمنوں فراتسب اسنام دیں گے رہبری اور تبلیغ کریں گے نیز قربانی دیں گے۔

ان آیتوں سے ضمنی طور پر یہ حقیقت بھی خوب واضح ہوتی ہے کہ اچھی معاشرت رکھنے والے بے مثل ساتھی اس قدر اہم ہیں کہ عالم آخرت میں بھی جنت کی نعمتوں کی تکمیل کے لیے اطاعت گزاروں کو اس عظیم نعمت سے نوازا جائے گا دوسرے افتخارات اور اعزازات کے علاوہ وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی رفاقت بھی حاصل کریں گے۔

اطاعت گزاروں کے ان چاروں گروہوں سے میل جول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مقام و مرتبہ میں ان کے برابر ہوں گے بلکہ ایک دوسرے سے معاشرت رکھنے کے باوجود ان میں سے ہر ایک اپنے مرتبہ کے مطابق خداوند عالم کے فضل و کرم کا مستحق ہوگا جیسے نخست پھول اور سبزہ اگرچہ ایک دوسرے کے آس پاس ہوتے ہیں اور سورج کی روشنی اور بارش سے فیض یاب ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا مستفید ہونا ان کی قدر و قیمت اور استعداد کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتا۔

آیت میں اس اقیارِ عظیم (منتخب افراد کی ہم نشینی) کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ خداوند عالم کا خاص فضل و کرم ہے اور وہ بندوں کی حالتوں، نیتوں، ایاتوں اور قابلیتوں سے خوب آگاہ ہے (ذلک الفضل من اللہ وکفی باللہ علیہما)۔ البتہ "ذلک موبعدہ" کا اسم اشارہ ہے اس قسم کے مقامات پر اہمیت اور مرتبہ کی بلندی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہم آیت مندرجہ بالا سے نیک فال سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ سپاس بے قیاس اس پر درکار کے لیے ہے کہ باوجود ان تمام

۵ شہید اصل میں گواہ کے معنی میں ہے۔ البتہ کبھی انسان صرف زبان سے حق کی گواہی دیتا ہے اور کبھی عملی طور پر بلند اور پاکیزہ مقاصد کی راہ میں جان دے کر گواہی دیتا ہے۔



رکاوٹوں کے جو نیک کام کرنے والوں کے راستے میں مائل ہوا کرتی ہیں، خاص لطفِ الہی سے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد بائیں  
حسن اس مقام اختتام کو پہنچ گئی ہے۔

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكُفِيَ بِاللّٰهِ عَلِيمًا۔

خدا یا بظیفیل محمد و آل محمد ہمارے نیتوں کو پاک اور ہمارے اعمال کو پر خلوص بنا دے۔

تفسیر نمونہ جلد سوم ختم ہوئی

## اصول و عقائد

### معاذ

### توحید

۲۰۷	صاحبان ایمان جنت میں	۳۶ تا ۳۸	جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ اُس کا شاہدِ حال ہے
۲۳۰	جنت کے ساتھی انبیاء، صلحاء، شہداء اور صدیقین	۶۵	بیشک اللہ دلوں کے اسرار سے واقف ہے
۸۰	سعادت کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت	۱۶۱ و ۱۶۰	خدا شناسی کا روشن تر راستہ
۸۱	کیا جنت و دوزخ اس وقت موجود ہیں	۱۶۱	وحدتِ خدا کی نشانیاں
۸۲	جنت و دوزخ کہاں ہیں؟	۱۶۱ و ۱۶۲	موجودات میں غور و فکر تربیت و تکامل کا ذریعہ ہے
	نورانی اور تاریک چہرے۔ ایمان لانے کے بعد کفر	۱۶۲	اہل عقل فرد پرستی سے بیزار ہیں
	بچوں اختیار کیا۔ (مزید دیکھیے متفرق موضوعات) میں	۲۷۳	اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کا شریک نہ بناؤ
۵۳، ۵۲	آیمان		دعوتِ توحید روح کو پاک، نیت کو خالص اور ارادہ کو قوی کرتی ہے

## احکام

### نماز

### عدل

	نماز تہجد میں سورہ آل عمران کی پانچ آیات ۱۹۰ تا		اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اگر نیک کام ہو تو اسے کئی گنا کر دیتا ہے اور اس کے بدلے اجرِ عظیم عطا فرماتا ہے
۱۵۹	۱۹۲ کی تلاوت کا روایات اہل بیت میں حکم دیا گیا	۲۸۰	اسلام میں عدل کی اہمیت
	اسے ایمان والو! جب تم نشہ میں ہو تو نماز کے پاس نہ جاؤ	۲۱۱	نبوت

حالت جنابت میں نماز باطل ہے

• اَنْ یَغْلِبَہُ کی تفسیر۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نبی

### تیمم

۱۱۸

خیانت کرے

۲۸۷	تیمم اور تیمم کا طریقہ	۱۲۳ و ۱۲۲	بعثتِ رسولِ خدا کی ایک بڑی نعمت ہے
۲۸۸	تیمم کا فلسفہ، مٹی کی جراثیم کش تاثیر	۱۳۶	ہر نبی کے لیے انسانی اور جناتی شیطانوں سے دشمن

### حج

### امامت

۳۰	لوگوں کے لیے اللہ کا پہلا گھر	۳۱۲	اطاعتِ خدا کے بعد اطاعتِ رسول و اولی الامر
۳۱	بکہ سے کیا مراد ہے	۳۱۷ تا ۳۱۷	اولی الامر کون ہیں؟





۲۲۸	نکاح موقت پر کیے گئے اعتراضات کا جواب	۲۲	مسجد الحرام کی توسیع اور امام صادق علیہ السلام کا استدلال
۲۲۹	عقل و مشاہیر نکاح موقت کے معترف	۲۲	مہدی عباسی کے دور میں امام موسیٰ کاظمؑ کا استدلال
۲۵۰	نکاح موقت میں توسیع	۲۳	خانہ کعبہ کی خصوصیات
۲۵۲ و ۲۵۳	کمزوروں سے نکاح کی کیفیات. شرائط اور طریقہ کار	۳۵	حج کی اہمیت
۲۴۵ تا ۲۴۲	عورتوں مردوں میں ایک دوسرے پر فضیلت	جہاد	
	گھریلو نظام میں سرپرستی. مرد عورتوں کے سرپرست	۱۲۰	جہاد میں شرکت نہ کرنے والے اور ان کی مذمت
۲۶۸	اور خدمت گزار ہیں	نکاح	
۲۴۰، ۲۴۹	نافرمان عورتیں	اگر حقوق زوجیت ادا نہ کر سکو تو یتیم لڑکیوں سے شادی	
	خاندانی مصالحتی عدالت اور ان سے استفادہ	نہ کر دبلکہ دوسری عورتوں سے دو، تین چار تک بیویاں	
۲۴۲، ۲۴۱	کی خصوصیات	کرو۔ اگر ان کے درمیان انصاف نہ کر سکو تو ایک	
	وراثت	بی کافی ہے	
۲۱۰	میراث ایک فطری حق ہے	بیویوں سے عدالت کا مفہوم	
۲۱۱	میراث گزشتہ اقوام عالم میں	تعدد ازدواج ایک اجتماعی ضرورت	
	اسلام میں میراث کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں: نسب،	حق مہر عورت کے لیے ایک معاشرتی سہارا ہے	
۲۱۲	سبب، ولا	حق مہر کے مفادات کی تفصیل	
۲۱۳	مرد کی میراث عورت سے دگنی کیوں؟	حقوق نسواں کا دوبارہ دفاع	
۲۱۴	مال باپ کی میراث	اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح نہ کرو۔ یہ بے حیائی،	
۲۱۶	میراث - وصیت اور ادائے قرض کے بعد ہے	گناہ اور قابل نفرت ہے	
۲۱۶	میراث میں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے حصہ	حرام عورتوں کی تفصیل	
۲۱۶	بھائی اور بہنوں کی میراث	محارم رضاعی کی حرمت کا فلسفہ	
۲۲۱	اسلامی قانون میراث کی خصوصیات	بیوی کی مائیں اور بیٹیاں، بیٹوں کی بیویاں اور ایک	
۲۲۲	عول اور تعصیب کے کہتے ہیں	وقت میں دو سگی بہنیں حرام ہیں	
۲۶۶	ہم نے ہر شخص کیلئے وارث قرار دیئے ہیں	محسنات (شوہر دار عورتیں) حرام ہیں	
۲۶۶	عہد و پیمان کی بنا پر وراثت	اسلام میں نکاح موقت جائز ہے	
	دعا	یہاں نکاح موقت کا حکم منسوخ ہو گیا ہے؟	
	ایسی پانچ آیتیں جو رہنما سے شروع ہوتی ہیں ان کی تلامذہ کے	نکاح موقت ایک اجتماعی ضرورت ہے	
۱۶۳	بعد دعا کرنے سے دعا قبول ہوتی ہے (امام صادق)		

- ۱۱۷ ہر قسم کی خیانت ممنوع ہے  
۱۱۹ مال غنیمت میں خیانت نہ کرنے کا ایک واقعہ  
(دیکھیے متفرق خیانت)

## سرکشی

- جو لوگ طغیان، سرکشی اور نافرمانی میں غرق ہو جائیں۔ خدا  
انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے (دیکھیے متفرق)

## ۱۲۹ نفاق

- منافقین کا رسول پاکؐ کو چھوڑ کر طغوت (ہیڈیوں) سے  
فیصلے کروانا اور اس کی مذمت  
طغوت کے فیصلے کا نتیجہ

## ۲۲۰ منافقین جب کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں پھر آپؐ

## ۲۲۲ کے پاس آتے ہیں اور معذرت کرتے ہیں

## ۲۲۳، ۲۲۴ اللہ ان کے دلوں کے مجید جانتا ہے

## ۲۰۴ جنگ احد کے نتیجے میں نفاق واضح ہو گیا۔ مسلمانوں

## ۳۱۱ کی تطہیر (دیکھیے جنگ احد متفرق)

## ۱۲۹، ۱۲۸ منافقین کی بے بنیاد باتیں (دیکھیے متفرق "طبقاتی نفاق")

## اقوام گزشتہ

## یہود

- یہود کی اسلام کے خلاف سازش۔ شامی بن قیس کا  
بنی ادس و خزر ج کے درمیان دشمنی کے شعلوں کو بھڑکانا۔

## ۳۸، ۳۷ رسول اللہ کا باخبر ہو کر آتش عناد کو سرد کرنا (دیکھیے شخصیات)

## ۳۸ نفاق ڈالنے والے

## ۳۰۴ یہودیوں کی عبرت ناک داستان۔ دوسروں کے حقوق پر

## ۵۸ ہاتھ ڈالنے کا انجام

## ۸۷ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ

(دیکھیے متفرق موضوعات)

- اہل خرد کے اعمال کا نتیجہ، بخشش گناہوں، قبولیت دعاً  
رحمت خداوندی کا سایہ (دیکھیے متفرق موضوعات)  
میں "توبہ"

۱۶۵

## اخلاقیات

## اخلاق حسنہ

- آیات قرآنی کا مسلمانوں کے دلوں پر اثر۔ ابو طلحہ انصاری  
نے اپنا بہترین باغ تقسیم کر دیا۔ ابوذر غفاری نے مہمان  
کے لیے اونٹ نخر کیا۔ زبیدہ نے قرآن کریم میں لگائے  
ہوئے جواہرات کی قیمت سے بادیہ نشینوں کیلئے  
پانی مہیا کیا۔

۲۷، ۲۶

- اگر تقسیم وراثت کے وقت خاندان کے یتیمی و مساکین

## ۲۰۳ شریک محفل ہوں۔ تو انہیں بھی کچھ دے دو

## ۲۰۷ صاحبان ایمان جنت میں

## ۳۱۱ امانت کی ادائیگی

## اخلاق رذیلہ

## بخل

## ۱۴۳، ۱۴۲ بخیل کی گردن میں قید و بند کا بھاری طوق

## ۱۴۴ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا نتیجہ

## ۲۷۹، ۲۷۸ انفاق میں دکھلاوا اور رضا الہی

## حسد

## حسدانہ جرائم۔ دوسروں کی دولت اور نعمت کو

## ۳۰۴ برباد کرنا

## ۳۰۴ حسد دنیا کے بہت بڑے فسادات کی جڑ ہے

## حسد ایمان کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے لکڑیوں کو آگ

## ۳۰۵ (امیر المؤمنین)

## خیانت



۲۹	ابراہیم علیہ السلام حضرت ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے	۱۴۵	حضور پاکؐ نے بنی قینقاع کے یہودیوں کو خط کے ذریعہ نماز، زکوٰۃ اور خدا کو قرض دینے کی ہدایت کی
۲۰۰	ابن ابوالعوجار ایک مادہ پرست - امام صادقؑ کا ہم عصر	۱۴۸	یہودیوں کی بہانہ تراشی
۲۳۶	ابوقیس انصاری ابوقیس کے لڑکے نے اپنی سوتیلی ماں سے عقد کرنا چاہا	۱۵۳	قرآن نے یہود کے ایک اور بُرے کام "کتمان حق" کو آشکار کیا
	ارفظہ	۱۵۴	کتاب خدا کو پس پشت ڈال دیا
۲۰۲	اوس کا چچا زاد بھائی جس نے اوس بن ثابت کا ورثہ حاصل کر لیا اور اسکے بچے یتیم رہ گئے	۱۵۴, ۱۵۶	یہود کی خود پسندی
۹۰	ام سلمہ و ام عطیہ جنگ اُحد میں رسول پاکؐ نے ان دونوں کو حضرت علیؑ کے زخموں کا علاج کرنے کا حکم دیا	۲۹۰	بعض یہودی تورات کے فقروں کو بدل کر - ہم نے سنا اور اطاعت کی - کی بجائے - ہم نے سنا اور مخالفت کی - کہتے ہیں
۲۰۲	اوس بن ثابت انصاری اوس کے مرنے پر اس کے چھوٹے بچے وراثت سے محروم کر دیئے گئے	۲۹۲	جو کچھ ہم نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے اس پر ایمان لے آؤ۔ اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مسخ کر دیں
۲۰۲	جباب بن منذر آپؐ نے جباب کے مشورے پر جنگ بدر کے لیے پانی کے قریب پڑاؤ ڈالا	۲۹۳- ۲۹۲	ہٹ دھرم افراد کی سرفروخت
۱۱۲	حمزہ سید الشہداء جنگ اُحد کی فتح شکست میں بدل گئی اور آپؐ شہید ہو گئے	۲۹۳	اصحابِ بہت کا مختصر واقعہ
۰	خالد اوس کا چچا زاد بھائی جس نے ارفظہ کے ساتھ ل کر یتانی	۲۹۵	یہود کے ایک گروہ کا تذکرہ جو ایک طرح سے مشرک تھا
۲۰۲	زبیر بن العوام (آپؐ کے بھوپھی زاد بھائی)	۲۹۰	یہود و نصاریٰ خود ستائی کے رسیا
۲۲۵	زبیر اور ایک انصاری کے بانوں کی سیرابی کا فیصلہ	۲۰۱	سازشی لوگ کعب بن اشرف وغیرہ (دیکھیے شخصیات)
		۱۵۴	وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دور کر دیا
			علماء کی ذمہ داری - اگرچہ ذکر علماء یہود کا ہے - لیکن ہر قوم کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ حق کو بیان کریں (دیکھیے تفرق - علماء)

## شخصیات

آدم علیہ السلام

اس خدا سے ڈرو جس نے تمہیں ایک انسان

پیدا کیا

حضرت آدم کے بچوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں؟



زینب بنت علی علیہ السلام

شیردل خاتون کا دربار یرید میں خطبہ

شامی بن قیس (یہودی سردار)

اس اوس و خزرج قبیلوں کو بھڑکایا۔ رسول پاکؐ نے

آتشِ حسد کو سرد کیا (دیکھئے اقوام گزشتہ)

صادقؑ امام ہشتم

آپؐ نے فرمایا جو شخص کسی پر ظلم کرے گا خدا اس پر کسی

ظالم کو مسلط کر دے گا جو اس پر اور اس کی اولاد

پر ظلم کرے۔ دیکھئے (متفرق ظلم)

عثمان بن طلحہ

خانہ کعبہ کا چابی بردار

عمرؓ و بن قیس حارثی

جنگِ اُحد میں اس دشمنِ اسلام نے پتھر مارا جس سے

رسول پاکؐ زخمی ہوئے

عبداللہ بن سلام

عبداللہ بن سلام یہودی کا مسلمان ہونا اور یہودیوں

کی شرارت

عطاء بن ابی رباح

حضرت عائشہ سے پوچھا کہ آپؐ نے رسول پاکؐ میں

زیادہ عجیب شے کیا دیکھی

علی ابن ابی طالب علیہ السلام

احترامِ شہداء، شہیدوں کا اجر (بوسیلہ امامِ رضاؑ)

فرمانِ جناب امیر

فخماص

ایک یہودی عالم۔ جسے رسول پاکؐ کا خط دیا گیا۔

خط پڑھ کر اس نے کہا: ان اللہ فقیر و

نحن اغنیاء

کعب بن اشرف شاعر

مسلمانوں اور حضور پاکؐ کی ہجو کہتا تھا۔

مسلمان عورتوں اور لڑکیوں سے نزلِ سرائی و عشق بازی

بیان کرتا تھا

۱۵۲ جنگِ اُحد کے بعد کعب مکہ میں ابوسفیان سے ملا کہ

وہ مسلمانوں سے اپنا معاہدہ ترک کر کے مشرکین مکہ کی

مدد کرے گا

۲۹۹-۳۰۰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آپؐ نے ارشاد فرمایا: امتِ موسیٰ ۱، امتِ عیسیٰ ۲،

اور میری امت ۳، فرقوں میں بٹ جائے گی

۵۱ محمد صرف خدا کے رسول ہیں جیسے پہلے رسول تھے۔

اگر وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم دین سے

پھر جاؤ گے؟

۹۴ عمرؓ و بن قیس حارثی نے ایک پتھر مارا جس سے آپؐ

زخمی ہو گئے

۹۵ علمدار لشکرِ معصب بن عمیر نے حملوں کو روکا اور خود

شہید ہو گئے۔ وہ رسول پاکؐ سے مشابہت رکھتے

تھے لہذا شور ہوا کہ محمد قتل ہو گئے

۹۵ شہداء جنگِ اُحد میں سے رسول پاکؐ ہر ایک شہید

کی لاش مبارک کے پاس بیٹھے گریہ فرمایا اور دعا منفرت

کی، بعد ازاں دامنِ اُحد میں دفنایا

۹۸ آپؐ نے نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ قبرستانِ بقیع

میں پڑھائی

۱۶۱ اور آپؐ کو ان سب پر گواہ بنا کر لائیں گے

آپؐ کی عصمت کی دلیل۔ اللہ تعالیٰ کا آپؐ کے یکے

ہوئے فیصلوں کو دل سے قبول کرنے کا حکم

۳۲۴ آپؐ کی فیصلوں کو دل سے تسلیم نہ کرنے پر اللہ کی تہدید ۳۲۸، ۳۲۹

۱۳۹

۳۸۰، ۳۸۴

۲۰۵

۲۰۹

۹۵

۴۰، ۵۹

۱۵۹

۱۳۱

۱۴۵



۳۳	روشنی کی طرف ہدایت کی جان ڈیوڈ پورٹ	۳۲۰	آپ کی حقیقی محبت کے بغیر ایمان مکمل نہ ہوگا اے پیغمبر! راہ کفر میں ایک گروہ دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے درپے ہے۔ اس سے غمگین نہ ہونا یہی کافی ہے کہ خدا تمہارا رہبر دلی اور ناصر و مددگار ہے
۲۳	محمد جیسے ایک عالم عرب نے ایک منتشر، بربہنہ اور افلاس زدہ ملک کو منظم معاشرے میں بدل دیا	۱۳۷	۲۹۰، ۲۸۹
۸۸	خاقانی الوان مدائن پر لکھے گئے قصیدہ کا ایک شعر	۹۳	محمد عبدہ مصر کا ایک عظیم مفتی
۲۱۸	شیخ سلیمان حنفی قندوزی مصنف ینایع المودۃ کی مختلف وضاحتیں	۲۱۸	مجدد خزاہی مشرک مجدد نے رسول اللہ کی افواج کو دیکھا پھر ابوسفیان کو مسلمانوں کے حملے سے مطلع کیا
۳۶	مصنف من لایحضرہ الفقیہ کی روایت بسلسلہ حج	۱۳۳	مصعب بن عمیر علمدار لشکر جنگ احد میں علمدار لشکر مصعب بن عمیر نے رسول اللہ سے دشمنوں کو ہٹایا خود شہید ہو گئے
۸۵	امام صادق سے ایک حدیث طبرسی	۹۵	نوف بکالی صحابی امیر المؤمنین کی بیان کردہ ایک روایت
۱۳۲	ایک روایت کا خلاصہ گوستا دلولوبون	۱۴۰، ۱۵۹	علماء و دانشور ابوبکر بن مومن شیرازی جنگ تبوک کے موقع پر حضرت علی کی ولیمہ کی قائل
۲۳	اسلام نے عرب قوم کو جاگیر گیری اور اخلاق کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا	۲۳	ابوجیان اندلسی مشہور اسلامی مفسر
۱۹۲	تعدد ازدواج کا اعتراف نہرو	۲۱۷	ابورومی شیخ تخت جمشید کے سامنے کہا ہوا اس کا قصیدہ
	دین اسلام نے عربوں کو ایشیا، یورپ اور افریقہ پر سلطہ کر دیا	۸۸	برٹریٹڈرسل انگریز دانشور نکاح موقت کا معترف
	کتب سماوی	۲۳۹	تو مال کارل خداوند عالم نے اسلام کے ذریعہ عربوں کو تاریکی سے
۱۹۹	انجیل مستی		
۲۱۱	توراة سفر اعداد		
	کتب سیر، تاریخ و تفاسیر		
۲۲۵، ۲۰۸، ۱۷۴	احتجاج طبرسی		



۱۶۷	حقوق زن در اسلام	۳۱۸	احقاق الحق
۲۲۵	دارقطنی	۱۷۱	اسباب النزول واحدی
۲۵۰، ۲۲۹	زناشوی و احسلاق	۱۵۶، ۱۳۵	اسباب النزول واقدی
۳۱۱	سفینۃ البحار	۲۶۱	اصول کافی
۲۲۳	سنن کبریٰ بیہقی	۲۲۶	بداية المجتہد
۶۹	سیرت حلبی	۲۲۶، ۲۲۳	العنبر
۲۲۵	شرح لمعة ج	۱۱۹	تاریخ طبری
۲۸۶، ۲۶	صحیح بخاری	۱۵۹، ۱۵۵، ۱۱۳، ۱۱۳، ۲۵	تفسیر ابو الفتوح رازی
۳۱۱	صحیح ترمذی	۲۶۲، ۲۴۷، ۱۸۸، ۱۵۶، ۱۳۳، ۱۱۲، ۷۵، ۵۰	تفسیر المنار
۲۶	صحیح مسلم	۳۲۵، ۳۱۹، ۳۱۱، ۳۰۱، ۲۷۵	
۱۶۷	غدر تفسیر بہ پیش گاہ محمد	۲۸۲، ۲۴۳، ۲۳۳، ۲۰۹، ۲۰۶، ۱۹۸	تفسیر برہان
۸۵	کتاب امالی صدوق	۳۱۹، ۳۰۲	
۱۰۲	کتاب خصال	۲۲۵، ۳۰۱	تفسیر تبیان
۱۶۷	کتاب درد سرک مارک	۱۳۵	تفسیر روح البیان
۳۰۸	مجالس ایشخ	۳۰۲، ۳۰۱، ۲۶۲	تفسیر روح المعانی
۲۶۱	مجموعہ البیضا جلد ۷	۲۳۴، ۳۶	تفسیر صافی
۳۰۵	مستدرک الوسائل	۲۴۴	تفسیر طبری
۲۱۲	معانی الاخبار	۸۵	تفسیر عیاشی
۳۶	من لایحضرہ الفقیہ	۳۲۹، ۲۶۲	تفسیر فی ظلال
۳۱۱	نسائی	۲۸۶، ۲۷۵، ۲۴۵، ۲۳۴	تفسیر قرطبی
۴۴	نگاہی بتاریخ جہاں جلد ۱	۳۱۵	تفسیر کبیر
۳۰۵، ۲۶۱، ۱۵۵، ۱۱۳، ۱۱۳، ۲۹	نیج البسلاخ	۲۴۶، ۲۴۴، ۲۴۳	تفسیر کنز العرفان
۲۸۶، ۲۸	وسائل	۱۳۴، ۱۳۲، ۱۲۰، ۱۰۲، ۴۹، ۲۷، ۲۶	تفسیر مجمع البیان
۳۱۸	ینایع المودۃ	۲۸۳، ۲۵۸، ۲۴۳، ۲۳۲، ۲۱۹، ۱۵۹، ۱۵۶، ۱۳۵	
		۳۱۹، ۳۱۱، ۲۹۳	

## لغات قرآن

۱ آثار در اصل انا (بروزن وفا) کی جمع ہے

تفسیر نور الثقلین ۷۵، ۱۲۰، ۱۳۴، ۱۵۹، ۱۸۸، ۱۹۸، ۲۳۳،

۲۲۳، ۲۴۳، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۷۵، ۲۸۲، ۲۸۶، ۳۱۱





۷۳	کہتے ہیں۔ مکہ و مدینہ کا درمیانی علاقہ	۶۰	معنی اوقات
	بزر وسعت کا ہم معنی۔ اسی لیے صحرا کو بڑا اور ہر	۲۰۰	آنستم مادہ "ایناس" آنکھ کی پٹیل
۲۵	نیک کام کو بڑتے ہیں		اخذان خذن کی جمع معنی دوست۔ ساتھی
	بطانت لغوی معنی نچلا لباس یہاں رازداں سے	۲۵۲	چھپی یاری لگانا
۶۲	کنایہ ہے		اخریکم زیر بحث آیت میں وراشکو کے
	بکہ بک "بروزن نک" معنی اژدہام۔ اجتماع۔	۱۰۵	معنی میں ہے یعنی تمہارے پیچھے
	پس مرکزی حیثیت اور اجتماع کی وجہ سے کہہ		اذا یہاں بطور حرف شرط نہیں۔ حین اور
۲۲، ۳۱	کہتے ہیں	۱۰۲	وقت کے معنی میں ہے
	تصونہم مادہ "حس" معنی حواس ختم کر دینا	۲۳۵	استبدال تبدیلی چاہنا
۱۰۲	مراد قتل کر دینا۔	۱۳۰	استبشار بشارت پانا۔ بشارت دینا نہیں ہے
۲۳۱	تسویف توبہ میں تاخیر کرنا		افتراء مادہ فری سے ہے (بروزن فسرو)
	تصعدون مادہ "اصعاد" معنی اوپر کی طرف		قطع کرنا، کاٹ دینا۔ بڑے کام شرک اور جھوٹ
۱۰۵	چڑھنا۔ سطح زمین پر چلنا	۲۹۵	کو بھی افتراء کہتے ہیں
	تصعیب عصبہ (بروزن کبہ) دراشتی حصہ پر		افسار وہ رسی جو گدھے یا گھوڑے کے سر اور
۲۲۲	اضافہ کرنا	۱۹۷	گردن میں باندھی جاتی ہے
۱۲۱	تغلیب ادبی اصطلاح میں ایک طرز بیان		افضا۔ مادہ فضا۔ معنی وسعت کشادگی ربط
	تمحص مادہ تمحیص کسی شے کو ہر قسم کے نقص	۲۳۵	ضبط۔ میل جول
۹۲	سے پاک کرنا		امت مادہ أم۔ ہر وہ چیز جس کا دوسری چیزیں
	ثقفوا مادہ ثقف۔ ثقافت کے معنی کسی چیز		ضمیمہ ہوں۔ اس لیے امت ایسا گروہ جس میں
۵۷	کو مہارت کے ساتھ پالینا	۲۶	وحدت کا پہلو ہو
۳۱	جبت اسم جامد۔ جادو۔ جادوگر۔ شیطان	۱۰۶	امنة امن وامان
	حبل اللہ اللہ کی رسی۔ مراد اسلام، قرآن		اولوالالباب صاحبان عقل کی طرف لطیف
۲۲	پیغمبر اور اہل بیت	۱۶۰	اشارہ "لب" ہر چیز کے خالص جوہر کو کہتے ہیں۔
۲۲۰	حدود حد کی جمع معنی روکن		ایام یوم کی جمع لوگوں کی کامیابی کے زمانے کو
	حطیم خانہ کعبہ کے دروازہ اور حجر اسود کی درمیانی	۹۱	بھی ایام کہتے ہیں
۳۲	جگہ کا نام ہے	۵۸	ب باؤا رجوع کرنا۔ سکونت کرنا
	حلائل حلیلہ کی جمع مادہ عل "وہ عورت جو		بدر یعنی پُر، کامل۔ اسی لیے پورے چاند کو بدر



۲۴۰	انسان پر حلال ہو	۲۴۰	دوسروں کے صبر کے مقابلہ میں صبر و استقامت
۶۴	خبال - کسی چیز کا نیست و نابود ہونا	۱۴۳	دکھانا
	درک - بروزن "مرگ" نیچے کی طرف جانے والی	۹۹	صبر - استقامت
۱۲۰	سیرٹھیاں	۱۹۴	صدقا تھمن - صدق کی جمع - صدق بمعنی مہر
۲۸۱	ذره - جسم کا بہت ہی چھوٹا حصہ - ایٹم، سالمہ	۶۲	صر - ہوا کی شدت و سختی - خواہ ہوا گرم ہو یا سرد
	رابطو - مادہ - رباط - کسی چیز کو کسی مکان میں	۲۵۸	صلی (بروزن سرد) - جھلنا - جلنا
۱۴۴	باندھنا - اسی لیے سرائے کو رباط کہتے ہیں	۳۰۱	طاغوت - بُت - جابر و مستکبر حاکم
	راعنا - مادہ - رمی - ہم سے مراعات کیجئے - مادہ		طمس - کسی چیز کے آثار کو مٹا دینا - عمارت کو چھٹیل
۲۹۱	"رعوت" ہمیں بے وقوف بنائیے		میدان بنا دینا - کنایہ ایسی چیز جس کا اثر و غایت ختم ہو جائے
	ربیون - ربتی (بروزن ہلی) کی جمع ہے اور	۲۹۳	طول - توانائی - رسائی - مالی وسائل (بروزن نوع)
	رہی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا خدا سے مضبوط	۲۵۱	ظلیل - مادہ نخل معنی سایہ
	اتصال ہو	۳۰۴	ظہارہ - اوپر کا بکس - لباس ظاہری
۹۸	رقیب - بلند جگہ سے حالات کا جائزہ لینے	۶۴	عرق النساء - ایک اعصابی بیماری جس میں
	والا - محافظہ و نگہبان	۱۸۴	نمر اور پاؤں کی تکلیف کے باعث چلنے پھرنے
	زنا شوقی - ازدواج	۲۵۰	میں دشواری ہوتی ہے
	سارعوا - سارعت سے ہے مقصد تک پہنچنے	۲۸	عزم - پختہ ارادہ - ہر حکم و مضبوط چیز کو بھی عزم
	کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنا	۸۰	کہتے ہیں
۲۰۴	سعیر - بھڑکتی ہوئی آگ	۱۵۳	عفت - (بروزن سند) ٹوٹی ہوئی ٹہنی کے جوڑ
	سفید - سفہ (بروزن تہ) بدن کا ہلکا ہونا -		کا پھر سے ٹوٹنا - مراد سخت تکلیف و اذیت
۱۹۴	توازن برقرار نہ رہنا	۲۵۳	عول - زیادتی اور بلندی - دراشتی حصے بڑھ جانے
	سیصلی - مادہ - صلی - (بروزن درد) آگ میں		کی صورت میں حصوں میں کمی کرنا
۲۰۴	داخل ہونا - جلنا	۲۲۳	فاحشہ - فحش یا فحشاء سے ہے بہت ہی بُرا عمل
	شجر - درخت	۸۵	فتیل - مادہ - قتل - بہت ہی باریک دھاگہ جو
۳۲۴	شہد - ا - سے مراد گواہ بھی ہے	۹۲	کھجور کی گٹھلی میں دکھائی دیتا ہے
	شہید - معنی گواہ - کبھی زبان سے شہادت دیتا	۲۹۴	فخورد - مادہ فخر - معنی غرور گھمنڈ
	ہے اور کبھی جان دے کر حق کی گواہی دیتا ہے -	۲۴۴	فور - دیگ کا ابال - تیزی سے انجام پانے والا
	ص صابروا - مضارہ مفاعلہ کے باب سے ہے -		



۲۴۲	جھاڑنا۔ زنا	۷۳	کام اسی تشبیہ سے فور کہلاتا ہے
۵۸	مسکنت۔ سخت بیچارگی جس سے چھٹکارا ممکن نہ ہو	ق	قرح۔ معنی ایسا زخم جو بدن پر کسی خارجی عمل کی وجہ سے پیدا ہو
۴۷	معروف۔ اصل "مرف" معنی پہچانے ہوئے	۹۱	ک کاظمین الغیض۔ کنظم۔ لغوی معنی پانی سے بھری ہوئی مشک کے دبانے کو باندھنا۔ مراد غیض و غضب سے بھرے ہونے کے باوجود
۲۳۶	مقیّت۔ قابل نفرت اولاد	۸۴	اسے استعمال نہ کرنا
۱۲۲	منت۔ مادہ۔ من "وہ پتھر جن سے چیزوں کو تولا جاتا ہے"	۹۸	کاشن۔ کتنے زیادہ
۴۷	منکر۔ معنی نہ پہچانے ہوئے	کفر۔ چھپانا۔ دینی اصطلاح میں حق سے ہر طرح کی مخالفت	۲۶
۴۷	موالی۔ مولا کی جمع مادہ۔ ولایت۔ معنی ارتباط و اتصال	کلالہ۔ کلال قوت و طاقت کا ختم ہو جانا۔ ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ نہ اس کے والدین ہوں نہ اولاد	۲۱۷
۴۷	موت۔ کے معنی فنا اور نابودی نہیں۔ دوسری زندگی کی گزرگاہ ہے۔ دیکھیے متفرق (موت)	ل	لا تمناوا۔ مادہ۔ "وہن" ہر قسم کی سستی۔ جسمانی بھی ایمانی بھی
۱۱۰	نخلہ۔ لغت میں قرض کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور بخشش و عطیہ میں بھی	۹۰	لعلکم۔ لعل کا استعمال شرط کے ساتھ ہے ۱۷۹، ۱۷۵
۱۹۴	ندا اولہا۔ مادہ معادلہ۔ ایک چیز کو مختلف لوگوں کے درمیان گردش دینا	لحم۔ (بروزن قسم) چھوٹے اور کم اہمیت والے کام	۲۵۹
۹۱	نزل۔ ایسی چیز جو مہمان کی ضیافت کے لیے پیش کی جائے	۲۴۳	متعہ۔ ازدواج موقت
۱۷۰	نشوز۔ نشز بروزن نذر اونچی زمین مراد سرکشی و طغیان	۲۸۱	مشقال۔ مادہ۔ ثقل۔ بیماری پن۔ مشقال ذرہ سے مراد جسم کا چھوٹا حصہ سالم
۲۶۹	نصیہم۔ مادہ۔ صلی۔ آگ میں جلنا	محصنہ۔ مادہ۔ حصن۔ قلعہ۔ مراد شوہر دار (سہاگن) عورت	۲۴۱ و ۲۴۳
۳۰۶	نضجت۔ مادہ نضج جھین جانا	مختال۔ مادہ۔ "خیال" کوئی شخص کسی خیال سے اپنے کو بڑا سمجھے۔ گھوڑے کو خیل اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ چال متکبرانہ ہے	۲۷۷
۳۰۶	نعاس۔ ہلکی نیند یا اونگھ	ی	ی ماسفحین۔ مادہ۔ "سفاح" پانی انڈیلنا، مستی
۱۰۶	نقییر۔ مادہ۔ "نقر" بروزن فقر کسی چیز کو اتنا کاٹنا کہ اس میں گڑھا یا سوراخ ہو جائے		
۳۰۳	نملی۔ مدد کرنا کسی جگہ مہلت دینا بھی مراد ہے		
۱۳۸	یزکون۔ مادہ۔ تزکیہ۔ معنی پاک سمجھنا		
۲۹۷	یغفل۔ یہ لفظ غفل سے خیانت کے معنی میں لیا		



۱۱۸	توبہ	۱۱۸	گیا ہے
۱۴۵	اہل خرد کے اعمال کا نتیجہ بخشش گناہاں۔ قبولیت دعا۔ رحمت خداوندی کا سایہ (دیکھیے احکام)	۹۲	یصحق۔ مادہ محق۔ کسی چیز کا آہستہ آہستہ کم ہونا۔ اسی وجہ سے مینے کی آخری رات کو محاق کہتے ہیں
۱۴۶	مرد عورت کی روحانی قدر و قیمت۔ مرد ہو یا عورت نیک کام کی جزا ضرور ملے گی	۱۳۹	شیر دل خاتون کا دربار یزید میں خطبہ (دیکھیے شخصیات)
۲۲۸	قبولیت توبہ کے لیے شرطیں	۱۵۲، ۱۵۲	مقابلے اور پامردی سے تھک نہ جاؤ اتحاد
۲۹۶	گناہوں کی بخشش کے اسباب۔ توبہ، امور نیک، شفا۔ بحیرہ سے پرہیز عفو خداوندی ہے	۴۱	اتحاد کی دعوت اور تفرقہ کی ممانعت
	حقوق اسلامی	۴۴	قوموں کی بقا کے لیے اتحاد کی اہمیت
	اللہ کا حق کہ اس کی عبادت کریں اور اس کا شریک نہ بنائیں	۲۲۶	اقتصادیات
۲۴۲	حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔ رسول سے فیصلہ کراؤ پھر اسے بخوشی قبول کرو	۱۴۸	مسلمانوں کی مفلسی اور یہود و مشرکین کی دولت مندی
۲۴۶	حقوق والدین ماں باپ سے نیکی کرنا۔ حقوق والدین کی اہمیت	۱۴۹	مسلمانوں میں احساس محرومی اور اس کا جواب قوت اور ضعیف کے پہلو
۲۴۳	قرآن نے ذکر توحید کے فوراً بعد چار مقامات پر حقوق والدین پر توجہ دلائی ہے	۲۵۸، ۲۵۴	معاشرے کی سلامتی کا دار و مدار اقتصادی سلامتی پر ہے
۲۴۳	تمام رشتہ داروں سے نیکی کا برتاؤ		انتخاب بذریعہ عقل و فکر
۲۴۳	یتامی و مساکین کے حقوق	۱۲۱	ایک مؤثر طریقہ تربیت ایمان
۲۴۵، ۲۴۳	نزدیکی پڑوسی اور دُور کے پڑوسیوں کے حقوق	۲۶	آیات قرآنی کا مسلمانوں کے دلوں پر اثر
۲۴۶	صاحب بالجنب۔ سفر کے دوست کا حق	۵۳، ۵۲	ایمان لانے کے بعد کفر کیوں اختیار کیا۔ نورانی اور تاریک چہرے (دیکھیے معارف)
۲۴۶	ابن اسبیل۔ دوران سفر تنگ دست و مجلس ہو جانے والوں کے حقوق	۶۶	مسلمانوں کے لیے تنبیہ دشمنوں (غیر مسلموں) کو اپنا عزیز نہ سمجھو اُن پر راز ظاہر نہ کرو
۲۴۶	ملکت ایصانکم۔ ملک بین غلاموں اور کینزوں کے حقوق	۲۵۸، ۲۵۴	اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ
۲۴۶	شرک، لوگوں کے حقوق کی پامالی۔ غرور و تکبر کا سرچشمہ ہیں		

## خیانت

- ہر قسم کی خیانت ممنوع ہے (دیکھیے اخلاقِ رذیلیہ) ۱۱۷
- مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرنے کا ایک واقعہ (دیکھیے اخلاقِ رذیلیہ) ۱۱۹
- ## زنا سے مخلصی
- چار گواہوں کی شہادت ۲۲۶
- اسلام کے تعزیری قوانین کا سہل اور متنوع طریقہ ۲۲۶، ۲۲۷
- ## سرکشی
- جو لوگ طغیان، سرکشی اور نافرمانی میں غرق ہو جائیں خدا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے (دیکھیے اخلاقِ رذیلیہ) ۱۳۹
- ## سُود
- اے ایماندارو! بڑھا چڑھا کر سود نہ کھاؤ۔ خدا سے ڈرو تاکہ فلاح پاؤ ۷۷
- سود خوری کی حرمت کے چند مراحل ۷۸
- ## شخصیت پرستی کی مخالفت
- جنگِ اُحد میں پیغمبر کی شہادت یا طبعی موت سے اسلام کا خاتمہ نہ ہوتا ۹۵
- شہداء راہِ خدا ۱۲۹
- شہید زندہ جاوید ہے ۱۳۱
- شہید - روح کی بقا کا شاہد ۱۳۱
- شہیدوں کا اجر بزبانِ حضرت علیؑ (دیکھیے شخصیاتِ علیؑ) ۱۳۱
- ## طبقاتی تفاوت
- طبقاتی تقسیم اور گروہ بندی کے خلاف جہاد۔ اس سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی انسان سے پیدا کیا ۱۸۱
- ظلم
- جو شخص کسی پر ظلم کرے گا خدا اس پر کسی ظالم کو مسلط کر دے گا کہ وہ اس پر اور اس کی اولاد پر ظلم کرے (امام صادق) دیکھیے شخصیات ۲۰۵
- جو لوگ ظلم و ستم سے یتیم کا مال کھاتے ہیں وہ آگ کھا رہے ہیں اور مستحق جہنم ہیں ۲۰۶
- یتیموں پر ظلم نہ کرو ان پر مہربانی کرو کہ ان کے باطنی دکھ دور ہو جائیں اور دل کے زخم بھر جائیں ۲۰۵
- یتیم لڑکیوں پر ظلم کرنے سے بچو علماء۔ ۱۸۸
- علماء کی ذمہ داری
- اگرچہ ذکر علماء یہود کا ہے لیکن ہر قوم کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ حق کو بیان کریں (دیکھیے اقوامِ گزشتہ) ۱۵۴
- ## غزوات
- غزوة اُحد - لشکر گاہ کا انتخاب ۶۷
- اسبابِ جنگ ۶۸
- جنابِ عباسؓ کا بروقت پیغام ۶۸
- مسلمانوں کی دفاعی تیاریاں عبداللہ ابن جبیر پچاس مجاہدین سمیت کوہِ عینین پر متعین ہوئے ۷۰
- آغازِ جنگ میں مسلمانوں نے کفار کو پسپا کر دیا ۷۰
- عبداللہ بن جبیر کے ساتھی بھی مالِ غنیمت لوٹنے کو دوڑے ۷۰
- عبداللہ بن جبیر اپنے دس ساتھیوں سمیت خالد بن ولید کے حملہ میں شہید ہو گئے ۷۰
- ذوالفقار حضرت علیؑ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ رسولِ پاکؐ نے ذوالفقار عطا کی ۷۱
- کون پکارا محمدؐ قتل ہو گئے ۷۱
- بھگوڑے واپس آکر معذرت خواہ ہوئے ۷۱
- جنگِ بدر کی طرف اشارہ ۷۳
- جنگِ اُحد کی نتائج۔ مایوسی، کاہلی اور کمزوری میں

### گزشتہ تاریخ

- ۸۷ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ (دیجھے اقوام گزشتہ)  
جہاں گردی۔ بابل کے برج کسریٰ کے محل۔ قوم سب کے
- ۹۶ آثار تمدن، زبان حال سے تاریخ بیان کرتے ہیں  
گناہ کبیرہ و صغیرہ  
اگر تم بڑے گناہوں کو ترک کر دو گے تو ہم چھوٹے گناہ  
معاف کر دیں گے ۲۹۰، ۲۹۱
- ۲۶۱ گناہان صغیرہ کس طرح کبیرہ میں بدل جاتے ہیں  
مشورہ  
اسلام میں مشورہ کی اہمیت ۱۱۳، ۱۱۲
- مشیر کی ذمہ داری ۱۱۵، ۱۱۴
- حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ ۱۱۵
- آخری فیصلہ کا مرحلہ ۱۱۵
- موت  
موت کا اہل قانون "کل نفس ذائقۃ الموت"  
موت کے معنی فنا اور نابودی نہیں بلکہ دوسری زندگی  
کا دریچہ ہے (دیکھیے لغات قرآن) ۱۱۰
- یستائے  
یتیم کا مال اُسے واپس کر دو۔ اس کے اچھے مال کو اپنے  
بڑے مال سے نہ بدلو۔ اُس کا مال اپنے مال کے ساتھ  
ملا کر نہ کھاؤ ۱۸۶، ۱۸۵
- اگر حقوق زوجیت ادا نہ کر سکو تو یتیم لڑکیوں سے شادی  
نہ کرو۔ ظلم سے بچنے کے لیے دوسری عورتوں سے شادی کرو ۱۸۸
- یتیموں کے حقوق ادا کرو ۲۷۴
- یتیموں پر ظلم نہ کرو۔ بلکہ ان سے شفقت آمیز سلوک  
کرو کہ ان کے باطنی دکھ دور ہو جائیں اور دل کے  
زخم بھر جائیں ۲۰۵

- ۹۱ مبتلا نہ ہوں  
اس قسم کی شکست جماعت کی کمزوری اور عیوب کو  
واضح کرتی ہے ۹۲
- ۹۳ جنگ اُحد میں شکست کے اسباب کا مختصر جائزہ  
کامیابی کے بعد شکست۔ درہ کے محافظوں کی طمع نے  
شکست سے دوچار کر دیا ۱۰۴
- ۱۰۵ زمانہ جاہلیت کے دسوسے  
مسلمان دو تین گروہوں میں بٹ گئے ۱۰۶
- کمزور ایمان والے اپنی گفتگو میں کہتے کہ شاید پیغمبر کے  
وعدے غلط ہی ہوں ۱۰۶
- ۱۰۸، ۱۰۷ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سرچشمہ  
منافقین کی مفاد پرستی ۱۰۹
- عام معافی کا حکم ۱۱۱
- جنگ اُحد کے سپاہیوں کی بعض بے بنیاد  
عذر تراشیوں کا جواب ۱۱۸، ۱۱۷
- ۱۲۰ جہاد میں شرکت نہ کرنے والے  
جنگ اُحد پر ایک اور نظر ۱۲۴
- ۱۳۴، ۱۳۳ غزوہ حمرہ۔ الاسد  
ترسیت الہی کی فوری تاثیر ۱۳۵
- کامیابی کا ایک راستہ  
دشمن کا خوفزدہ ہونا ۱۰۱
- کفر  
جو لوگ کفر کی طرف پلٹ جائیں وہ اپنا نقصان  
کرتے ہیں ۹۶
- بار بار خطرے سے آگاہی۔ اے ایمان والو۔ اگر  
کافروں کی اطاعت کر دو گے تو وہ تمہیں پیچھے دھکیل دیں  
گے، تم خود اپنا نقصان کر دو گے ۱۰۰



۳۲	مسجد الحرام کی توسیع
	سرچشمہ رشد و ہدایت - خدا پرستی، توحید، روحانیت و
۳۲، ۳۳	معنویت کی واضح نشانیاں
۳۲	مقام ابراہیم کو جاسے امن قرار دیا گیا
۳۲	حجرِ اسود
۳۵	حج کی اہمیت

### مقربین - بارگاہِ خدا

	نیک لوگ تو وہ ہیں جو اللہ، آخرت، ملائکہ، کتب اور
	انبیاء پر ایمان لائے اور اپنا مال یتیموں، فقیروں اور
۲۵	عزیزوں میں خرچ کیا اور زکوٰۃ ادا کی
۸۲	پرہیزگاروں کی نشانیاں
۸۴	وہ نیکی کرنے کی وجہ سے اللہ کو محبوب ہیں
۱۱۴	مؤمنین کو خدا پر ہی توکل کرنا چاہیئے
۱۴۲	وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں
۱۴۲	وہ آیاتِ الہی کو کبھی کم قیمت پر نہیں بیچتے
	جنت کے ساتھی
۳۳۱، ۳۳۰	انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین
۳۳۰، ۳۲۹	ثوبان صحابی رسول کی گفتگو
	❦

### مقامات

	أحد
	کوہِ أحد کا دامن جہاں آپ کے زمانہ کی مشہور جنگ
	أحد لڑی گئی
	ادطاس
	ایک مقام جہاں ایک اسلامی جنگ (جنگِ ادطاس)
۲۳۲	لڑی گئی
	بکہ
۳۲	بکہ اور مکہ - ایک ہی لفظ اور معنی ہے
	حجرِ اسمعیل
	شمال مغرب میں ایک مقام قوس کی شکل میں
۳۴	حجرِ اسمعیل ہے
	صمرالاسد
	جہاں مسلم فوجیں جنگِ أحد کے بعد لشکرِ قریش کے
۱۳۲	مقابلہ کو پھر سے جمع ہوئیں
	روحاً
	وہ مقام جہاں سے البوسفیان نے مدینہ پر چڑھائی
۱۳۲	کے لیے پھر سے ارادہ کیا
	اور قبیلہ عبدالقیس کے ذریعے البوسفیان نے مسلمانوں
۱۳۲	کو مرعوب کرنا چاہا
	کعبہ
۲۰	مکہ میں لوگوں کے لیے پہلا بابرکت گھر
۲۰	کعبہ پہلے حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا
۲۳	خانہ کعبہ کی خصوصیت - بابرکت ہونا